

کشیر کے مجاہدین کی داستان شجاعت

شعلہ حریت

ابن آدم



2

ہمیں اپنے مقاصد کے لیے وہاں کے مکینوں سے راہ و رسم پیدا کرنی تھی، ان کی ہمدردیاں اور اعتماد بھی ضروری عناصر تھے اور اس کامیابی کی خاطر ان میں کھل مل جانا بھی ضروری تھا، گو انو اور میرے درمیان کوئی لائحہ عمل طے نہ ہوا تھا لہذا جو کچھ کرنا تھا صوابدیدی تھا، مجھے یقین تھا میری صوابدید کو انور د نہیں کرے گی۔

”آپ کا تعلق کس ضلع سے ہے۔“ میں نے نیاز احمد سے پوچھا۔ ”اور یہاں آئے کتنا عرصہ ہوا ہے۔“

”ہم بارمولا سے پچھلے ماہ آئے ہیں۔“ نیاز احمد نے بتایا۔ ”میں خود بھی محسوس کرتا ہوں یہاں کے لوگ بھی پیٹھ پیچھے کہتے ہوں گے ہم لوگ بھگوڑے ہیں، بزدل ہیں، جہاد سے منہ موڑ کر بھاگ آئے ہیں، لیکن یہاں کے رہنے والے ہماری مجبوریوں کو نہیں جانتے، جو ان بیٹی کا باپ بزدل بن جاتا ہے، خدا گواہ ہے اگر نوشابہ کی سلامتی کا خیال نہ ہوتا تو میں اور مہر و کبھی ہجرت نہ کرتے، میرے تین بیٹے جہاد میں شریک ہیں، تینوں کا یہی اصرار تھا کہ ہم نوشابہ کو لے کر نکل جائیں۔ ہم نے گھر کے اندر نوشابہ کے لیے ایک غار بنائی تھی یہ غار میں چھپی رہتی تھی۔“

”بابا مت ہر کسی کو میری کہانی سنایا کرو۔“ نوشابہ ترخ کر بولی۔ ”میں کوڑھ زدہ ہاتھ نہیں ہوں جو تم دکھا دکھا کر لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کر رہے ہو۔“

”لڑکی یہ سب اپنے لوگ ہیں۔“ نوشابہ کی ماں نے اس کے سر پر دلاسا دیا۔ ”کوئی غیر نہیں، ہمارے دکھ اور زخم سانجھے ہیں، بھلے کہا کرتے تھے دکھ درد بانٹ کر سہنا چاہیے میں ان کو بتاتی ہوں کہ ہم بزدل اور بے غیرت نہیں ہیں مگر ہمارا گاؤں، ہمارے کھیت اور ہمارے گھر سب کچھ جل گیا ہے، جب گھر نہیں رہا تو ہم اس امانت کو کہاں چھپاتے۔ اس

رات جب ہم گاؤں کی عورتیں اور بچے برفانی موسم میں کھلے میدان میں پڑے تھے وہ وحشی دہاں بھی آئے اور چھانٹ چھانٹ کر عورتوں اور لڑکیوں کو ٹوکوں میں بھر کر لے گئے۔ بس اس رات ہم نے نوشاہہ کی خاطر ہجرت کا فیصلہ کیا تھا۔ تم ہی بتاؤ ہم کیا کرتے کس سے فریاد کرنے جاتے۔

”نیاز بھائی!“ ایک آدمی نے تنبو کا پردہ ہٹا کر اطلاع دی۔ ”انچارج آپ کو دفتر میں بلا رہا ہے‘ پار سے کوئی ملاقاتی آیا ہے۔“

”اسے بول دو چاچا۔“ نوشاہہ بول پڑی۔ ”بابا کو بخار ہے ابھی گولی دی ہے۔ پسینے میں باہر نہیں جاسکتے۔“

”پھر کوئی اپنا آدمی بھیج دو‘ جو مہمان کو شناخت کر کے لے آئے۔“

”اماں تم چلی جاؤ۔“ نوشاہہ نے ماں سے کہا۔ ”شاید کوئی اپنے گاؤں کا ہو۔“

”بھائی عبدالقدوس۔“ نیاز نے التجائیہ انداز میں کہا۔ ”تم بھر جانی کے ساتھ چلے جاؤ۔“

”کیوں نہیں آئیے بھائی۔“ میں نے ایک حماقت کر ڈالی تھی پھرتی سے اٹھا تھا اور کوری کراری آواز میں بولا‘ مجھے احساس تو فوراً ہو گیا تھا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اچھا ہوا کسی نے وقتی پریشانی میں ایک بوڑھے کی پھرتی نوٹ نہ کی تھی‘ البتہ انو نے جن نگاہوں سے گھورا تھا وہ حماقت کی سزا ہی تھی۔

میں نے نیاز کی بیوی کو پہلے اندر جانے دیا اس کے پیچھے میں بھی جھک کر اندر داخل ہوا تھا۔ انچارج کے سامنے لکڑی کے تھری سیٹر اسٹول پر ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے جوں ہی گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”گل احمد تم.....!“ نیاز کی بیوی بانیں پھیلا کر آگے بڑھی تھی اور طویل قامت نوجوان اس کی بانہوں میں سا گیا تھا‘ نیاز کی بیوی اسے چٹاچٹ چومنے لگی تھی اور وہ اس کے ہاتھوں کو ہونٹوں اور آنکھوں سے لگا رہا تھا۔

”فیاض اور ریاض کیسے ہیں؟ اوہ ماں صدے کتنے کمزور ہو گئے ہو۔“

”ٹھیک ہے۔ گل احمد آپ ان کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔“ انچارج نے بیگلی آنکھوں کو صاف کر کے کہا۔

”بھائی جی۔“ نیاز کی بیوی چادر سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ”یہ میرا بیٹا گل احمد ہے اور گل یہ بھائی عبدالقدوس ہیں آج ہی آئے ہیں۔“ ہم نے مسافہ کیا اور ”مل کر خوشی ہوئی۔“ کی رسم ادا کی۔ ”گل احمد مجھے یہ حق ہے تم سے پوچھوں کیوں آئے ہو؟“

”بتا دوں گا اماں۔“ گل احمد نے ماں کو کلاوے میں بھر لیا۔ ”یہ یقین رکھیں اماں تمہارا بیٹا میدان سے بھاگ کر نہیں آیا۔“

”نوشی دیکھو میرے ساتھ کون ہے۔“ ٹینٹ کے منہ پر جا کر نیاز کی بیوی بولی‘ اس سے قبل کہ نوشاہہ باہر آتی‘ ہم تینوں باری باری اندر چلے گئے‘ گل احمد نے بن کا سر سینے سے لگایا اور پھر باپ کے پاؤں کے قریب بیٹھ گیا تھا‘ نیاز احمد پتھرائی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”ابا! مجھے کمانڈر ابو سعد نے ایک پیغام دے کر ادھر لشکر طیبہ کے امیر کے پاس بھیجا ہے‘ میں پیغام پہنچانے کے بعد آپ لوگوں کی تلاش میں ادھر آیا تھا۔“

نیاز احمد کا تانا ہوا چہرہ آہستہ آہستہ ڈھیلا ہونے لگا اور پھر شفقت پوری نے بیٹے کو گلے لگا لیا تھا‘ بڑا ہی جذباتی منظر تھا۔ میری آنکھوں میں بھی نمی تیرنے لگی تھی۔ چونکہ اس ٹینٹ میں اتنی گنجائش نہ تھی اس لیے مجھے اور انوکو ایک بار پھر انچارج نے طلب کیا اور ایک زخمی جوڑے کے ساتھ لگا دیا تھا‘ ہماری تو خواہش تھی کہ وہ ہر دس منٹ بعد ہمارے ٹرانسفر آرڈرز جاری کرے تاکہ ہم جس مقصد کے لیے کیپ میں داخل ہوئے تھے وہ بہ احسن طور پر ہو جائے۔ دونوں میاں بیوی سرنگ پھٹنے کی وجہ سے ہاتھ پاؤں ضائع کر آئے تھے۔ ان کو کشمیر سرجیکل ہاسپٹل سے فارغ کر کے کیپ میں بھیج دیا گیا۔ بیوی دونوں پاؤں سے محروم تھی جبکہ مرد کا بایاں ہاتھ اور بائیں ٹانگ اڑ گئی تھی۔

رات کو روکھا پھیکا کھا کر میں اور انو تھوڑا اوپر جا کر چاندنی میں جا بیٹھے‘ ہم نے ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں سے ہم ارد گرد پر بہ آسانی نظر رکھ سکتے تھے۔

”جناگیر!“ انو مدھم سر میں بولی۔ ”میاں تو ایک گاؤں محلے جیسا ماحول ہے‘ ہر ٹینٹ میں کوئی نہ کوئی عورت ہے‘ ہم بے جواز کسی کے ٹینٹ میں جا بھی نہیں سکتے‘ تم نے جلد بازی کی ہے ورنہ اس سے بہتر منصوبہ بنایا جاسکتا تھا۔“

”ہاں میاں آکر میں بھی خاصا مایوس ہوا ہوں‘ اگر ابا جی یہاں ہیں تو وہ کسی ٹینٹ

میں دیکے بیٹھے ہوں گے، جس خوف سے وہ بھاگتے پھر رہے ہیں وہ یہاں بھی ان پر طاری ہو گا۔

”سوچو جانتیہ کوئی طریقہ سوچو۔ ورنہ ہم وقت ضائع کر دیں گے۔“

”چلو واپس چلیں۔“ میں نے تجویز پیش کی۔ ”میرے زود پشیمان ذہن میں ایک طریقہ آیا ہے، ہم میک اپ میں کسی اخبار کے فری لانسر رپورٹرز بن سکتے ہیں، یہاں کی انتظامیہ ہمارے ساتھ ہے، اجازت نامہ لیا جاسکتا ہے پھر ہم ایک ایک ٹینٹ کے اندر ایک ایک فرد سے ملنے کے مجاز ہوں گے۔“

”چلو دیر آید درست آید کے مصداق تم نے ایک اچھا اور قابل عمل طریقہ تو سوچ لیا ہے، اچھا آئیڈیا ہے، چلو نیچے اتر جاتے ہیں۔“

واپسی ہم نے بیک ڈور سے کی تھی تھوڑا سا راستہ مشکل اور خطرناک تھا۔ تاہم وار چڑھائی چڑھ کر ہم عقبی دیوار پھاند کر اپنے کمرے میں پہنچے تھے، تالے کی چابی انوکے جھولے میں تھی۔

کمرے میں روشنی دیکھ کر نگران دوڑا آیا تھا، وہ ہمارا راز دار تھا اس لیے مسکراتا ہوا واپس چلا گیا تھا۔ ہم نے بدبو دار میلا لباس اتار کر غسل کیا اور اپنا اپنا لباس پہن کر لیٹ گئے تھے۔ ”جانتیہ!“ انوکے کمرے میں بدبو کی گھونٹ بھری تھی۔ ”کشمیر کی تاریخ سے واقف ہو؟“

”اگر مچھلی سے پانی کی تاریخ اور پرندے سے فضا کے موسموں کے بارے میں کوئی سوال کرے تو جو جواب مچھلی اور پرندے کا ہونا چاہیے وہی میرا جواب ہے۔“

”دیکھو دوست برانہ مناؤ۔“ وہ سمجھی شاید مجھے اس کی بات بری لگی ہے۔ ”میرے سوال کی روح کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں کشمیری نہیں ہوں۔ کبھی کشمیر سے کوئی جذباتی تعلق بھی نہیں رہا لیکن اب ایک حوالے سے میرا مستقبل، میرا دل، میرا دل، ہر ملک کی ایک ہی ہو گا، میں چاہتی ہوں کشمیر کو میں سیاق و سباق کے ساتھ جان لوں، ہر ملک کی ایک تاریخ ہوتی ہے۔ عروج و زوال ہوتے ہیں۔ اگر تمہیں نیند نہیں آتی تو کشمیر کی باتیں کرو، کیونکہ بہت کم جو میں نے کشمیر سے متعلق پڑھا ہے وہ کوئی قابل تحسین نہیں ہے۔ تم بتاؤ تو شاید میری معلومات کا ریکارڈ درست ہو جائے۔“

”برا منانے کی کوئی وجہ بھی نہیں۔“ میں نے ٹکیہ بغل کے نیچے رکھ کر سر اونچا کر لیا۔ ”بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ میرا ابتدائی پیشہ تدریس تھا۔ میں جموں کالج میں دو برس ہسٹری پڑھاتا رہا ہوں، اگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں ساتھ رہنے کا وقت دیا تو میں تمہیں باتوں باتوں میں کشمیر کا ماضی، حال اور مستقبل بتا دوں گا، لیکن پہلے تم بتاؤ کہ کشمیر کے بارے میں کتنا کچھ جانتی ہو؟“

”میں نے کسی آرٹیکل میں مغل بادشاہ اکبر کے ریمارکس کے متعلق پڑھا تھا کہ جب ۱۵۸۶ء میں اکبر نے کشمیر فتح کر کے مغلیہ سلطنت میں شامل کیا تو کشمیریوں نے یوں محسوس کیا جیسے جھلٹے صحرا سے ان کو نکال کر اکبر بادشاہ نے ان پر عظیم احسان کیا ہے پھر جب شہنشاہ اکبر انڈیا کی گرمی سے گھبرا کر وادی میں داخل ہوا تو اسے کشمیریوں کے فرماں بردارانہ رویے پر سخت غصہ اور افسوس ہوا۔ اس نے کہا۔ ”تم کشمیری کھانے کے لیے پیٹ تو رکھتے ہو مگر لڑنے والے بازوؤں سے عاری ہو۔“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”یہاں کے مردوں کے دل شیروں کے جگر نہیں بلکہ خرگوشوں کے سسے ہوئے دل ہیں۔“ اس نے اپنے غم و غصے کا اظہار ایک حکم نامے کے ذریعے یوں کیا کہ مردوں کے لیے بادشاہی حکم جاری کیا کہ مرد زنانہ لباس پہنا کریں، مضمون نگار نے ایک مغربی مفکر و نسنٹ کی رائے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا تھا۔ ”حکومت کے معاملے میں دنیا کا کوئی خطہ کشمیر جیسا بد قسمت نہیں رہا، دیگر موروں نے بھی اس کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا تھا کہ کشمیریوں کا یہی رویہ بیرونی جارحیت کو کشمیر میں قدم جمانے میں معاون ثابت ہوتا رہا ہے۔“ انوکے میرا رد عمل معلوم کرنے کے لیے سلسلہ کلام روک کر میری جانب دیکھا، مگر میرا چہرہ غالباً ہر تاثر سے پاک تھا کیونکہ جن موروں اور تجزیہ نگاروں کی وہ باتیں کر رہی تھی ان کو میں بھی پڑھ چکا تھا۔ انوکے زمین نرم اور قابل کاشت پا کر پھر اپنی معلومات کی کاشت شروع کر دی تھی۔ ”مگر ایک مورخ جی ایم ڈی صوفی شہنشاہ اکبر اور و نسنٹ دونوں کی آراء سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ کشمیری قوم ایک جنگجو قوم ہے جس نے صدیوں طالع آزمائوں اور غاصبوں کے خلاف جنگ لڑی اور بالآخر سپردالنے پر مجبور کر دی گئی، صوفی کے خیال میں کشمیری ذہین، فطین، حساس و جذباتی، موسیقی کے پرستار، اچھے کھانوں کے شیدائی، اعلیٰ دست کار اور شراب نوشی سے پرہیز کرتے ہیں“

صوفی ایک جگہ کشمیریوں کے بارے میں یہ بھی لکھتا ہے کہ یہ قوم حاسد اور متعصب بھی ہے۔ یہ لوگ اسلام کے سیدھے سادے اور صحیح راستے پر چلنے کے بجائے تصوف اور مافوق الفطرت چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ کشمیری قوم تضادات کا مجموعہ ہے۔ مطیع بھی ہے لیکن مزاحمت کرنا بھی جانتی ہے محکوم ہے مگر اپنے اندر آزادی کی چنگاری بھی دبائے ہوئے ہے۔

”یہ بات کسی حد تک درست ہے اور باعث حیرت بھی ہے کہ ابتدائی زمانے کی مستند تاریخ ملتی ہی نہیں جو کچھ پڑھنے کو ملتا ہے واقعی تضاد کا مجموعہ ہے، واقعات کی پہلی کڑی ہم ساتویں صدی سے ملاتے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے ساتویں صدی سے پہلے کشمیر گمنامی کی دھند میں لپٹا رہا ہے۔“ جوں ہی میں سانس لینے کے لیے رکا تو انو بول پڑی۔ ”دیکھو یہ کوئی دنیا سے کٹا ہوا الگ تھلگ جزیرہ نہ تھا کہ تاریخ کی آنکھ سے اوچھل رہتا۔ یہاں بھی تاریخی تضاد ہمارے سامنے آتا ہے۔“

”ہاں بعض شواہد اور حوالے ایسے ملتے ہیں کہ ساتویں صدی سے قبل کشمیر پر بیرونی جارحیت مسلط رہی ہے جن میں پنڈھاوا، مورہ، کشن، گوناندیا، کارکوتا، اپٹلا اور لوہاریہ حکمرانوں کے نام ملتے ہیں۔ ان سب میں ایک ہی بات مشترک تھی کہ سارے کے سارے ظالم غاصب تھے اور ان کا دور کشمیریوں کے لیے سیاہ دور تھا۔“

”سیاہ دور؟“ انو دھڑک کر بولی۔ آواز میں دکھ اور طنز کی گرمی بھی محسوس کی جا سکتی تھی۔ ”میں پوچھتی ہوں اس قوم کا کوئی سنہرا دور بھی ہے کشمیریوں نے کبھی آزادی کے شیریں ثمر کا ذائقہ بھی چکھا ہے!“

”ہاں، اس قوم نے دیکھا ہے اور شیریں ثمر کا ذائقہ بھی اسے عطا ہوا تھا۔“ میں نے تاریخ کے خزانے سے معلومات نکالتے ہوئے بتایا۔ ”آٹھویں صدی سے چودھویں صدی تک کشمیری کسی نہ کسی صورت میں بحیثیت آزاد اور خود مختار زندگی بسر کرتے رہے ہیں، چودھویں صدی میں مسلمان حملہ آوروں نے کشمیر پر قبضہ کر کے اس قوم کو اسلام کی جانب مائل کیا۔ اس طرح کشمیر کا سنہرا دور تقریباً پچاس برسوں پر محیط ہے، ۱۳۷۳ء تک کشمیر پر سلطان زین العابدین کی حکمرانی تھی۔ جو بڈ شاہ کے لقب سے مشہور تھا۔ آزادی

اور خود مختاری کا سلسلہ وقفے وقفے سے ۱۵۸۸ء تک قائم رہا تھا۔ اس کے بعد مغل شہنشاہ اکبر کی حکمرانی کا دور شروع ہوا۔ گو مغل حکمران سخت گیر تھے لیکن کشمیری مسلمانوں کو ایک گونہ قلبی تسکین رہی تھی کہ ان کی مذہبی آزادی پر کوئی قدغن نہ تھی پھر غالباً ۱۷۵۲ء میں مغلوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر کشمیر پر احمد شاہ ابدالی نے قبضہ کیا تھا، افغانوں کا دور ایک بار پھر کشمیریوں کی آزادی سلب کرتا دکھائی دیا ہے۔ اس بے چینی کے عالم میں سکھوں نے کشمیر پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ وقتی تبدیلی محکوم قوم کو خوشگوار محسوس ہوئی تھی لیکن یہ خوش فہمی جلد ہی حیرت اور مایوسی میں بدل گئی تھی۔ مسلمانوں کے خلاف اس قدر تعصب روا رکھا جانے لگا کہ اگر کوئی مسلمان سکھ کے ہاتھوں قتل ہو جاتا تو قاتل پر دو روپے جرمانہ کیا جاتا، اسی ظلم اور ناانصافی سے کشمیریوں کے اندر سکھوں کے خلاف نفرت کا لاوا پکنے لگا مگر آزادی کی کوئی تحریک نہیں چلائی گئی تھی، ان دنوں جوں کا صوبہ چھوٹے چھوٹے پر مغنوں پر مشتمل تھا۔ ایک پر گنے میں ڈوگروں کی اکثریت تھی۔ گلاب سنگھ ڈوگرہ اس پر گنے سے تعلق رکھتا تھا۔ گلاب سنگھ نے مغلوں کے خلاف جنگ میں سکھوں کی مدد کر کے ایک نام اور جوں کی عملداری انعام میں پائی تھی پھر اس گلاب سنگھ نے وقت کی آواز کے مطابق اپنے محسنوں سکھوں کے خلاف انگریزوں کی مدد کی تھی۔ جب انگریزوں نے سکھوں کو کشمیر سے نکال باہر کیا تو گلاب سنگھ نے انگریزوں سے 75,00,000 روپے میں کشمیر خرید لیا اور تقسیم ہند تک یہی خاندان کشمیریوں کا خون بہاتا اور ہڈیاں چباتا رہا تھا۔“

انٹرکام کا بزر بیٹھی آواز میں سرسراہٹ لگا تو انو نے ریسیور اٹھا کر میرے حوالے کر دیا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی تھی کہ انو نے پہلی بار سبقت سے گریز کیا تھا ورنہ وہ ہر معاملے میں ایک قدم آگے رہنے کی عادی تھی۔

”ہیلو..... کیا بات ہے.....؟“ میں نے لیٹے لیٹے ریسیور پر پوچھا۔

”سر میں گارڈ کمائنڈر شیر علی عرض کر رہا ہوں، آپ کے لیے پنڈی ہے کل ہے۔“

”کیا اس سیٹ پر ٹرانسفر.....“

”نہیں سر وہ سیٹ انٹرنل ہے۔ گیٹ تک آپ کو زحمت کرنا ہوگی۔“

”میں آ رہا ہوں۔“ میں نے جوتوں میں پاؤں پھنسائے۔ اس بار بھی انو نے کوئی

”لیکن جمائگیر صاحب کچھ خرابیاں ایسی ہوتی ہیں کہ منظوری لینے والے ہی نہیں رہتے۔“

”میرا خیال ہے ہم اہم معاملے سے ہٹ رہے ہیں۔“ میں نے اسے یاد دلایا کہ ہمیں کس خطرے کا سامنا ہے۔ ”چلو رائے دو۔“

”کیا کسی معتبر گائیڈ کے بغیر ہم بارڈر کراس کر سکتے ہیں.....؟“ انو نے اٹھ کر پوچھا۔ ”مجھے یقین ہے نہیں کر سکتے اور ایسا گائیڈ کسی دکان سے ہم خرید بھی نہیں سکتے۔ لہذا میری رائے ہے کہ ہمیں پھر مولوی عبدالقدوس اور بیگم کا روپ دھارنا ہو گا۔ ہمیں ایسا شخص صرف اور صرف کیمپ سے مل سکتا ہے۔“

”ہاں میں تمہاری رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔“

”ٹھہرو اتنی جلدی مت کرو۔“ جب میں نے بیگم کی جانب ہاتھ بڑھایا تو انو نے میرا ہاتھ روک لیا۔ ”اگر پنڈی والوں نے ہمیں طلب کر لیا تو یہ لوگ جھاڑیوں میں بھی ہماری تلاش کریں گے، بہتر ہو گا ان کو بھی ڈانچ دیا جائے۔“

”وہ کیسے؟“

”وہ ایسے۔“ انو نے آنکھیں اور ہاتھ ایک ساتھ نچائے۔ ”ہم اپنے نگراں کے ساتھ نیچے جائیں گے، اسے کہہ دیتا کہ پنڈی سے جو کال آئی تھی اس کے ذریعے ہمیں فوراً پنڈی واپس بلایا گیا ہے، چونکہ جہاز کل جائے گا اس لیے ہم بذریعہ سڑک سفر کریں گے، نیچے جا کر ہم رکشائیں گے نگراں کو خدا حافظ بولیں گے قادر پھر آگے جا کر کسی بھی جگہ وہ رکشا چھوڑ آئیں گے اور دوسرے رکشے میں بیٹھ کر مہاجر کیمپ چلے جائیں گے، بصورت تلاش ان کا خیال پنڈی کی جانب پرواز کرے گا اور ہم کسی ٹینٹ میں پڑے کھیاں اڑاتے رہیں گے۔“

”بے شک تم اچھی رائے ساز ہو۔“ میں نے اس کی جانب پیار سے دیکھا تو حسبِ سابق اس نے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا تھا۔ ”بھلا کوئی بیوی اتنی ذہین ہو سکتی ہے۔“

”ہوتی ہے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”مگر تم مرد لوگ اپنی برتری کے تھوڑوں سے اس کی مت مار دیتے ہو۔“

انوکے تجویز کے مطابق ہم جب الاٹ شدہ ٹینٹ میں داخل ہونے سے قبل اجازت

کے لیے بولے تو ہمارے ٹینٹ فیلوز نے فوراً روشنی کر دی تھی۔

”معاف کرنا عزیزو۔“ میں گوجری زبان میں بولا۔ کیونکہ دونوں میاں بیوی کو میں گوجری میں باتیں کرتا سن چکا تھا۔ ”ہم ایک عزیز کی عیادت کرنے چلے گئے تھے۔“ انو بیٹھ کر رولڈ گدیے کھول کر فرش پر بچھانے میں مصروف ہو گئی تھی۔ میں دیکھ چکا تھا میاں بیوی نے ہمارے کبل بانٹ کر اوڑھے ہوئے تھے۔ انو ان کو جن کرخت نگاہوں سے دیکھ رہی تھی خطرہ سا ہونے لگا تھا کہ وہ جھپٹا مار کر کبل نوچ لے گی لیکن بھرم بچ گیا تھا دونوں نے معذرت کے ساتھ کبل واپس کر دیے تھے، اس طرح رات بھر کے لیے ہم محفوظ ہو گئے تھے، عام زندگی میں اگر خطرہ ایک رات کے لیے رک جائے تو اسے کامیابی قرار نہیں دیا جاتا مگر ہم جیسے لوگوں کے لیے رات تو طویل مدت ہوتی ہے اگر خطرے کی نظر اندازی چند سیکنڈ کے لیے حاصل کر لیں تو اس قلیل وقفے کو کبھی ڈھال اور گھسی آڑ کے طور پر استعمال کر لیتے ہیں۔

صبح منہ ہاتھ دھونے اور ضروریات کے لیے پانی پر مرد و زن جمع تھے۔ انتظامیہ نے درمیان فاصلہ رکھا ہوا تھا اس لیے میں اور انو پلاسٹک کے لوٹے اٹھائے الگ الگ قطاروں میں جا لگے تھے، عورتوں کے ہاں بڑی بد نظمی تھی شور تھا بلکہ چھینا جھپٹی کی صورت تھی بار بار قطار ٹوٹ جاتی تھی البتہ مرد لوگ اپنی اپنی باری پر پانی لے رہے تھے۔

انو نے گزرتے وقت مخصوص اشارہ کیا اور ٹیڑھے میڑھے راستے پر چلنے لگی تھی، میں متوازی راستے سے اوپر گیا تھا۔ انو ایک پتھر کی آڑ میں چلی تو میں قدرتی ضرورت کے لیے ایک گھٹے جھاڑ کے اندر چلا گیا، اترائی کا سفر ایک ہی راستے سے شروع کیا، میں دو تین قدم آگے تھا انو پیچھے تھی۔

”دائیں ہاتھ گھاس پر بیٹھ جاؤ۔“ انوکے آواز سنائی دی۔ میں نے ادھر دیکھا دس قدم پر قدرتی گھاس اگی ہوئی تھی، انو آلتی پالتی مار کر گھاس پر بیٹھ کر بولی۔ ”شک یقین میں دہل گیا ہے یہاں ”را“ کے لوگ موجود ہیں، میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی ہماری تلاش میں آئے ہیں یا کسی دوسرے مشن پر ہیں، میں نے کیپٹن رکنی بھنڈاری کو پہچان لیا ہے۔ ٹی ازمائی فاسٹ فرینڈ، ویسے بڑی غیر محتاط ہے اپنی ظاہری نشانیوں کے ساتھ گھوم پھر رہی ہے۔“ ”را“ جوان کرنے سے قبل وہ ایک بنیاد پرست ہندو تنظیم کی سرگرم رکن تھی۔

اس تنظیم کا ایک مونو گرام ہے بائیں کلائی پر کالی دیوی کی شبیہ کندہ ہوتی ہے، جب وہ پانی لے کر ہاتھ دھونے لگی تو میں نے مونو گرام دیکھ لیا پھر اس کے چھدے ہوئے کانوں اور ناک کے سوراخ کی پلاسٹک بھرائی سے میں نے اسے پہچان لیا ہے، ایک بات شک کو تقویت دے رہی ہے کہ ممکن ہے وہ ہماری تلاش کے لیے ادھر آئے ہیں۔ کیونکہ جب ہم نے انڈیا چھوڑا تھا اس وقت رکنی چھٹیوں پر تھی یقیناً ہمارے بعد وہ ادھر آئی ہے۔

”خبر بعد میں بھی دی جاسکتی تھی محترمہ۔“ میں نے کہا۔ ”تمہیں معلوم کرنا چاہیے تھا وہ کس ٹینٹ میں رہتی ہے۔“

”اوہ میرے خدا۔“ وہ اچھل کر اٹھی۔

”دیرج انویٹیم“ میں نے پھر اسے ٹوکا۔ ”تم بھی غیر محتاط ہونے جا رہی ہو، خیال رہے تم ایک بوڑھی عورت ہو۔“

”تم نیچے جاؤ،“ میں دیکھتی ہوں شاید ابھی اوپر ہی ہو۔“ وہ جھک کر چلنے لگی تھی۔

میں ناشتا لینا بالکل بھول گیا تھا، ناشتے کی ضرورت سے کہیں زیادہ یہ معلوم کرنا ضروری ہو گیا تھا کہ رکنی کب کیمپ میں آئی ہے اور اس کے ساتھ اور کتنے آدمی ہیں، یہ معلومات کوئی بھی انچارج سے حاصل کر سکتا تھا لیکن احتیاط کا تقاضا تھا کہ ہم میں سے کوئی نہ ہو، اگر ان کو ہماری ہی تلاش ہے تو بات کسی نہ کسی طرح ان تک بھی جاسکتی تھی کہ فلاں لوگ پوچھ گچھ کرتے آئے تھے۔

میں نیاز احمد کے ٹینٹ تک گیا اجازت کی ضرورت نہ تھی چاروں ٹینٹ کے باہر کیمپ پر بیٹھے ناشاکر رہے تھے، میرے لیے نیاز احمد اور گل احمد کے درمیان جگہ بنائی گئی تھی، نوشابہ اندر سے ایک کپ لے آئی تھی، میں نے بھی تکلف برطرف رکھا تھا، دو قسم کی روٹیاں تھیں غالباً حلوا اور نان گل احمد بازار سے لایا تھا۔

”میری بہن کو بھی لے آتے بھائی جی۔“ نیاز کی بیوی چائے کا کپ دیتے ہوئے بولی۔

”کسی وقت سلام کرنے ضرور آئے گی۔“ میں نے نوالہ بتاتے ہوئے جواب دیا۔

”مجھے گل بیٹے سے ایک ضروری بات کرنا تھی اس لیے سویرے سویرے آپ کو زحمت دی ہے۔“

میری بات کا جواب کسی نے نہ دیا تھا غالباً وہ خاندان طعام اور کلام کا فرق جانتا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی گل احمد نے ماں کی چادر سے ہاتھ صاف کیے اور اٹھ کھڑا ہوا، ہم دونوں وہاں سے دس پندرہ قدم دور جا کر پتھروں پر بیٹھ گئے۔ گل نے معذرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر سگریٹ سلگایا تھا۔

”نہیں بیٹے کھانسی کی وجہ سے میں نے تمہا کو نوشی ترک کر دی ہے۔“ میں نے ہاتھ سے سگریٹ کا پیکٹ روک کر کہا۔

”گل!“ میں نے بات شروع کی۔ ”اگر تم عام سے کشمیری نوجوان ہوتے تو میں یہ حساس اور اہم معاملہ تم تک کبھی نہ لاتا، مگر تم ایک مجاہد ہو اور میں نے محسوس کیا ہے کہ آزادی کی جی تڑپ تمہارے اندر موجود ہے، میرے بیٹے جہاد اور آزادی کی جنگ کشمیر سے باہر بھی لڑی جا رہی ہے، آزاد کشمیر اور پاکستان میں دونوں خطوں کے عوام اس جہاد میں شریک ہیں، جس طرح کشمیر کے اندر جہاد کو دبانے کے لیے وردی میں انڈیا کی فورسز ظلم و جبر کی آگ بھڑکا رہی ہیں اسی طرح کشمیر سے باہر بھی بھیس بدل کر انڈیا کے جاسوس سرگرم عمل ہیں۔ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو گل احمد؟“

”جی مولوی صاحب دل کی گہرائیوں سے.....“

”تو پھر میرے بچے کشمیر کا ذکر تو تمہاری یہاں بھی ضرورت ہے۔“

”میں حاضر ہوں مولوی صاحب۔“ گل بولا۔ ”اس کا ذکر خاطر میں اپنی جان بھی دے سکتا ہوں، مجھے بتائیے میری رہنمائی فرمائیے میری کسے ضرورت ہے، مجھے کیا کرنا ہو گا؟“

”میں اور میری بیوی دونوں مجاہد ہیں ہمارا تعلق جہاد تحریک سے ہے، ہمیں یہ معلوم کرنے یہاں بھیجا گیا ہے کہ معلوم کریں کہیں حکومت آزاد کشمیر کے اندر اور مہاجرین کے درمیان دشمن نہ گھس آیا ہو، ہماری معلومات کے مطابق انڈیا کی بدنام زمانہ تنظیم۔ ”را“ کے کچھ ایجنٹس کیمپ میں موجود ہیں، ہم مہاجر اور بوڑھے ہیں جب کہ کیمپ انچارج تمہیں ایک مجاہد کی حیثیت سے جانتا ہے، اسے کسی طرح اعتماد میں لو اور یہ معلوم کر دو کہ گزشتہ چند دنوں میں کتنے مہاجر آئے ہیں اور ان کو کس ٹینٹ میں ٹھہرایا گیا ہے، پھر تم مجھے ساتھ لے جاؤ گے ہم ان لوگوں سے ملیں گے، تم میرے بارے میں بتاؤ

گے۔ مولوی صاحب اپنی بیٹی کی تلاش میں کشمیر سے آئے ہیں۔
”میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں مولوی صاحب۔“ وہ بولا۔ ”انشاء اللہ میں آپ کے اعتماد پر پورا اتروں گا۔“

”بس احتیاط ضروری ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب ایک گھنٹے بعد دوبارہ ملاقات ہو گی۔“

میں اپنے ٹینٹ میں گیا، انو وہاں نہ تھی، پلاسٹک کی چٹائی اور کمبل لے کر میں باہر جا کر لیٹ گیا تھا، دس منٹ بعد انو سیدھی میرے پاس آئی تھی، شاید وہاں کوئی کینٹین رہی ہو گی۔ انو بسکٹ اور ایک پرانے تھرماس میں چائے لائی تھی۔
”رپورٹ!“ میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔

”اس کے ساتھ میجر پر مود بھکاریوں کے میک اپ میں ہے۔“ انو نے بتایا۔ ”ہاں یہ بتاؤ تم نے جس بھکاری کو مزار کے اندر دیکھا تھا اسے پہچان لو گے؟“
”شاید پہچان لوں۔“ میں نے جواب دیا اور پھر میری نظر گل احمد پر جا پڑی میں نے اسے آواز دے کر بلا لیا۔

”السلام علیکم۔“ وہ قریب آ کر ادب سے بولا۔ ”میں ادھر ہی جا رہا تھا۔“
”تمہیں زحمت دی لیکن اب ضرورت نہیں رہی تیری چاچی نے معلوم کر لیا ہے کہ وہ کون ہیں اور کس ٹینٹ میں رہتے ہیں۔“
”اب میرے لیے کیا حکم ہے؟“ گل نے پوچھا۔ ”ظاہر ہے ان کو معاف تو نہیں کیا جاسکتا۔“

”کیا تم نگرانی کی ذمہ داری قبول کرو گے؟“
”بخوشی جناب۔“
”شکریہ، تمہیں اس جوڑے کا ٹینٹ دکھا دیا جائے گا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن نگرانی ایک مشکل فن ہے ذرا بھی غلطی ہو گئی تو بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا۔“
”آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں مولوی صاحب۔“ گل احمد پُر عزم لہجے میں بولا۔
”مجھے بس چہرہ کروادیں۔“

انوکو میں نے جب بتایا کہ گل ہماری ٹیم میں شامل ہو گیا ہے تو وہ اسے ساتھ لے

گئی تھی پھر شام چار بجے تک ہم دھوپ میں پڑے منصوبے کی ہانڈی پکاتے رہے تھے، گل کیمپ سے غیر حاضر تھا اس کی واپسی تک ہم کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔ وہ ٹھیک چار بجے واپس آیا۔

”وہ دونوں عید گاہ کے پچھواڑے ایک مکان کے اندر گئے تھے۔“ گل نے رپورٹ دی۔ ”عورت ابھی تک وہاں ہے مرد اس دوران دو مرتبہ باہر نکلا تھا پہلی بار وہ کیمسٹ کی دکان سے درد گردہ کی دوا لے کر گیا تھا اور دوسری دفعہ بیکری سے سامان لے گیا تھا۔“
”اوہ۔“ میں چونک اٹھا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ ابو جی گُردوں کی تکلیف میں عموماً جھٹلا ہو جایا کرتے تھے۔ ”میرا خیال ہے ہمارا مطلوبہ شخص ان کی قید میں ہے، میں آج رات وہاں داخل ہونے کی کوشش کروں گا۔“

”یہ کوشش مجھے کرنے کی اجازت دیں مولوی صاحب۔“ گل بولا۔ ”میں دیوار پھاند سکتا ہوں اپنی حفاظت بھی کر سکتا ہوں آپ بیمار اور بوڑھے ہیں۔“
”بہت بہت شکریہ بچے۔“ میں نے کہا۔ ”میرا جانا ہی سود مند ہو گا، مطلوبہ شخص کو صرف میں پہچان سکتا ہوں، تم دونوں باہر رہ کر میری حفاظت کر سکتے ہو، اگر میں کامیاب ہو گیا تو ٹھیک بصورت دیگر تم لوگ میاں کی انتظامیہ کی مدد لے لینا۔ تمہاری چاچی جانتی ہے اسے کیا کرنا ہو گا۔“

”ٹھیک ہے گل اب تم کچھ وقت آرام کر لو۔“ انو نے اسے ہٹانے کی خاطر کہا۔
جب گل احمد چلا گیا تو وہ بولی۔ ”جما نگیر تم نیچے جا کر اکرم سے رابطہ کرو اور تازہ پوزیشن معلوم کرو ایسا نہ ہو ادھر کوئی فیصلہ کر لیا گیا ہو اور ہم مدد لینے جائیں تو دھریے جائیں۔“
”تجویز معقول تھی اس لیے میں انوکو وہیں چھوڑ کر نیچے گیا اور ہوٹل سے اکرم کے نمبر پر رابطہ ملایا چونکہ گھر کا نمبر تھا اس لیے کسی خاتون نے اٹینڈ کیا تھا میری درخواست پر وہ ہولڈ کر دیا اکرم کو لے آئی تھی۔“

”السلام علیکم سر۔“ اس کی ہیلو کے جواب میں، میں نے کہا۔ ”آپ کا بھائی بول رہا ہوں۔“

”کہاں ہو بھائی؟“

”وہاں نہیں ہوں جہاں رات آپ نے کال کیا تھا، تازہ پوزیشن کیا ہے سر؟“

”حتی طور میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن وہ لوگ آج صبح واپس چلے گئے ہیں۔“
”آپ یہاں کی انتظامیہ سے معلوم کریں سران سے آپ کی حکومت نے کوئی بات تو نہیں کی؟“

”ہاں میں ابھی آئی جی آزاد کشمیر سے بات کرتا ہوں۔ تم آدھے گھنٹے بعد مجھے رنگ کرنا۔“

”او۔ کے سر۔“ میں نے ریلیور رکھ کر کال کی پے منٹ کی اور ڈائمنگ ہال میں جا بیٹھا، ہاف سیٹ کا آرڈر دیا اور اخبار کا مطالعہ کرنے لگا۔

تقریباً چالیس منٹ بعد اکرم صاحب سے دوبارہ رابطہ ملا تھا۔

”ہاں میری بات ہوئی ہے ان کو کوئی پیغام نہیں ملا اس کا مطلب ہے فی الحال کوئی خطرے کی بات نہیں ہے، البتہ پولیس والے تمہاری غیر حاضری کی وجہ سے خاصے پریشان تھے، میں نے ان کو مطمئن کر دیا ہے کہ تم لوگ کام کی وجہ سے ڈس لوکیٹ ہو۔“

”ایک درخواست ہے سر۔“ میں نے التجائیہ انداز میں کہا۔ ”مجھے کسی بھی وقت بڑے صاحب کی مدد.....“

”ایٹ اینی ٹائم۔“ اکرم صاحب نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ”میں نے زور دے کر آئی جی صاحب سے گزارش کی ہے، بقول ان کے وہ ایک شخص کو اسٹینڈ بائی رکھیں گے۔ تم ایمرجنسی نمبر نوٹ کر لو۔“

میں نے اشارے سے کاؤنٹر کلرک سے پشیل کانڈ طلب کیا اور اکرم صاحب کا بتایا ہوا نمبر نوٹ کر لیا۔ میں جب اوپر پہنچا تو سورج پہاڑ کی اوٹ میں جا چکا تھا، گل نے کمال دانائی سے دونوں عورتوں کو ٹینٹ سے باہر بھیج دیا تھا، نیاز صاحب سوئے ہوئے تھے، گل نے اپنی بہن سے کچھ کہا، جب انو ٹینٹ میں آئی تو اس نے بتایا تھا کہ نوشاہ بڑی ذمہ داری سے نگرانی کر رہی ہے۔

”پوزیشن تھوڑی تبدیل ہوئی ہے مولوی صاحب۔“ گل نے بتایا۔ ”اب عورت اندر ہے اور اس کا ساتھی واپس آ گیا ہے۔“

”آپ اس بات کو ذہن میں رکھیں۔“ انو بڑی بوڑھیوں کے لہجے میں بولی۔ ”وہ لڑکی مارشل آرٹ کی ماہر ہے۔“

”آپ مجھ پر کھل کر اعتماد کیوں نہیں کرتے۔“ گل احمد شاکا آواز میں بولا۔ ”مجھے یقین ہے آپ وہ نہیں جو دکھائی دیتے ہیں، میں فن جاسوسی کا ماہر نہیں ہوں لیکن آنکھیں اور تجربہ رکھتا ہوں۔“

”اعتماد اور احتیاط میں ایک فرق ہے برادر۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”اگر اعتماد نہ ہوتا تو اپنی متاع عزیز تمہاری ہاتھ نہ چھوڑتا۔“

گل احمد نے مؤدب نگاہوں سے انو کی جانب دیکھا اس نے جواب میں مسکراہٹ دی تو وہ نگاہیں جھکا کر بولا۔ ”میں نے مکان نمبر اور دیگر کوائف معلوم کر کے آپا جی کو بتا دیے ہیں۔“

”تم دونوں ایک نمبر یاد کر لو ایمرجنسی کی صورت میں تمہیں اس نمبر سے فوری رابطہ قائم کرنا ہو گا۔“

”انتظار کی حد کیا ہو گی؟“ گل احمد نے پوچھا۔ ”ظاہر ہے آپ مسمان تو بن کر نہیں جائیں گے۔“

میں اور انو مروتا ہنس پڑے تھے تاکہ ہمارے دوست کو جو ہم سے شکوہ تھا اس کا ازالہ ہو جائے۔ چونکہ میں نے اس مخلص اور پرجوش مجاہد کو اپنے مشن کا ساتھی بنانے کا حتی فیصلہ کر لیا تھا۔ اس لیے اس کی اجنبیت کو دور کرنا بھی ضروری تھا۔ چاقو اور بھکاری کی پوٹلی سے ملنے والا پستول لباس میں چھپا کر میں اور گل تھوڑا فاصلہ رکھے نیچے اترے۔ وہ آگے تھا اور کیمپ کی وجہ سے سڑک پر ہر وقت رکشے کھڑے رہتے تھے، وہاں ایک اچھا رواج تھا کہ تین سواریاں مل کر بھی رکشا کر سکتی تھیں۔ گل پہلے رکشے میں بیٹھا پھر مجھے رکشے والے نے بٹھالیا۔ میں نے اترائی اترتی انو کی جانب رکشے والی کی توجہ دلائی تو وہ اس کے انتظار میں رکا رہا تھا۔

انو کی خاطر ہم گلیوں میں آہستہ آہستہ چل رہے تھے کیونکہ وہ پندرہ بیس قدم پیچھے آرہی تھی، مطلوبہ مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے گل احمد نے سرگوشی میں بتایا لیکن ہم رکے نہیں تھے۔ ساری گلیاں ویران تھیں رات کے گیارہ بجے تھے۔ اگلے موڑ سے مڑتے ہی میں دونوں کو خدا حافظ کہتا ہوا واپس پلٹا۔

مکان کی چویشن دیکھ کر میں نے مسجد کے راستے اندر جانے کا فیصلہ کیا، مسجد کی

”جاؤ بیٹی امان اللہ۔“ اباجی نے میرا شانہ تھپ تھپایا۔ ”گھبرانا نہیں۔“

میں دروازے میں گیا تو شینا نے میرا ہاتھ تھام کر دروازہ بند کر دیا۔

میں اگر چاہتا تو اسے ڈھال بنا لیتا، میں آج بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا میں نے فاش غلطی کیوں کی تھی۔ ہاتھ اٹھتے اٹھتے رک گیا تھا۔ شاید اس وقت میں نے یہ سوچا ہو گا کہ میں ان انارٹیوں سے جب چاہوں اپنی بات منوالوں گا۔ دونوں دروازوں کے درمیان چند فٹ کی لابی تھی۔ سامنے والا دروازہ بھی بند تھا پیچھے والا شیلا بند کر چکی تھی۔ ہم دونوں جو کبھی طالب و مطلوب تھے بہت اچھے دوست تھے اور میاں بیوی تھے بند ڈبے میں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے تھے۔

”جماگیر!“ میں نے اس کے لمبے کی لرزش محسوس کر لی تھی پھر عورت کی نگاہوں کی زبان بھی میں بخوبی سمجھنے والا مرد تھا۔ اس ہندو زادی کی آنکھوں میں ایک شدید طلب تھی پیاس تھی شاید محبت بھی تھی لیکن میں دشمن کی آنکھوں میں اپنے لیے محبتوں کے روشن چراغ دیکھنے وہاں گیا تھا نہ کوئی گنجائش رہی تھی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھی اور دونوں ہاتھ میرے شانوں پر لے گئی۔

”میں خوش فہم ہوں نہ احمق مگر ایک عورت ہوں، عورت جو دنیا کے سارے داناؤں کی رائے میں صرف ایک دفعہ پیار کرتی ہے اور پھر اپنے پیار اور پہلے محبوب کو کبھی نہیں بھولتی، میں نے دل کی گمراہیوں سے تمہیں چاہا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں نے کبھی ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہا تھا۔ میں نے تمہیں دیوتا سماں جان کر تمہاری پوجا کی تھی۔ اسی چاہت کے نام پر ایک بار صرف ایک بار مجھے ہانپوں میں بھر کر پیار کرو۔ مہ..... میں شاید اب بھی جماگیر احمد کو چاہے جا رہی ہوں۔“ وہ اوپر اٹھنے لگی۔

میں بے حس و حرکت سنگی بت کی طرح کھڑا رہا۔ نہ میرے بازو اٹھنے نہ میں اس پر ماضی کی طرح جھکا تھا، ہاں اس نے بچوں کے بل اوپر اٹھ کر مجھے جکڑ کر طویل بوسہ دیا تھا۔ ایسے معاملے میں انسان وقت اور کام کا احساس کھو بیٹھا ہے مگر وہ ایک تربیت یافتہ ایجنٹ بھی تھی نری جذباتی عورت ہی نہ تھی کہ بھول جاتی وہ کہاں اور کیوں کھڑی ہے اس نے مجھے اپنے شکبے سے آزاد کیا اور چند گہری گہری سانس لے کر خود کو نارمل حالت میں لاتے ہی دھکیلتی ہوئی دوسرے کمرے میں لے گئی، ادھر اب دو مرد اور ایک عورت

دکھائی دیے، ایک وہ لڑکی تھی جسے میں نے چائے لے جاتے دیکھا تھا ایک ارون نامی نوجوان تھا تیسرا شخص جیسوں میں ہاتھ ڈالے کھڑکی میں کھڑا باہر دیکھ رہا تھا۔

”ارون!“ شیلا بولی۔ ”میں نہ کہتی تھی کہ جماگیر بالآخر“ میں ٹریس کر لے گا۔ غالباً یہ بھی مہاجروں کے درمیان رہا ہو گا اور وہاں سے رکنی یا بے پال کا تعاقب کرتا یہاں پہنچا ہے۔“

”تم کب آئیں شیلا؟“ میں نے ایسے انداز میں پوچھا جیسے وہ دوستوں کی محفل تھی۔

”پاکستان آئے تو کچھ دن ہوئے ہیں البتہ یہاں کل شام پہنچی ہوں، اعلیٰ دت کی رپورٹ ملتے ہی میں تمہاری تلاش میں چلی آئی تھی۔“

”اپنے بھائی کو بھیج دیا ہوتا۔“

”جس گھر کو آگ لگ جاتی ہے۔“ شیلا بولی۔ ”اسی پر پانی پھینکا جائے تو آگ بجھتی ہے۔ جل میں رہی تھی تو مجھے ہی آتا تھا۔“

”اچھا ہوا ملاقات ہو گئی۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”ہاں یہ بتاؤ کیا تمہاری بھابی اینلا بیگم تمہارے بھائی کے پاس پہنچ گئی ہے۔“

”مسٹر جماگیر احمد، یہ داؤ کسی اور پر آزماؤ تو شاید وہ گر پڑتا۔ مت مجھے چکر دو۔ وہ غلیظ کیتا پنڈی سے تمہارے ساتھ ادھر آئی دیکھی گئی ہے۔“

”ہاں۔“ میں ہنس پڑا۔ ”جس طرح دیکھنے والوں نے اسے ایک سفارت کار کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔“

”کیا مطلب؟“ شیلا چونک پڑی تھی۔ ”تم کتنا کیا چاہتے ہو؟“

”میں نے جو کچھ کتنا تھا کہہ چکا ہوں۔“

”یعنی وہ جو تمہارے ساتھ تھی وہ بھی انہیں تھی؟“

”اگر ہائی کمیشن کے ایک آفیسر کے ساتھ جانے والی انہوں نے تھی تو میرے ساتھ دیکھی جانے والی انہوں بھی اصل انہوں تھی۔ وہ تو ایک اداکارہ تھی جسے بطور چارہ استعمال کیا گیا تھا۔“

”تو پھر وہ کہاں ہے؟“ وہ پھٹ پڑی۔ ”اب تم اس حقیقت سے بھی مکر جاؤ گے کہ

وہ انڈیا سے تمہارے ساتھ نہیں آئی تھی۔“

”وہ آئی تھی یا نہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا شیلا دیوی۔“ میں نے منہ بنا کر کہا۔ ”اصل بات یہ ہے کہ وہ اب میرے ساتھ نہیں ہے۔ اب میں کہہ سکتا ہوں وہ طوائف ایک ہتلی پولیس آفیسر کے لیے مجھ سے جدا ہو چکی ہے۔ جب کہ مجھے یہی بتایا جاتا رہا ہے کہ وہ واپس انڈیا چلی گئی ہے۔“

”سنو جمانگیر احمد۔“ وہ ایک دم دوستانہ انداز اپنا کر بولی۔ ”تم صرف میرے مجرم ہو، ہم آپس میں لین دین کر سکتے ہیں یہ ہمارا بالکل ذاتی معاملہ ہے لیکن انویا ایٹلا بیگم میرے ملک کی مجرم ہے، فوج کی بھگوڑی ہے۔“ ”را“ کی منحرف ہے، اسے تم انڈیا کے حوالے کر دو اس کے بدلے تمہیں تمہارا باپ اور بہن دیے جائے گے۔ راج بھائی نے تمہاری بہن کو ٹریس کر لیا ہے، بولو یہ سودا منظور ہے تمہیں۔ ہاں اگر تم چاہو گے تو زبیدہ تمہیں یہاں پہنچادی جائے گی۔“

”میری شرط تم جانتی ہو۔“ میں نے جیب سے سونف نکال کر پھانک لی۔ ”دقت اور جگہ کے لحاظ سے تھوڑی سی ترمیم ہو گئی ہے۔“

”ہاں بولو انوکے بدلے کیا چاہتے ہو؟“

”شیلا کماری۔“ میں نے اس کی طرف جھک کر بتایا۔ ”اباجی کی بازیابی ان کی ذمہ داری ہے جن کے وہ سمان ہیں۔ رہی زبیدہ تو میں بے وقوف نہیں ہوں۔ وہ نہ تو ٹریس ہوئی ہے نہ ہی اسے تم لوگ یہاں پہنچا سکتے ہو۔ ہاں اسے ہم دونوں ٹریس کریں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ شیلا میرے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ ”ارون اور رکنی تم لوگ دخل نہیں دو گے، یہ میرا ذاتی معاملہ اور فیصلہ ہے۔ ہاں جمانگیر، مجھے تمہاری شرط منظور ہے، مجھے یہاں اپنے پاس رکھ لو اور انوکا ٹھکانا بتا دو ارون اور رکنی اسے لے جائیں گے۔“

شیلا:..... شیلا دیوی۔“ میں نے قہقہہ لگایا۔ ”ارے دیوی جی میں وہی ذہین اور شاطر جمانگیر احمد ہوں جس کی ذہانت اور معاملہ فہمی کا اعتراف سربروڑی نے کیا تھا، ہاں تم جمانگیر سے اس ہاتھ لو اور اس ہاتھ دد کا معاہدہ کر سکتی ہو۔ تم اپنی مدد کے لیے مسٹر ارون کو ساتھ لے چلو اور ضمانت کے طور پر اباجی تمہارے آدمیوں کی نگرانی میں رہیں گے۔ وہاں جا کر تمہیں میں رکھ لوں گا اور انوکا مسٹر ارون کے حوالے کر دوں گا، بولو کیسی تجویز

ہے؟“

”کچے سور ہو تم.....“ شیلا دانت کچکپانے لگی۔ ”ارون تم اپنے ساتھی کی تھوڑی مدد کرو جمانگیر کے والد صاحب کو بتاؤ کہ ان کا بیٹا ضد کر رہا ہے۔ ہاں ذرا ہاتھ ابھی ہلکا رکھنا ہمیں بوڑھے سے ابھی بہت کام لیتا ہے۔“

”ٹھہرو۔“ میں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”سنو شیلا کماری انویاں آئی نہیں ہے۔ البتہ میں اس کا ٹھکانا تمہیں بتا سکتا ہوں اس کی بازیابی تک مجھے اور اباجی کو یہاں قید رکھنا۔“

”اب آئے ہو تا سیدھے راستے پر۔“ شیلا خوش ہو کر چمکی۔ ”ارون پتا نوٹ کر لو۔“

ارون قلم اور پاکٹ ڈائری نکال کر جب میرے سامنے آن بیٹھا تو میں نے اس کی رسٹ وایچ پر دقت دیکھا، مقررہ وقت ختم ہو چکا تھا بلکہ پانچ منٹ اوپر جا رہے تھے۔ اب انو اور گل احمد کو ایکشن میں آ جانا چاہیے تھا۔

”ہاں ایڈریس بولو۔“ مجھے تذبذب میں دیکھ کر ارون کرخت آواز میں بولا۔ ”میڈم آپ کو اس وقت پوائنٹ نو پر ہونا چاہیے تھا، میں یہاں کے معاملات سنبھال سکتا ہوں۔ چیف کی کال کسی وقت بھی آ سکتی ہے ہم میں سے کوئی رابطے پر نہ ہوا تو ادھر پریشانی ہو گی۔“

”ٹھیک سے میرا حار ہی ہوں۔“ شیلا جوں ہی انہی میں نے جھپٹا مار کر اسے قابو کر لیا۔

”نہیں میری جان تمہارے بغیر بھلا میں رہ سکتا ہوں۔ خبردار ارون، یہ جانتی ہے میں گردن توڑنے میں کتنا ماہر ہوں۔“

آرم لاک میں پھنسا ہوا شیلا کماری کا چہرہ بے حد بھیانک دکھائی دینے لگا تھا اس لیے میں نے اس کی گردن تھوڑی ڈھیلی کر دی تھی۔ ”مسٹر ارون!“ میں سرد اور سفاک آواز میں بولا۔ ”تم میرے والد صاحب کو یہاں لاؤ گے۔ بصورت دیگر تمہیں اس ناگن کی گردن ٹوٹی ہوئی لاش اٹھانا پڑے گی۔“

ارون ہونٹ کاٹتا ہوا دوسرے کمرے میں گیا اور اباجی کو لے آیا تھا۔

”اباجی آپ باہر نکل کر رکشا کر لیں اور اس کو کسی قریبی تھانے تک لے

جائیں۔

”نیکن میں نہیں جانتا بیٹے یہ کون سی جگہ ہے۔“ اباجی بولے۔ ”میں باہر جا کر تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

”آپ جائیں میری مدد کے لیے میرا اللہ کافی ہے۔“ اباجی ابھی کسی پھسلواں فیصلے کی چڑھائی چڑھ ہی رہے تھے کہ باہر سے لاؤڈ اسپیکر کی تیز آواز سنائی دی۔

”اٹن اٹن۔ اٹن اٹن! مکان چاروں طرف سے گھیرے میں ہے، تم لوگوں کو صرف تین منٹ کی مہلت دی جاتی ہے، چوتھے منٹ پر نقصان کی ذمہ داری تم لوگوں پر ہوگی۔“

”سنو شیلا کماری ماضی کے نام پر میں تمہیں محفوظ راستہ بتاتا ہوں، باؤنڈری وال سے مسجد کے صحن میں چلی جاؤ اور وہاں کلیئر انس تک بیٹھی رہنا۔“

میں نے اردن کا خطرناک ارادہ بھانپ کر چال چلی تھی۔ اس نے ریوالور نکال لیا تھا۔ وہ سب ایجنٹ تھے جو زندہ گرفتار ہونے پر موت کو ترجیح دینے کے پابند تھے۔ میری چال نے خاطر خواہ اثر کیا تھا۔

”نکل چلو اردن۔“ شیلا کماری بولی۔ ”جہانگیر اگر واقعی تم خلوص دل سے مجھے بچانا چاہتے ہو تو باہر جاؤ اپنے اباجی کو بھی لے جاؤ، ان کو بتاؤ کہ یہاں کوئی نہیں ہے۔ اباجی اپنی مرضی سے یہاں مقیم تھے۔“

”میری نیت پر شک نہ کرو شیلا۔“ میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”کاش ہم تجدیدِ وفا کرنے کے لیے آزاد ہوتے۔ ایک بات یاد رکھنا شیلا۔ میں زبیدہ کو یہاں پہنچا کر تمہارے پاس ضرور آؤں گا۔ تم جانتی ہو، میں صرف زبیدہ کی خاطر وہاں سے بھاگا تھا۔“

”میں تمہارا انتظار کروں گی۔“ وہ بھی جذبات میں بہہ گئی تھی۔ ”اب بھی وقت ہے جہانگیر اگر مجھے محفوظ رکھ سکو تو ساتھ لے چلو۔“

میں پھر سوچ میں جا کر اٹھا تو وہ بول پڑی۔ ”نہیں میں رسک نہیں لوں گی۔ تم چلے جاؤ۔“ وہ تینوں اٹھے اور دوسرے کمرے میں چلے گئے تھے۔

☆=====☆

آپریشن کی کامیابی کی خبر مجھے صبح دی گئی تھی، چونکہ انڈیا کو صرف انوکھی تلاش اور

ضرورت تھی اس لیے ہم نے حفظِ ماتقدم کے طور پر انوکھو مہاجرین کے درمیان چھپا دیا تھا، اگر کسی وقت حکومتِ پاکستان، حکومتِ آزاد کشمیر سے انوکھی واپسی کی درخواست کرتی بھی تو وہ ان کو نہ مل سکتی۔ دس بجے ایک سب انسپکٹر کے ذریعے مجھے خفیہ کے ہیڈ کوارٹر میں طلب کیا گیا تھا۔ پیغام میں بتایا گیا تھا کہ گرفتار شدہ ایجنٹوں کی شناخت کروائی جائے گی۔ ہیڈ کوارٹر میں پولیس کے علاوہ دو ملٹری آفیسرز بھی تھے ایک فلو کرٹل اور دوسرا میجر۔ تعارف کے بعد ان لوگوں نے میری مثالی کارکردگی کی رسمی تعریف کی تھی۔

”مسٹر جہانگیر!“ کرٹل نے کہا۔ ”اگر ہماری گورنمنٹ آپ کی خدمات مستعار لینا چاہے تو؟“

”میں اپنی مجبوری پاکستان کے اعلیٰ افسران کو بتا چکا ہوں سر۔“

”وہ ذمہ داری اگر ہم قبول کر لیں تب؟“

”سوری سر۔“ میں نے معذرت کر دی۔ ”البتہ میں ہیشیل میں پراسس کرتا ہوں کہ بہن کو لے کر سیدھے یہاں آؤں گا اور پھر خود کو اس ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے وقف کر دوں گا۔“

”تھینک یو۔“ کرٹل نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے ہم آپ کی کامیابی اور واپسی کی دعا کریں گے۔ انسپکٹر جہاں داد خان! جہانگیر صاحب کو سیل میں لے جاؤ۔ جہانگیر صاحب دونوں نے دانتوں پر دانت جما رکھے ہیں۔ آپ ان کی زبان کھلوانے میں ہماری مدد کریں۔“

”دو.....؟“ میں نے گردن موڑ کر پوچھا۔ ”کیا دونوں مرد؟“

”نہیں وہ جوڑا.....“ کرٹل صاحب بولے۔

میں یہ دیکھنے کے لیے بے قرار ہو گیا تھا کہ وہ دو کون ہیں حالانکہ ان کی تعداد چار تھی، اگر پولیس والے مجھے فوراً اباجی کے ساتھ جیپ میں بٹھا کر وہاں سے لے نہ جاتے تو ان کی مدد کر سکتا تھا۔ مجھے وہاں انوکھ اور گل احمد بھی دکھائی نہ دیے تھے ورنہ میں ان کو اندر کی صورت حال بتا دیتا۔ حوالات میں واقعی ایک جوڑا تھا رکسنی اور اردن۔ رکسنی چادر تانے لپٹی ہوئی تھی جب کہ اردن دیوار سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہا تھا۔ میں جوں ہی اس کے سامنے گیا اس کے چہرے پر مدھم سی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔ وہ توقع کر رہا ہو گا

کہ میں شیلا کو نہ پا کر غصے سے پاگل ہو جاؤں گا۔

”بیلو اردن۔“ میں نے بھی مسکرا کر دوستانہ انداز میں اسے مخاطب کیا تھا۔ ”تم

لوگ کیسے پھنس گئے۔ میں نے تو ان سے کہا تھا کہ اندر کوئی نہیں ہے۔“

”کسی نہ کسی کو تو قربانی دینی پڑتی ہے مسٹر جانیگر۔“ اردن نے سگریٹ فرش پر

مسلم کر جواب دیا۔ ”ہم نے تمہاری محبوبہ کو بچا کر خود کو سامنے کیا تھا۔“

”کیا تمہیں یقین ہے۔“ میں نے ادھر ادھر دیکھ کر راز دارانہ آواز میں پوچھا۔

”شیلا اس شہر سے نکل گئی ہے؟“

”دو ٹوک سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ اردن بولا۔ ”لیکن وہ احمق نہیں ہے کہ ادھر

پڑی رہے گی۔“

”میں اس سے ملنا چاہتا ہوں اردن۔“ میں نے بھرائی آواز میں بتایا۔ ”وہ میری

محبوبہ نہیں بلکہ بیوی ہے۔ میں ادھر اپنے والد کو تلاش کرنے آیا تھا۔ وہ مل گئے ہیں۔ میں

اب شیلا کے ساتھ واپس جانا چاہتا تھا اگر تمہیں کچھ معلوم ہے تو میری مدد کرو۔“

”میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔“ رکنی اٹھ بیٹھی۔ ”لیکن پہلے تم ہماری مدد کرو۔“

”میں تمہا کیا کر سکتا ہوں دیوی جی۔“ میں نے نرمی سے اسے جواب دیا۔ ”تم لوگ

جاننے ہو یہ ٹیم ورک ہوتا ہے، شیلا مل جائے تو ہم دونوں کچھ کر سکتے ہیں۔“

”جب ہمیں گرفتار کیا گیا تو وہ دونوں ہاتھ روم کی چھت پر تھے۔ چونکہ وہ جلدی

میں تھی اس لیے اس نے کوئی بات نہ کی تھی۔ اب معلوم نہیں وہ کہاں ہوں گے۔“

”اس کے ساتھ کون ہے؟“

”ہم نہیں جانتے وہ اسے آفیسر کہہ کر پکارتی تھی دونوں ساتھ آئے تھے۔“

”تم لوگ؟“

”ہم تو مہاجرین کی آمد کے ساتھ یہاں آئے تھے۔“ رکنی نے بتایا۔

”کوئی اور رابطہ بناؤ، شیلا نہیں تو کوئی اور ہو گا۔ یقین کرو میں تم لوگوں کی مدد کرنا

چاہتا ہوں۔ شیلا نے شاید بتایا ہو گا میرے بارے میں۔ مجھے تمہاری ایک ایجنٹ اپنی گردن

کا محافظ بنا کر ادھر لے آئی تھی۔ میں واپس اپنی ڈیوٹی جوائن کرنا چاہتا ہوں۔“

”ہمیں کچھ وقت دو جانیگر۔“ اردن بول پڑا۔ ”تم پر اعتماد کرنے کے لیے ہمیں

خود کو تیار کرنا ہے۔“

”کتنا وقت!“ میں نے پوچھا۔ ”سنو یہ لوگ تمہیں شاید پنڈی بھیج دیں پھر میرے

لیے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔“

”ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ ہمیں پاکستان بھیج دیں۔ وہاں ہمارے بہت دوست

ہیں۔“

”پنڈی سے یہ جگہ اتنی دور نہیں کہ وہ لوگ ادھر نہ آسکیں، میں ان کو کال کروں

گا۔“

”ٹھیک ہے جانیگر تم ایک گھنٹے بعد ملاقات کرنے آؤ گے تو ہم کوئی نہ کوئی فیصلہ کر

چکے ہوں گے۔“ رکنی نے بات ختم کرتے ہوئے کہا اور میں حوالات سے ہٹ کر فوجیوں

کو رپورٹ دینے چل پڑا۔

حوالات سے آفس کا درمیانی فاصلہ دو فٹ کا تھا۔ اسی فاصلے میں مجھے ایک فیصلہ کرنا

تھا، جب میں آفس کے فٹ میٹ پر چڑھا تو فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر یہ لوگ شیلا اور اس کے

ساتھی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تو مجھے خاموش رہنا ہو گا۔ میں فیصلہ کرنے کی حد

تک تو آزاد تھا لیکن کل مجھے وہی کرنا تھا جو میرے میزبان چاہتے۔ اکرم صاحب نے جو

اطلاع دی تھی اس کے پیش نظر مجھے اپنی منزل کی جانب روانہ ہو جانا چاہیے تھا۔ سیاسی

حکومتوں کے آگے پیچھے کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا، بھلے وقتوں کے بادشاہ جو ایک دفعہ زبان

سے نکال دیتے تھے اسی پر چٹان بن جایا کرتے تھے ان کو کوئی مصلحت اور سیاسی مجبوری

فیصلہ بدلنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ اگر آنے والے مذاکرات کر کے واپس چلے گئے

تھے تو وہ پاکستان کی شرائط اپنی حکومت یا فوجی قیادت کے سامنے رکھنے کے پابند تھے، اگر وہ

لوگ شرائط مان جاتے تو پھر مجھے اور ان کو کون بچا سکتا تھا۔ یہی سوچ تھی جس نے مجھے

جھوٹ بولنے اور زبان بند رکھنے پر مجبور کیا تھا۔ میں اگر ان کو بتا دیتا کہ ایک خطرناک

انڈین ایجنٹ ایک ساتھی کے ساتھ گرفتاری سے بچ گئی ہے تو وہاں نئی پوچھ گچھ اور اکھاڑ

پچھاڑ شروع ہو جاتی۔ مجھے بھی مورد الزام ٹھہرایا جاسکتا تھا کہ میں نے باہر نکل کر ریڈ

کمانڈر کو ساری بات کیوں نہیں بتائی تھی۔ میں کیوں چپ چاپ وہاں سے چلا گیا تھا۔ یہ

لوگ ان کی تلاش اور گرفتاری میرے کندھوں پر بھی ڈال سکتے تھے پھر مجھے رکنا پڑتا یا پناہ

دینے والوں کو بھی ذاج دے کر اور ناراض کر کے روپوش ہو جاتا۔

”جی ہائیگر صاحب۔“ آفیسر نے پوچھا۔ ”کوئی اچھی خبر؟“

”ان لوگوں نے ایک گھنٹے کی مہلت مانگی ہے سر۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں ان کو اپنی دوستی کا یقین دلانے میں کسی حد تک کامیاب ہوا ہوں۔“

”گڈ۔“ آفیسر نے پُرتائش نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ”کسی بھی طرح ان سے معلوم کرو ان کے اور کتنے ساتھی ہیں اور کہاں ہیں۔“

”میرا خیال ہے سر، ان لوگوں کا ہیڈ کوارٹر پنڈی میں ہے۔ یہ لوگ صرف میرے تعاقب میں آئے تھے۔“

”بھی پنڈی بھی اپنا ملک ہے۔“ آئی جی صاحب بول پڑے۔ ”ہمیں تو ان کی مدد سے ایجنٹس کو ٹریس کر کے اس سرزمین کو پاک کرنا ہے۔“

”آپ کی ساتھی نے اس مشن میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ بے حد ذہین خاتون ہیں۔“ ایک آفیسر نے کہا۔ چونکہ وہ سارے سادہ لباس میں تھے اس لیے رینک کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کر سکا تھا۔

”یوں تو ہر پاکستانی قومی سلامتی کا ضامن اور محافظ ہے۔“ ان میں سے غالباً وہی سینئر تھا کیونکہ بات چیت وہی کر رہا تھا۔ ”لیکن عائد ذمے داری کے حوالے سے میں اس ادارے کا مقامی سربراہ ہوں۔ میری ذاتی درخواست پر ارباب اختیار نے میری یہ ڈیوٹی لگا دی ہے کہ میں آپ دونوں سے اسلام اور پاک دھرتی کے نام پر آپ کی خدمات حاصل کرنے کی درخواست کروں۔ ایک حوالہ اور بھی ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کشمیری ہیں اور ہم کشمیر کی سلامتی کے لیے آپ کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہتے ہیں۔ ہم آپ دونوں سے کیا کام لینا چاہتے ہیں اس کے لیے ہم الگ بات کریں گے۔“

”میں اگر آپ لوگوں کی قدر شناسی اور عزت افزائی کا شکریہ نہ ادا کروں تو اللہ تعالیٰ ناراض ہوں گے جن کا حکم ہے کہ احسان کرنے والے کے ساتھ احسان کیا کرو لیکن میرا مشن ابھی ادھورا ہے سر۔ میری نوجوان بہن مقبوضہ کشمیر کے کسی عقوبت خانے میں میری راہ دیکھ رہی ہوگی۔ میں نے اپنا ملک اور اپنا شاندار مستقبل پاکستان اور آزاد کشمیر کی سیاحت کے لیے قربان نہیں کیا، جب تک میں اپنی بہن کو درندوں کے زرخے سے

نہیں نکال لاتا میں یکسوئی اور دلجمعی سے کوئی کام نہیں کر سکتا، ایسی ہی آفر مجھے پنڈی میں بھی ہوئی تھی۔“

”اگر ہم ایک خصوصی مشن پر اپنے آدمی بھیج دیں تو؟“

”بہن بیٹی اور ماں کو تلاش کرنے والی اسپرٹ کسی اور میں ہو ہی نہیں سکتی سر۔“

”خیر چھوڑیے چائے پیئیں۔“ آفیسر نے موضوع بدل دیا تھا۔

قیدیوں پر گفتگو ہونے لگی تھی لیکن میرے اندر بے چینی کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ مجھے اپنی آزادی خطرے میں محسوس ہو رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ حکومت پاکستان کی ہدایت پر یہ لوگ مجھے اس وقت تک منذب طور سے روکنا چاہتے تھے جب تک ان کو انڈیا سے کوئی حتمی جواب نہیں مل جاتا۔ یہ میرا اپنا ایک اندازہ تھا۔

”اگر آپ لوگ مجھے ایک گائیڈ دے دیں تو میں کل ہی روانہ ہو جاؤں گا۔“ میں نے اپنا شک دور کرنے کے لیے کہا۔ ”گائیڈ کے بغیر ہو سکتا ہے میں بارڈر پر ہی روک لیا جاؤں۔“

”اتنی جلدی نہیں جہانگیر صاحب۔“ آفیسر نے جواب دیا۔ ”ان دنوں بارڈر کراس کرنا آسان نہیں۔ آپ کچھ دن اور صبر کریں۔ مناسب وقت پر ہم ضرور آپ کی مدد کریں گے۔“

میرا شک یقین میں بدل گیا تھا۔ میری نقل و حرکت پر پابندی عائد ہو چکی تھی۔ ایک احساس کچھ دھارس بندھا رہا تھا کہ آخر پاکستانی حکام کیوں میری دل داریاں کر رہے ہیں، میں ذاتی طور پر کچھ بھی تھا، پاکستان میں داخل ہونے کے اسباب جیسے بھی تھے، میں ملکی قانون کا مجرم تھا، مجھ پر تارکین وطن کا قانون لاگو تھا، قانون یہ نہیں دیکھتا کہ اٹل دت اور ارون کس ارادے سے پاکستان آئے تھے، قانون کے نزدیک وہ بھی بلا اجازت اور مروجہ طریقے اپنائے بغیر آئے تھے اور جہانگیر احمد کے پاس بھی کوئی راہداری نہ تھی پھر کیوں ابھی تک میں آزاد ہی نہیں بلکہ معتبر بھی تھا۔ میرے ساتھ وی آئی پی جیسا برتاؤ کیا جا رہا تھا۔

کوئی نہ کوئی وجہ، کوئی مجبوری ایسی تھی کہ یہ لوگ نہ مجھے نگل سکتے تھے نہ اگل رہے تھے اور یہی سمجھ میں نہ آنے والی وجہ میرا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔

”سوری سر۔“ میں آخری حد تک جانا چاہتا تھا کہ لائحہ عمل ترتیب دیتے ہوئے کوئی شک ساتھ نہ ہو اور بڑھتے ہوئے قدموں کے ساتھ بچہ تازا نہ رہ جائے۔ ”میرے پاس انتظار کا وقت نہیں ہے، میری ساتھی اور میرے درمیان یہی اختلاف تھا۔ وہ پاکستانی میزبانوں کی آفر قبول کرنے کے حق میں تھی، کیونکہ اس کی تلاش کی پھٹی پر رشتے کے درد کا پھوڑا نہیں ہے، گھر میرا جل گیا تھا، خاندان میرا برباد ہو گیا ہے، وہ عورت میرا درد کیسے محسوس کر سکتی تھی۔ یہ اختلاف رائے تھا جس کی وجہ سے ہمارے راستے الگ ہو گئے ہیں۔“

”تو کیا مس ایلا آپ کے ساتھ نہیں ہیں۔“ آفیسر نے تڑپ کر پوچھا۔ ”نہیں ان کو آپ کے ساتھ ہونا چاہیے۔“

”لیکن وہ نہیں ہے سر۔“ میں نے دکھ بھرے انداز میں بتایا۔ ”ہمارے درمیان باتوں باتوں میں تلخی گھل گئی تھی وہ ناراض ہو کر کمرے سے نکل گئی تھی۔“

”کہاں کے لیے؟“

”اس نے بتایا نہ میں نے پوچھا تھا۔“

”بدر!“ آفیسر نے نوجوان سے کہا۔ ”تم جاؤ اور اس خاتون کو ٹریس کرو۔ اسے ملنا چاہیے۔ جتنی چاہو فورس لگا دو۔ ہاں جہانگیر وہ کتنے بچے گئی تھی؟“

”اگر اس نے پنڈی کے لیے فلائنگ کوچ پکڑی ہے تو۔“ میں نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔ ”وہ کشمیر کی سرحد عبور کر گئی ہو گی، اسے وہاں ڈی آئی جی کے پاس جانا ہے۔“

”بدر!“ میری غلط بیانی حسب توقع ان کو بے سمت کر رہی تھی۔ ”پنڈی سے رابطہ ملاؤ ان کو الٹ کر دو۔“

”اس کا صاف مطلب ہے سر کہ ہم زیر نگرانی ہیں؟“

”مسٹر جہانگیر!“ آفیسر نے مضبوط آواز میں جواب دیا۔ ”بھرم بہت اچھی چیز ہے۔ ویسے آپ ایک تربیت یافتہ کمانڈو ہیں، جن حالات سے گزر کر آپ آئے ہیں۔ ایمان داری سے بنائیے اگر کوئی پاکستانی جہانگیر احمد انڈیا میں داخل ہو جاتا یا کشمیر میں خود کو ظاہر کر دیتا تو آپ کی انتظامیہ اس کے ساتھ کیسا سلوک کرتی؟“

”معاف کرنا سر۔“ میں نے بھی لہجے کو ترش اور تند بنا کر کہا۔ ”حکومتوں کی ایک اصطلاح ہے سیاسی پناہ اور تقریباً ہر ملک کا قانون وعدہ معاف گواہ کو بھی تسلیم کرتا ہے، کیا مجھ پر دونوں اصطلاحوں کا اطلاق نہیں ہوتا۔ میں اور ایلا جہاں ماضی اور مستقبل سے سارے نئے منقطع کر کے ادھر اس لیے آئے ہیں کہ یہ اسلامی ملک ہے اور منحرف انڈین مسلمان کی واحد جائے پناہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ بھی ہمارے پیش نظر ایک کاڑ تھا ورنہ پناہ تو ہمیں سری لنکا اور بنگلہ دیش میں بھی مل سکتی تھی لیکن وہاں سے ہم کشمیری بھائیوں کی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ اگر بات صرف اپنی گردن بچانے کی ہوتی تو ہم ہزاروں ہارکین وطن کی طرح کسی بھی شہر میں رچ بس جاتے۔“

”آپ کے جذبات کی ہم قدر کرتے ہیں۔“ آفیسر نے ملائمت سے کہا۔ ”لیکن ملکی آئین جذباتی فیصلوں کی اجازت نہیں دیتا۔ آخر آپ کیوں بضد ہیں کہ ہم زبان سے وہ الفاظ ادا کریں جو ہمارے جذبوں کے ترجمان نہیں بن سکتے۔ بعض اوقات ہم وہ کچھ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو نہیں کرنا چاہتے۔ ایک بات کا میں یقین دلاتا ہوں کہ پاکستان اور آزاد کشمیر میں آپ اتنے ہی آزاد ہیں جتنا میں ہوں۔ اس سے آگے نہ آپ جائیں گے نہ ہم اجازت دیں گے۔“

”اگر میں اپنی خدمات آپ کے حوالے کر دوں تو میری آفیشل حیثیت کیا ہو گی؟“

”وہی جس کے آپ حق دار ہیں۔“ آفیسر نے جواب دیا۔ ”یا وہ حیثیت جو آپ اپنی صلاحیتوں سے منوائیں گے۔“

”میں چاہوں گا کوئی ذمہ دار شخصیت حیثیت کا تعین کر دے۔“

”آپ کی شرط اوپر پہنچا دی جائے گی۔“ آفیسر نے گھڑی دیکھی۔ ”ہم بخیل نہیں ہیں۔ اچھا اب آپ جائیں ان سے معلوم کریں۔ ہو سکتا ہے آپ کی کامیابی ہی ایک روشن اور قابل عزت حیثیت کی ضمانت بن جائے۔“

جب میرے لیے حوالات کا آہنی دروازہ کھولا گیا تو میں نے ڈیوٹی نگران کو وہاں سے ہٹ جانے کا حکم دیا۔ اس نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے ساتھ اپنی جگہ چھوڑ دی، فاصلے پر وہ بالکل سامنے جا کر نگرانی کرنے لگا۔

”دوستو!“ میں نے جاتے ہی اردن کا شانہ تھپ تھپایا۔ ”میں تمام وقت تم لوگوں

کے لیے لڑتا رہا ہوں۔ شاید تمہارے نزدیک اسے فتح نہ کہا جائے، مگر میں نے ایک انسان ہونے کے ناطے دو انسانی جانوں کا دفاع کیا ہے۔ ملک، عہدے سے وفاداری اپنی جگہ اہم اور درست سہی مگر کانڈ پر محل کی تصویر دیکھ کر کوئی بھی انسان گرمی سردی سے محفوظ نہیں ہو سکتا، اپنی زندگی نہ ہو تو ساری آبادیاں اور وفاداریاں حرفِ غلط کی طرح آخری سانس کے ساتھ مٹ جاتی ہیں اور پھر ہم جیسے وفاداروں کی ڈیڈیاؤں بھی قبول نہیں کی جاتیں، ہم اس طرح اپنے عہد کی پاس داری کرتے ہوئے مرجاتے ہیں جیسے تانگے کا گھوڑا دوڑتے دوڑتے گر کر مرجاتا ہے، لیکن وہ گھوڑا ہم سے بہتر ہوتا ہے اس کی لاش کا ایک مالک ہوتا ہے جو اسے اٹھواتا ہے اور لاش پر افسوس کرتا ہے۔ کیا تمہیں بھی میں ایسی بے بسی اور گمنامی کی موت مرنے دے سکتا ہوں، نہیں میرے دوستو۔ میں آخری لمحے تک تمہارا دفاع کروں گا۔

”کچھ بتاؤ گے یا تقریر کرتے رہو گے۔“ رکنی بے صبری سے بولی۔ ”کیا کہتے ہیں؟“

”ایک کے بدلے دو۔“ میں نے ڈرامائی انداز میں بتایا۔ ”چار سردو“ اور اپنے دو سر بچالے جاؤ۔“

دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا پھر دونوں کی نگاہوں کا زاویہ بدل گیا تھا۔ غالباً اپنے اپنے دل کے چور کو مجھ سے چھپانا چاہتے تھے لیکن میں نے دونوں کی آنکھوں میں زندہ رہنے کی خواہش کو تڑپتے دیکھ لیا تھا۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ جاسوس زندگی سے پیار نہیں کرتے وہ انسانی فطرت اور کمزوری سے ناواقف ہیں۔ زندگی تو نالی میں ریگنے والی کپڑے کو بھی عزیز ہوتی ہے اور انسان کے اندر یہ کمزوری تمام مخلوق سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

میں نے اپنے تجربے اور چہرہ شناسی کے علم سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ ارون اور رکنی تیسرے درجے کے ایجنٹ تھے۔ اگر وہ تجربہ کار سپاہی ہوتے تو اتنی جلدی عیاں نہ ہوتے۔ رکنی ایک ظاہری نشانی کے ساتھ اتنی غیر محتاط نہ ہوتی تو انو اسے کبھی پہچان نہ پاتی۔

”میں نے ان لوگوں کے درمیان جو وقت گزارا ہے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں

کہ یہ لوگ اپنے وجہن کا پالن کرنے والے لوگ ہیں۔ اگر تم واپس جانا چاہو گے تو تمہیں پوری سہولت دی جائے گی۔ اگر میاں رہنا چاہتے ہو تو سیاسی پناہ بھی دلوائی جاسکتی ہے۔ ذرا سوچو شیلا کماری نے بھی تو تمہیں قربانی کا بکرا بنا کر اپنی زندگی بچائی ہے۔ گرم زمین پر تمہیں لٹا کر وہ اپنے پاؤں محفوظ کر چکی ہے۔ یہ دنیا ہے دوستو، کوئی کسی کا نہیں ہوتا۔ ہر شخص اپنے مفاد کا خیال رکھتا ہے۔ سوچو تم نہیں رہو گے تو دکھ کسے ہو گا نقصان کس کا ہو گا؟ صرف اور صرف تمہارے والدین، تمہارے بہن بھائیوں کو۔ تمہارے چاہنے والے دوست تم سے محروم ہو جائیں گے۔ تمہاری تنظیم کے چہرے پر دکھ کا سایہ بھی نہیں پڑے گا۔ تمہاری جگہ کوئی اور ارون اور رکنی لے لیں گے۔ زندگی سے محبت کرو پیارو۔“

”کیا تم ضمانت دو گے؟“ رکنی نے زندگی کا کشکول میری جانب بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”زبان بند رکھو احقر۔“ ارون نے اسے دھکا دے کر گرا دیا۔ ”ہم اپنے دلش سے غداری نہیں کر سکتے۔“

”اور وہ کتنا جو ہماری لاشوں پر پاؤں رکھ کر چلی گئی ہے۔“ رکنی ہڈیانی انداز میں چہنچہا۔ ”میں بتا دوں گی۔“

”میں کہتا ہوں زبان بند رکھو۔“ ارون نے الٹا ہاتھ گھمایا تو رکنی ایک دم نیچے جھک کر دیوار کے ساتھ جا گئی۔ ارون نے اسے دبوچنے کے لیے چھلانگ لگائی تو میں نے اسے ہاتھوں پر روکا اور اٹھا کر دروازے کے ساتھ دے مارا۔

”تم دور رہو۔“ کانیشیل بڑبڑاتا ہوا آیا تو میں نے اسے روک دیا۔ میری توجہ بٹ گئی تھی۔ اس سے ارون نے فائدہ اٹھا لیا تھا۔ اس سے قبل کہ میں اسے روکتا وہ رکنی پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ وہ بزدل تھا نہ کمزور اس کے مقابلے میں رکنی بزدل اور نازک اندام عورت تھی۔ ہاتھ پاؤں تو اس نے چلائے تھے لیکن ارون نے اسے گھٹنوں تلے دبا کر گلے پر ہاتھ جمائے تھے۔ رکنی اس کے بوجھ تلے ایسے پھڑک رہی تھی جیسے پرندہ شکاری کے ہاتھوں اور پاؤں کی گرفت میں ذبح ہو رہا ہو۔

میں نے عقب سے پاؤں جما کر ارون کی گردن پر ایک ہاتھ مارا تو وہ لڑھک کر ایک

طرف گر گیا۔ میں نے ادھ موٹی رکنی کو سہارا دے کر بٹھادیا تھا۔

”کیا بات ہے کیا ہوا؟“ آفیسرز کو شاید ڈیوٹی پر کھڑے کانسیبل نے اطلاع دی تھی کہ حوالات میں مار کٹائی ہو رہی ہے۔

”کچھ نہیں جناب۔“ میں نے رکنی کو اٹھاتے ہوئے بتایا۔ ”میں دیوی جی کو باہر لے جانے کی اجازت چاہوں گا۔“

”کیا وہ مر گیا ہے؟“ اردن کو بے حس و حرکت پڑے دیکھ کر ایک آفیسر نے پوچھا۔ ”نہیں صرف بے ہوش ہے۔“ میں نے جواب دیا پھر تھانے کا انچارج کسی کو نے سے نکل آیا۔ اس نے خود حوالات کا دروازہ کھولا تھا۔

رکنی کو ساتھ لے کر میں آفس میں داخل ہوا تو سینئر آفیسر نے سمجھ لیا کہ جھگڑا کیوں ہوا اور میں مرد کو بے ہوش کر کے عورت کو احترام کیوں دے رہا ہوں۔ اس نے بھی رکنی کے لیے خود کرسی پیش کی تھی۔ گویا میری ڈپلومیسی میں وہ بھی شامل ہو گیا تھا۔

”تعاون کی پیش کش پر میں نے اپنی اور حکومت آزاد کشمیر کی طرف سے شریعتی رکنی سے ایک معاہدہ کیا ہے۔ ان کی دی ہوئی اطلاع اگر سچی ثابت ہوئی تو آپ کی حکومت ان کی خواہش کی پابند ہوگی۔“

”تھوڑی سی وضاحت کریں۔“ آفیسر نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے شریعتی کی کیا شرط ہے؟“

”پہلی شرط آزادی۔“ میں نے بتایا۔ ”اگر یہاں رہنا چاہیں تو تحفظ اور عزت کی ضمانت اور اگر اپنے ملک واپس جانا چاہیں تو بارڈر کراس کرنے کی سہولت۔“

”میں ایک ذمے دار آفیسر ہونے کی حیثیت میں دونوں شرائط قبول کرتا ہوں۔“

”کیوں رکنی دیوی؟“ میں نے رکنی سے پوچھا۔ ”کیا میں نے تمہاری بہتر ترجمانی کی ہے؟“

”ایک شرط تمہیں بھی تسلیم کرنا ہوگی جہانگیر۔“ رکنی میری آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر بولی۔ ”اور شرط میں تنہائی میں تمہیں پیش کروں گی۔ ویسے بھی جو کچھ میں بتاؤں

گی صرف تمہیں بتاؤں گی۔“

میں نے حاضرین کی جانب دیکھا تو سب چپ چاپ آفس سے نکل گئے تھے۔

”ہاں اب بولو۔“

”میں تمہارے ساتھ رہنا چاہوں گی۔“ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”یہ میری پہلی اور آخری شرط ہے۔ اگر تمہیں قبول ہو تو اپنے اللہ اور مقدس کتاب کی سوگند کھاؤ۔ مجھے جہاں بھی لے جاؤ گے ساتھ رکھو گے۔ بصورت دیگر مجھے حوالات میں واپس بند کر دو۔“

میں طویل سانس لے کر رہ گیا تھا۔ اس شاطر عورت نے مجھے بری طرح جکڑ لیا تھا۔ میں ان کی موجودگی کا بہانہ بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میں اسے بتا چکا تھا کہ انو مجھے چھوڑ گئی ہے۔ اس نے صرف رسی اور زبانی وعدہ نہیں مانگا تھا بلکہ درمیان میں ایسی برتو پاک ہستیوں کو رکھ دیا تھا کہ میں کوئی شاطرانہ چال بھی چلنے کی پوزیشن میں نہ رہا تھا۔

”اٹھو تمہیں واپس سیل میں چھوڑ آؤں۔“ میں نے ہونٹ چبا کر دکھ بھرے لہجے میں کہا تو رکنی کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئی تھیں۔ ”کاش تم میری مجبوری کو سمجھ سکتیں۔“

”کیوں..... آخر کیوں؟“ وہ آگے جھک کر رو دینے والی آواز میں بولی۔ ”مجھے ساتھ نہیں رکھنا چاہیے۔ میں انو جتنی خوب صورت نہیں ہوں لیکن میرا دل.....“

”میں ظاہری صورتوں کا پجاری نہیں ہوں رکنی۔“ میں نے اس کی بات کاٹ کر جواب دیا۔ ”میری مجبوری دوسری قسم کی ہے۔ میں نہیں چاہتا تم جیسی نرکی آزادی کی

نعمت سے محروم ہو جائے۔ تم نہیں جانتیں میں اور انو پابند ہیں۔ ہماری نقل و حرکت کی نگرانی ہوتی ہے اور ہمیں واشگاف الفاظ میں کہہ دیا گیا ہے کہ ہم خود کو پابند سمجھیں۔

دراصل یہ لوگ ہمیں ”را“ کے ایجنٹ سمجھتے ہیں جن کو کسی خاص مقصد کی خاطر مخرب اور مفرور قرار دیا گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہمیں یہ نام نہاد آزادی محض اس لیے دی گئی

ہے کہ وہ ہمیں استعمال کر سکیں۔ اگر میں نہ ہوتا تو تمہیں مائل بہ تعاون کون کرتا۔ اپنا مطلب نکال کر ہو سکتا ہے ہمیں گرفتار کر لیں۔“

”لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ مجھے آزاد کر دیا جائے گا؟“

”میرا خیال ہے اپنا وعدہ پورا کریں گے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے یہ لوگ اردن سے کیا سلوک کریں گے؟“

”جو عموماً ایک جاسوس سے کیا جاتا ہے۔“

”اگر وہ ایک طویل مدت تک نظر بند رہے گا تو انڈیا میں مجھے کوئی خطرہ نہیں ہو گا کیونکہ ارون کے علاوہ کوئی نہیں جانتا کہ میں نے آزادی بخاری کے بدلے حاصل کی ہے۔ ٹھیک ہے میں پنڈی میں مقیم اینجنیوں کے ٹھکانوں سے تمہیں آگاہ کرتی ہوں اگر تم میں اپنی سلامتی کی ذرا سی بھی خواہش ہوئی تو تم ان لوگوں سے سودے بازی کر سکتے ہو۔“

میں نے قلم اور کاغذ کی مدد سے رکمنی کی دی ہوئی معلومات نوٹ کیں اور کال بیل بجا کر ایک پون کے ذریعے سینئر آفیسر کو طلب کیا۔

”کیا تم؟“ رکمنی نے شاکی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ”پاگل مت بنو جمانگیر۔“

”اب میں صرف تمہاری آزادی اور سلامتی کا ان سے سودا کروں گا۔“ میں نے اسے اعتماد میں لینے کی خاطر کہا۔ ”چونکہ میں کسی نہ کسی طرح اپنا راستہ بنا لوں گا۔ میں تمہارا ان سے نمٹ سکتا ہوں۔ اس لیے میں نے ان کو خود سے دور کر دیا ہے۔ عورت ساتھ ہو تو مرد ادھارہ جاتا ہے دھری ذمے داری میں ایک ذمے داری بھی پوری نہیں ہوگی؟“

اسی وقت آفیسر مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔

”سران کے لیے رہائش کا انتظام کروائیں۔“

آفیسر اثبات میں گردن ہلاتا ہوا واپس چلا گیا تھا۔ چند منٹ بعد ایک گاڑی رکمنی کو وہاں سے لے گئی تو مجھے بتایا گیا کہ ارون کی گردن ٹوٹ جانے کی وجہ سے اسے ڈاکٹرز نہیں بچا سکے۔ میں کندھے اچکا کر خاموش رہا تھا۔ ارون ان کا ہی نہیں میرا بھی دشمن تھا لیکن مجھے کوئی خوشی نہ ہوئی تھی۔

جب میں سرکاری رہائش گاہ میں داخل ہوا تو اباجی کو انو والے بیڈ پر لیٹا دیکھ کر دل پر گھونسا لگا حالانکہ انو سے میرا خون ہڈی کا کوئی رشتہ نہ تھا اور بیڈ پر لیٹا ہوا شخص میرا واجب الاحرام باپ تھا۔ نہ جانے کس جذبے کو نہیں لگی تھی۔

”وہ لڑکی کون تھی اور اب کہاں ہے۔ مجھے میزبانوں نے بتایا ہے کہ وہ یہاں تمہارے ساتھ رہتی تھی۔ دیکھو جمانگیر ہم ہمیشہ ایسے دوستوں کی طرح رہے ہیں مجھے بتا

”دو۔“

”اباجی وہ لڑکی میری محسنہ ہے۔“ میں نے نگاہیں جھکا کر بتایا۔ ”انڈیا پہنچا تو وہاں میری حیثیت مشکوک ہو چکی تھی۔ یہ ”را“ کی ذمے دار آفیسر تھی۔ اس نے مجھے بچایا اور اپنے ذرائع سے کام لے کر وہاں سے نکال لائی۔“

”یہ میرے سوال کے ایک حصے کا جواب ہے۔“ اباجی بولے۔ ”میں نے پوچھا تھا وہ اب کہاں ہے؟“

”جہاں بھی ہے محفوظ ہے۔“ میں نے ان کو ٹالنا چاہا۔ ”اگر آپ کا معاملہ نہ ہوتا تو میں بھی یہاں نہ ہوتا۔ مجھے شک ہے اباجی کہ ہماری پوزیشن یہاں بھی صاف نہیں ہے۔“

”تو کیا تمہیں گرفتار کر لیا جائے گا؟“

”ابھی کچھ کہا نہیں جاسکتا لیکن میں کسی فیصلے تک یہاں رہنا نہیں چاہتا۔ مجھے فی الفور زبیدہ کے لیے ادھر جانا ہو گا۔ کیا آپ واپس چلیں گے؟“

”نہیں بیٹے!“ اباجی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اگر میں زبیدہ کو آزاد کرانے کے قابل ہوتا تو وہاں سے بھاگتا ہی کیوں۔ میں تمہارے ماموں کے پاس چلا جاؤں گا۔“

”اگر آپ کو جانا ہے تو میری موجودگی میں یہاں سے نکل جائیں۔ اگر میں چلا گیا تو ہو سکتا ہے آپ کو میری وجہ سے پریشان کیا جائے۔“

”تو پھر وقت کیوں ضائع کیا جائے۔“ اباجی نے واسکٹ پہنتے ہوئے کہا۔ ”تم بھی میرے ساتھ نہ چلو۔ ہاں مجھے کچھ رقم دے دو۔ میری جیب خالی کر دی گئی ہے۔“

میں بھی یہی چاہتا تھا جس کا اظہار اباجی نے کر دیا تھا لیکن میں احترام اور رشتے کے بندھنوں میں بندھا ہوا شاید اپنی بات آخری وقت تک زبان سے ادا نہ سکتا۔ اباجی تجربہ کار بیوروکریٹ تھے انہوں نے وقت کے مطابق صحیح فیصلہ کیا تھا ورنہ وہ میری منزل کی راہ کا ایسا پتھر بن جاتے جسے میں ہٹانے اور پھلانگنے کی گستاخی نہ کر سکتا۔

میں نے ان کو ان کی ضرورت سے کہیں زیادہ معقول رقم دی اور وہ بہت ساری دعائیں اور احتیاط کی تاکید کر کے وہاں سے رخصت ہو گئے تھے۔

تقریباً آدھے گھنٹے کا وقفہ دے کر میں بھی نکل پڑا۔ انو ساتھ تھی تو کبھی احساس ہی نہ ہوا تھا کہ اس کے بغیر سانس رک رک کر چل سکتی ہیں۔ وہ جدا ہوئی تو مجھے اس کی ذات کا شدت سے احساس ہوا تھا۔ وہ محبت کا کوئی جذبہ تھا احسان مندی کا احساس تھا۔

کچھ بھی تھا عجب سی وحشت طاری ہو گئی تھی۔

بازار سے یکسر لیا اور گھٹے میں شفا کر بذریعہ رکشا میں مہاجر کیمپ جا پہنچا۔ انو میری ہدایت کے مطابق نیاز ڈار کے ذریعے پر تھی۔ میں فرش بستری بیٹھا تو انو نے جھک کر نوشی کے کان میں کچھ کہا وہ مسکراتی ہوئی ٹینٹ سے نکل گئی تھی۔ ”سنو جہانگیر میں کوئی بری خبر سننے کے لیے تیار نہیں ہوں“ ان لوگوں نے مجھے ایک گھر کا احساس اور راحت دی ہے، ہم جب سے ملے ہیں کوئی لمحہ سکون کا نصیب نہیں ہوا، آج کا دن اچھے دوست کی طرح ساتھ رہو۔“

”یقین نہیں آتا۔“ میں نے کیمرا میز پر رکھتے ہوئے بغور انو کی جانب دیکھا۔ ”واقعی کمال کر دیا ان لوگوں نے۔ تم جیسی عورت کو اس قدر متاثر کیا ہے۔“

”مدت سے ایک جذبہ پیاسا تھا۔“ انو بڑی سنجیدگی سے بولنے لگی۔ ”اماں بی جیسی کوئی مہربان ہستی نہیں ملتی تھی لیکن نوشی کی ماں نے متاکی بانہوں میں لے کر بڑا سکون دیا ہے۔ اس لیے میں اس سرشاری سے نکلنا نہیں چاہتی۔“

”وہ مہربان خاتون ہیں کہاں؟“

”کوئی باہر سے آیا ہے۔“ انو نے بتایا۔ ”انچارج نے سب پڑھے لکھے مہاجرین کو ایک جگہ جمع کیا ہے۔ غالباً برٹش پارلیمنٹ کا ممبر ہے۔“

”یہ بھی نہیں پوچھو گی کہ پولیس ریڈ کار زلٹ کیا رہا؟“

”اگر کامیاب رہا ہے تو ضرور پوچھوں گی۔“

”اور یہ بھی کہ اندر کون کون تھا؟“

”چلو بتا دو۔ میں سن لوں گی۔ ورنہ تمہارے پیٹ میں درد رہے گا۔“

”وہاں رکمنی ارون کے ساتھ تمہاری منڈیلا کماری بھی تھی۔“

”اوہ نو۔“ انو اچھل پڑی۔ ”پھر..... پھر.....“ وہ ہانپ گئی تھی۔

”وہ پُراسرار طور پر اپنے ایک ساتھی کے ساتھ گرفتاری سے بچ گئی ہے البتہ رکمنی

اور ارون کو قربانی کا بکرا بنا گئی ہے۔“

”سچ بتانا جہانگیر کہیں تم نے اسے کوئی راستہ تو نہیں دیا؟“

”اگر ایسا کرتا تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی۔“ میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

”کیونکہ اسے کبھی میں نے چاہا بھی تھا اور اس کے ساتھ کچھ بہت اچھا وقت بھی گزار چکا ہوں مگر میں میزبانوں کو دھوکا دینے کی جرأت نہ کر سکا تھا۔“

”کیا یہ لوگ اندھے تھے آخر کیسے وہ نکل گئی۔“

کورس کے اختتام پر ہمارے ڈپارٹمنٹ کے چیف نے الوداعی لیکچر میں کہا تھا ایک اچھے گوریلے کے لیے لازم ہے کہ وہ کاز کے لیے سچا اور کھرا ہو مگر اسے فریبی، دھوکا باز اور اداکار ہونا چاہیے۔ اس وقت مجھے اس بوڑھے انگریز کی بات عجیب لگی جو اپنے اسٹوڈنٹس کو فریب اور دھوکا بازی کی تلقین کر رہا ہے لیکن عمل کے میدان میں اس کی نصیحت نے قدم قدم فریب اور دھوکے کو ایک موثر ہتھیار ثابت کیا تھا۔ میں نے شیلہ کماری کو ڈانچ دے کر اس کے دو ساتھیوں کو حاصل کر لیا تھا اور پھر رکمنی کو اداکاری سے غداری پر تیار کیا تھا۔

انو کو اگر سچ بتا دیتا کہ اندھے وہی نہ تھے غلطی میری بھی تھی کہ میں نے ان کو اندر چھپے ہوئے دشمن کی تعداد نہیں بتائی تھی۔ ان تک جو اطلاع میں نے پہنچائی تھی اس کے مطابق ایک مرد اور ایک عورت کو ہی ہونا چاہیے تھا شاطر شیلہ نے وہی دو ان کو دے کر مطمئن کر دیا تھا۔

”کہاں جائے گی۔“ میں نے سچ انو سے بھی چھپا کر جواب دیا۔ ”رکمنی نے پنڈی کے سارے ٹھکانے بتا دیے ہیں۔ اب تک وہ کسی سیل کی دیوار سے ٹیک لگائے مجھے کوس رہی ہو گی۔“

”تمہیں معلوم کر کے آنا چاہیے تھا۔“ وہ تڑخ کر بولی۔ ”اگر وہ پکڑی گئی ہے تو میں ساری احتیاطیں پس پشت ڈال کر اس سے ملنے جاؤں گی۔“

”کیوں؟ کرئل کی خیر وعافیت پوچھو گی؟“

”شٹ اپ۔“ وہ درشت لہجے میں بولی۔ ”تم دوسری بار میری توہین کر رہے ہو۔“

”کم آن۔“ میں نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے میرا ہاتھ روک لیا تھا۔

میرا موڈ بھی ایک دم گبڑ گیا تھا لیکن قبل اس کے کہ میں اپنا رد عمل ظاہر کرتا۔ فیملی کا سربراہ نیاز احمد کھنکار کر اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے اس کے خاندان کے تینوں

افراد اندر آئے تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے تو کچھ ناراض تھے لیکن نیاز احمد کے احترام میں دونوں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”اتنی جلدی پنڈی سے واپس چلے آئے ہو ایسا کیا ضروری کام تھا؟“ نیاز احمد اپنے بستر پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کے والد صاحب نہیں آئے؟“

”ان کو ہی پنڈی چھوڑنے گیا تھا۔“ میں نے ایک جھوٹ میں اباجی کی غیر حاضری کو جواز دے دیا تھا۔

”خالہ جان!“ انوبول پڑی۔ ”کیوں بلایا گیا تھا آپ کو؟“

”بس وہی باتیں پوچھی جو ہم دس بار بتا چکے ہیں۔“ نوشی کی ماں نے ناک بھوس چڑھا کر جواب دیا۔ ”کیوں آئے ہو؟ تمہارے کتنے آدمی مارے گئے ہیں؟ ادھر کتنے فوجی ہیں؟“

”بھاگوان!“ نیاز احمد نے کہا۔ ”یہ لوگ جا کر بھارت کے ظلم کی آنکھوں دیکھی داستان سناتے ہیں۔“

”ادھر۔“ نوشی کی ماں طنزیہ ہنسی میں بولی۔ ”سنا سنا کر اور سن سن کر دنیا نے بھارت کا کیا بگاڑ لیا ہے، ہمیں کیا دیا؟ میری بات مان لیں یہ سب ہماری بے بسی کا تماشا دیکھنے آتے ہیں۔“

”اسی لیے اماں، ہم آپ کے بیٹے آپ کی عزت اور آزادی کے لیے جہاد کر رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں آزادی کوئی دوسرا پلیٹ میں سجا کر پیش نہیں کرے گا ہمیں اپنا حق خود حاصل کرنا ہو گا۔“

”گل احمد بھائی میں اس مہمان سے ملنا چاہتا ہوں۔ میرے ساتھ آئیے۔“ میں نے کسی کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا اٹھ کر ٹینٹ سے نکل گیا۔ میرے پیچھے گل احمد بھی نکل آیا تھا۔

”ادھر بھائی صاحب۔“ گل احمد نے آواز دی۔ میں نے پلٹ کر اسے دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

”میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اس لیے بہانہ کر کے اٹھا لایا ہوں۔“

”جی فرمائیے۔“ وہ میرے برابر آکر بولا۔ ”ویسے خیریت ہے نا؟“

”گل احمد بھائی۔“ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”ہر شخص چاہے اس کی حیثیت کچھ بھی ہو اپنے مفادات پر نگاہ رکھتا ہے۔ میرا خاندان تباہ کر دیا گیا ہے، ماں شہید ہو گئی، بہن کو اغوا کر لیا گیا اور باپ در ماندگی کی حالت میں یہاں پہنچا ہے۔ گل احمد! آپ ہی بتائیں جس شخص کے خاندان کے ساتھ یہ ظلم ہوا ہو وہ دوسروں کے مفادات کے لیے کیسے کام کر سکتا ہے۔“

”کر ہی نہیں سکتا۔“ گل احمد نے جواب دیا پھر ہمدردانہ لہجے میں بولا۔ ”بات کیا ہے؟“

”یہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں یہاں رہ کر ان کی مدد کروں۔“

”اور آپ؟“

”کیا میں بہن کو فراموش کر دوں؟“

”نہیں۔“ گل احمد بولا۔ ”خدا نخواستہ میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ اگر آپ نہیں جاسکتے تو مجھے وہاں کے حالات بتائیے وہاں کی ساری بہنیں میری بھی بہنیں ہیں۔ ہم ان کی سلامتی اور عزت کے لیے لڑ رہے ہیں، میں اسے تلاش کر کے بحفاظت یہاں پہنچا دوں گا۔“

”جزاک اللہ گل احمد۔“ میں نے اس کا شانہ تھپہ تھپایا۔ ”لیکن میں خود جانا چاہتا ہوں، اپنی بہن کے لیے ہی نہیں بلکہ سب ماؤں بہنوں کی خاطر، غلامی اور ظلم کے خلاف جنگ کرنے لیکن میں راستوں سے ناواقف ہوں پھر میرے ساتھ میری بیوی بھی ہو گی۔ میں چاہتا ہوں آپ ہماری رہنمائی کریں۔“

”دل و جان سے بھائی صاحب۔“ گل احمد نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا۔ ”مجھے ویسے بھی واپس جانا ہے۔ آپ کب تک جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔“

”ابھی اسی وقت۔“ میں نے پرجوش انداز میں بتایا۔ ”میرے پاس وقت نہیں ہے۔“

”اگر صرف آپ ہوتے تو ہم اسی وقت چل پڑتے۔“ گل احمد نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ”لیکن بہن جی کا معاملہ ایسا ہے کہ کچھ تیاری کرنا ہو گی۔ مجھے تھوڑا سا وقت دیجئے۔ ہر چہ وہاں کے بھیس میں سفر کریں گے بلکہ ضرورت کے تحت روپ بدلتے

جائیں گے۔

چونکہ اس کی تحیہ دل کو لگی تھی اس لیے میں نے اسے مہلت دے دی تھی۔ ابھی ہم واپس مڑنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ نوشی اور انو آتی دکھائی دیں۔ میں نے سرگوشی میں گل احمد سے کہا کہ مجھے اپنی بیوی سے بات کرنی ہے اس لیے نوشی کو وہ کسی بہانے واپس لے جائے۔

مجھے معلوم نہیں اس نے کیا بہانہ کیا تھا۔ وہ نوشی کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ انو نے مڑ کر ان کی جانب دیکھا تو چنچل نوشی نے دو انگلیاں نچا کر کوئی اشارہ کیا تھا۔ شاید انو زنانہ قسم کا اشارہ سمجھ گئی تھی مسکراتی ہوئی میرے قریب آن کھڑی ہوئی۔ مسکراہٹ نے جیسے اس کے چہرے کا خول بدل دیا تھا۔ وہ جب سر تپا مسکراہٹ بن گئی تھی تو مجھے بھی مصنوعی خول اتارنا پڑا تھا۔

”یہ مجھ سے چوری چوری کیا پروگرام بن رہا ہے؟“ وہ شاکی مگر دل ربا انداز میں بولی۔ ”میں نے آج نوشی کے ریڈیو پر ایک گانا سنا ہے۔ بہت اچھا لگا“ ایسے جیسے دل کی آواز ہو۔

”مجھے بھی سنا دو۔“ میں نے ایک پتھر پر بیٹھ کر کہا۔ ”یقیناً مجھے بھی اچھا لگے گا۔“ ”شاید نہ لگے۔“ وہ منہ پھیر کر مسکرانے لگی۔ ”لیکن مجھے صرف ایک بول یاد ہے“ نہ چھڑا سکو گے دامن۔ ”اس نے لابی پلکوں کو تھرکایا۔“ ہاں جہانگیر میرے دل کی آواز ہے“ اب تم چاہو بھی تو مجھ سے دور نہ جاسکو گے۔ مجھے اپنے سائے کی طرح کبھی آگے کبھی پیچھے پاؤ گے۔“

”لیکن سایہ گھٹتا بھی ہے۔“ میں نے پیار سے کہا۔ ”جب کہ تم لحظہ لحظہ بڑھتی رہو گی“ چھڑا نہ سکو گے دامن کی طرح میرے دل کی بھی ایک آواز ہے، گھٹانا نہ سکو گے میرا پیار۔“

”گواہ رہنا جہانگیر کہ عورت ہو کر اعتراف میں پہل میں نے کی ہے۔ تمہارے جواب کا شکریہ لیکن کہیں میرے اعتراف کا بھرم ہی نہ رکھا ہو تم نے۔ خیر میرے لیے تمہاری یہ مہربانی بھی بہت ہے۔ اکڑ جاتے، جھک دیتے تو میں کیا کر سکتی تھی۔“ ”آؤ خاموشی سے وہاں تک اوپر چڑھتے ہیں۔“ میں نے ایک تنہا درخت کی جانب

اشارہ کیا۔ ”ہمیں رومانیت کے خمار سے نکلنے کے لیے دشوار چڑھائی کی ضرورت ہے۔“ ”نہیں۔“ انو چھوٹے چھوٹے پتھروں کے اوپر بیٹھ گئی۔ ”ہم اتنے کمزور نہیں ہیں“ اب تم دنیا کے کسی بھی سنجیدہ اور خطرناک موضوع پر بات کر سکتے ہو۔“

”تھینک یو۔“ میں بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”میں نے اب جی کو ان کی خواہش پر یہاں سے رخصت کر دیا ہے۔ ان کے استفسار پر میں نے تمہارے متعلق بھی سب کچھ بتا دیا ہے۔ اگر تم نہ آتیں تو میں کسی بہانے باہر بلا لیتا“ میں جو سوال تم سے کرنا چاہتا تھا اب بے معنی ہو چکا ہے۔ اب تمہاری اطلاع کے لیے بتا رہا ہوں کہ ہم گل احمد کی رہنمائی میں آج یا کل کسی بھی وقت سری نگر کے لیے روانہ ہوں گے، گل احمد کی تجویز ہے کہ ہمیں چرواہوں کے بھیس میں سفر کرنا چاہیے۔ اس نے چرواہوں کے لباس کے لیے مہلت مانگی ہے، کیا تمہیں کچھ کہنا ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے پتھر پر پتھر ہاتھ دھوئے سرنفی میں ہلایا۔ ”میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو اپنے مردوں کے فیصلوں میں دراڑیں ڈال دیا کرتی ہیں“ اب وہی ہو گا جو تم فیصلہ کر چکے ہو۔ دراصل میں تمہارے بغیر خود کو ادھوری سمجھنے لگی ہوں۔ ایک رات کی دوری نے مجھ پر یہ انکشاف کیا ہے۔ میں رات بھر جاگتی اور تمہیں شروع سے اب تک سوچتی رہی ہوں۔“

جب سورج پہاڑ کے پیچھے اتر گیا اور ٹھنڈا سایہ ہمارے اوپر سے گزرتا تنہا درخت کی چوٹی پر چڑھ رہا تھا تو ہم ٹہلتے ہوئے ٹینٹ کے سامنے قدرتی گرا سی پلاٹ میں بیٹھ کر آنے والے کٹھن وقت کا شمار کرنے لگے تھے۔ انو اپنے ذہن کے کونوں کھدروں سے ماضی کے لوگوں کو نکالنے لگی۔ وہ سارے لوگ زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر انو سے ملے تھے، ان سب کا تعلق اس دیس سے تھا جہاں جانے کا ہم فیصلہ کر چکے تھے۔

”اگر ضرورت پڑی تو ہم خورشید بھائی سے مدد لے سکتے ہیں۔“

”کون خورشید.....“

”ڈاکٹر خورشید پاشا۔“ انو نے جواب دیا۔ ”جشید پاشا کے بہنوئی۔“

”اوہ..... ہاں.....“ مجھے بھی جشید پاشا کی بات یاد آگئی۔ ”جشید نے تعارفی

خط کی بات کی تھی لیکن ہم افرا تفری میں بھاگ نکلے تھے۔“

”ان کے علاوہ کچھ اور بھی لوگ ہیں۔“ انو جیسے مجھے سارا دینے لگی۔ ”اماں جانی کا سابقہ پرسل سیکریٹری نذیر باجوہ ہے۔ میری ایک فرینڈ فریدہ گجری ہے وہ فیملی پلاننگ ڈائریکٹر ہے، تم فکر نہ کرنا۔“

”ویسے ہماری کوشش ہوگی کہ ہم گمنام رہ کر اپنی مدد آپ کریں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان دنوں سیکورٹی فورسز کسی بھی مسلمان پر بھروسہ نہیں کرتیں۔ بالخصوص سرکردہ مسلمانوں پر خاص نظر رکھی جاتی ہے۔ میں نہیں چاہتا ہماری وجہ سے کوئی ہمارا ہمدرد زیر عتاب آجائے۔“

گل احمد آتا دکھائی دیا تو ہم نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بلا لیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ شاپنگ بیگ تھا۔

”میں لباس خرید لایا ہوں۔“ سلام کے بعد گل احمد نے بتایا۔ ”پل کے پار ایک ڈیرا ہے، استعمال شدہ دو مردانہ اور ایک زنانہ ڈریس ہے۔

انوں نے ایسے جھپٹا مارا جیسے بچی خوب صورت کھلونا دیکھ کر بے صبری ہو گئی ہو۔ ”اوہ گڈ گاڈ!“ انو خوشی سے بولی۔ ”یقیناً مجھے میرے خواب کی تعبیر مل رہی ہے۔ میں نے ایسی ہی نیچل لائف کا کبھی خواب دیکھا تھا، قبل از تاریخ لوگوں کی زندگی کا خواب، گل احمد بھائی ڈریس بھی دکھائیے۔“ اس نے شاپنگ بیگ الٹ دیا۔

”انوپلیز ہوش میں آؤ، تم کسی ریگستان میں نہیں ہو، لوگ ہمیں دیکھ رہے ہیں۔“ میں نے قدرے ترش لہجے میں اسے ہلکی سی ڈانٹ پلائی تو اس نے معذرتی نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ ”سوری..... میں جذباتی ہو گئی تھی۔“ اس نے سب کچھ واپس شاپنگ بیگ میں ٹھونس دیا تھا۔

”آپا جی۔“ گل احمد ادب سے بولا۔ ”گل احمد اپنی بہن کے لیے ایسے درجنوں لباس لا سکتا ہے، یہ تو مجبوراً پرانے لانا پڑے ہیں۔“

”شکریہ گل بھائی۔“ انو شرمندگی سے بولی۔ ”آپ پروگرام بتائیں میں نوشی کے پاس جا رہی ہوں۔“

”بہن جی ناراض ہو گئی ہیں شاید۔“ گل احمد پریشان سا ہو گیا تھا۔ ”آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے، ہم لوگ اگر چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا اظہار کھلے دل سے نہ کریں تو

دکھوں کے گھاؤ زندگی عذاب بنا دیتے ہیں۔ ان کی خوشی بچی خوشی تھی۔“

”یار ان عورتوں کی خوشی غم کا بھی کوئی معیار نہیں ہوتا۔“ میں نے کہا۔ ”خیرات میں منالوں گا۔ آپ بتائیں کیا گھر والے اجازت دے دیں گے؟“

”شاید نہیں۔“ گل احمد نے جواب دیا۔ ”میں نوشی کے کان میں کہہ دوں گا، بڑی صابر اور بہادر لڑکی ہے۔ وہ بعد کے معاملات سنبھال لے گی۔“

”پھر کب.....“

”آج رات دس بجے نکل چلیں گے۔“ گل احمد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تھا۔

رات کا کھانا سب نے ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر نبی مذاق میں کھایا، دونوں بوڑھے بھی بچوں کی خوشیوں میں شریک رہے تھے، چونکہ صرف نوشی جانتی تھی کہ اس کا بھائی اور جس عورت کو اس نے اپنا مان لیا تھا رات دس بجے اس سے جدا ہو جائیں گے اس لیے ہنستے ہنستے اچانک وہ چپ ہو جاتی اور دکھ کا دھواں اس کی روشن آنکھوں میں بھر جاتا۔

ٹھیک پونے دس بجے پہلے گل احمد بستر سے نکلا تھا۔ نوشی اور انو ایک ہی بستر پر تھیں۔ جب میں دبے قدموں نکل رہا تھا تو گل احمد نے خاموش آنکھوں اور لرزتے ہاتھوں سے اپنی بہن کو خدا حافظ کہا۔

نوشی مجبور مگر بہادر لڑکی تھی اس نے آنسوؤں کے گرم پنا کا رخ دل کی جانب موڑ دیا تھا۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا وہ انو کی ہانہوں میں ہولے ہولے لرز رہی تھی۔

چاند مشرقی پہاڑیوں کے پیچھے تھا لیکن چاندنی کا احساس اندھیرے کو شکست دے چکا تھا۔ ہم دریا کے ساتھ ساتھ اپنی منزل کی جانب بڑھنے لگے، چند میل کے فاصلے پر چند گھرانوں کی آبادی دکھائی دی اور پھر بربل سڑک چھوٹی سی کچی سرائے دکھائی دی تھی جس کی بیرونی دیواریں دھوئیں نے سیاہ بنا دی تھیں۔ جھکے ہوئے برآمدے میں چارپائی پر کوئی سویا ہوا تھا۔

”چاچا نور دین۔“ گل احمد نے اس کے چہرے سے لوٹی بٹائی تو بوڑھا بڑبڑاتا ہوا اٹھ بیٹھا تھا۔ ”یہ میں ہوں چاچا۔ بہت جلدی ہو جاتے ہو۔“

”اچھا اچھا۔“ بوڑھے نے ٹانگیں سکڑ کر جگہ بنائی۔ ”بیٹھ جا، تیرے ساتھ اور

کون ہے۔ کیا واپس جا رہے ہو؟

”ہاں چاچا۔“ گل احمد پامنتی اکڑوں بیٹھ گیا۔ ”پک اپ چاہیے۔“

”مل جائے گی۔“ اس نے لوٹی پرے کرتے ہوئے کہا۔ ”کہاں تک؟“

”گوندی تک اور کرایہ منہ مانگا۔“ گل احمد نے اسے بتایا۔ ”تیل پانی پورا ہونا

چاہیے۔“

”تم بھی بیٹھ جاؤ عزیزو۔“ چاچا نور دین نے وہی لوٹی اوڑھتے ہوئے کہا۔ ”اسے جگانے اور تیل پانی ڈالنے میں کچھ وقت لگے گا۔ چائے کی حاجت ہو تو اندر دودھ پڑا ہے بنالینا۔“

نور دین باتیں کرتا ہوا سرائے سے نکل کر پچھواڑے کی جانب چلا گیا۔

آپا جی آپ منجی پر بیٹھ جائیں۔“ وہ اٹھتا ہوا بولا۔ ”میں اندر سے بیچ لے آتا ہوں۔“

”بیٹھو بیٹھو گل احمد۔“ انو بے تکلف بستر پر چڑھ کر بولی۔ ”تم جیسے بھائی کے ساتھ بیٹھنے میں مجھے کوئی عار نہیں۔“

لیکن گل احمد اندر سے لکڑی کا بیچ لے آیا اور دیوار کے ساتھ بچھا کر بیٹھ گیا تھا۔ نیچے دریا کا پانی پُر شور انداز میں بہہ رہا تھا۔ میں نے سڑک کے کنارے جا کر دیکھنے کی کوشش کی تو گل احمد بھی میرے ساتھ آن کھڑا ہو گیا تھا۔

”یہ پانی کی آواز نہیں ہے بھائی جی۔“ گل احمد بولا۔ ”یہ چیز اور دیودار کے سانسوں کی آواز ہے۔ جب ہوا چلتی ہے تو یہ درخت اسی طرح بولنے لگتے ہیں۔“

”یہ پک اپ پروگرام میں تو شامل نہ تھی۔“ میں نے چاندنی میں دل موہ لینے والی وادی کو دیکھتے ہوئے کہا تو گل احمد ہنس پڑا۔

”میرے پروگرام میں تو تھی۔ کیا بہن جی کو پیدل لے جاتا؟“

”یہ گوندی کیا بلا ہے؟“

”بارڈر پر ایک گاؤں ہے۔“ گل احمد بتانے لگا۔ ”گوندی کے باسی ان مچھیروں جیسے ہیں جن کا ذریعہ معاش مچھلیاں پکڑنا اور آتے جاتے مسافروں کو آر پار لے جانا ہوتا ہے، وہ لوگ خود کو نو مین لینڈ کے آزاد باشندے سمجھتے ہیں۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم صبح تک بارڈر پر ہوں گے۔“

”انشاء اللہ اور کل رات بارڈر کراس کر جائیں گے۔“ گل احمد میرا ہاتھ تھام کر وہاں سے ہٹا لے آیا کیونکہ مخالف سمت سے کوئی گاڑی آرہی تھی۔ سڑک تنگ تھی وہاں کھڑے رہنا خطرناک بھی ہو سکتا تھا، جب سڑک قریب آئی تو گل احمد مجھے سرائے کے اندر لے گیا تھا، حالانکہ ہم مفرور مجرم نہ تھے کم از کم سویلین لوگوں سے ہمیں گھبراتا اور یوں روپوش نہیں ہونا چاہیے۔ نہ جانے گل احمد کیوں اتنا محتاط تھا، پک اپ کے ذریعے سفر کرنے کی متک بھی میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ میری اطلاع کے مطابق بارڈر تک پرائیویٹ ٹرانسپورٹ بھی چلتی تھی۔

چاچا نور بڑبڑاتا اندر آیا تو گل احمد نے اسے چار پائی تک جانے سے پہلے روک لیا تھا کیونکہ اندھیرے میں نہیں دیکھ سکتا تھا کہ بستر پر انونیم دراز ہے۔

”وہ بے وقوف ہے۔“ نور دین خود ہی بول پڑا۔ ”کتنا ہے لاکھ روپیہ بھی کوئی دے تو نہیں جاؤں گا۔“

”اچھا تو انکار کر رہا ہے تم نے بتایا نہیں کون لوگ ہیں؟“ گل احمد نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میں نے تو سنا تھا تم لوگ مجاہدین سے بہت محبت کرتے ہو۔“

”میں کرتا ہوں۔“ نور دین کی آواز ابھری۔ ”غریبی غربت میں کھانا کھلاتا ہوں آرام کے لیے بستر دیتا ہوں مگر گلاب دین مست اونٹ ہے۔ اسے کسی کی پروا نہیں۔ جب سے چار پیسے کمانے لگا ہے مجھے بھی آنکھیں دکھانے لگا ہے۔ کم بخت احسان فراموش ہے۔ میں نے پیسہ پیسہ جوڑ کر قسطوں پر پک اپ لے کر دی تھی۔“

”تمہارا کیا رشتہ ہے گلاب دین سے؟“ میں نے پوچھا۔

”جوائی ہے۔ بیٹی کا لحاظ ہے ورنہ دھکے دے کر بے دخل کر سکتا ہوں اسے۔“ نور دین دہک کر بولا۔

”چاچا ہمیں اس کا گھر دکھا دو۔“ میں نے التجائیہ آواز میں کہا۔ ”ہم اس کی منت کریں گے۔“

”نہیں مانے گا۔“ نور دین بولا۔ ”اس کی آنکھ میں سُرور کا بال ہے۔“

”ایک کوشش تو کی جاسکتی ہے۔“

”قسطوں کے کتنی رقم بنتی ہے؟“ میں نے پوچھا کیونکہ ہمارے پاس اتنی رقم تھی جو اُس پار ہمارے لیے بے کار ہو جاتی۔ میں نے سوچا کسی مجبور شخص کے کام آجائے تو اچھا ہے۔

وہ اندر گیا اور دو منٹ بعد چادر اوڑھے واپس آگیا، اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی۔ جس کے ہاتھ میں لائین تھی، روشنی کی زد سے بچنے کے لیے انو نے فوراً اپنا رخ پھیر لیا۔

راستے میں مخالف سمت سے آتے کئی ٹرک ملے پھر جب صبح کی سپیدی کے آثار
شرقی افق سے ابھرنے لگے تو پرائیویٹ بسیں اور سوزوکیوں کی آمدورفت بھی دیکھنے میں
آئے گی۔

”ہم تمہاری بہن کو زحمت نہیں دیں گے گلاب دین۔“ میں نے کہا۔ ”ایک دن کسی بھی جگہ گزر جائے گا۔“

”زحمت کیسی جناب۔“ گلاب دین اتنا ممنون تھا کہ ہم پر احسان کر کے اس بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ ”اپنا گھر ہے کھانا پینا پسند کا ہو گا۔ آپ آرام کریں گے، میں رات تک

”آپ چلے جائیں۔ ورنہ وہ سمجھے گا آپ ہمیں لائے ہیں۔ ناراض ہو گا آپ سے.....“ وہ جانا نہیں چاہتا تھا میں نے اصرار کر کے اسے نیچے بھیج دیا۔ کل احمد نے آگے بڑھ کر دروازہ بجایا تو وہ فوراً باہر آ گیا تھا۔

”دیکھو گلاب بھائی۔“ گل احمد نرم آواز میں بولا۔ ”ہمیں آج ہی پار جانا ہے ہماری مدد کرو، یہ تمہارا فرض بھی ہے۔“

”تم چلو گے گلاب دین۔“ میں نے ریو الوار اس کی گردن پر رکھ کر غراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ورنہ بارہ گولیاں تمہارے حلق چھلنی کر دیں گی۔ تم جیسے خود غرض انسان کی موت کا کسی کو بھی دکھ نہ ہو گا۔“

”میں اس کی سفارش نہیں کروں گی۔“ وہ مضبوط آواز میں بولی۔ ”واقعی خود غرض انسان ہے، میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کی خاطر اسے معاف کر دیں۔ میں چاہایاں لے آتی ہوں، اس میں تھوڑی سی بھی انسانی غیرت ہوئی تو آپ کو چھوڑ آئے گا۔“

”ہمن جی۔“ گل احمد بول پڑا۔ ”ہم مجبور نہ ہوتے تو آپ لوگوں کو کبھی تکلیف نہ دیتے، جاؤ چاہیاں اور ڈیزل کا جری کین لے آؤ۔“

وہ اندر چلی گئی تو گلاب دین پھنسی پھنسی آواز میں بولنے لگا۔

آپ کے پاس رہوں گا۔

”جیسی تمہاری خوشی۔“ میں نے اونگھتے ہوئے مختصر جواب دیا لیکن وہ ڈرائیور تھا اونگھ بھی نہیں سکتا تھا لہذا اونگھ کو دور کرنے کے لیے اسے باتوں کی ضرورت تھی۔

”ایک خاص بات اور بھی ہے جی۔“ وہ بولا۔ ”گاؤں کے کچھ منافق لوگ بکے ہوئے ہیں۔ وہ پہلے پناہ دیتے ہیں خوب خدمت خاطر کرتے ہیں اور پھر بخبری کر کے مروا دیتے ہیں۔ اس لیے ہم سویرے سویرے نذیراں کے گھر داخل ہوں گے کوئی کتا دیکھے گا نہ بھونکے گا۔“

مجھے بڑے زور کی نیند آئی ہوئی تھی، انہو تمام سفر میں میرے شانے سے لگی سوتی رہی تھی، پیچھے شاید گل احمد نے بھی نیند پوری کر لی تھی لیکن مجھے گلاب دین نے سونے نہ دیا تھا۔

وہ گاؤں دریا کے دہانے پر آباد تھا۔ جب ہم گاؤں میں داخل ہوئے تو گاؤں کی زندگی دن کے معمولات میں مصروف تھی۔ سڑک کے کنارے ایک ہوٹل دکھائی دیا تو میں نے بہ اصرار گلاب دین کو ناشتالانے بھیج دیا۔

انہو کی وجہ سے ہم ہوٹل میں جانا نہیں چاہتے تھے کیونکہ وہ ڈرائیوروں کا مخصوص ہوٹل تھا۔ سڑک کے کنارے قطار میں کئی ٹرک کھڑے تھے اور ڈرائیور لوگ بان کی بڑی بڑی چارپائیوں پر بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔

نان اور بھینس کے سری پائے کا گاڑا شامبہ طباق نما پلاسٹک کی پلیٹوں میں گلاب دین لایا تھا۔ ہم نے پچھلی سیٹوں کے درمیان گاڑی کے فرش پر لوئی بچائی۔ گل داد نے انہو کے لیے الگ پلیٹ منگوائی تھی۔

چائے پی کر ہم نے پھر سفر شروع کر دیا تھا۔ نذیراں کا گھر گاؤں کے آخری سرے پر تھا تین کمروں پر مشتمل تھا۔ نذیراں کا خاوند کڑیل نوجوان تھا لباس اور رکھ رکھاؤ سے تعلیم یافتہ دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی اور عزت سے ہمارا استقبال کیا تھا۔ چونکہ ہم ناشتا کر چکے تھے اس لیے ہماری درخواست پر ہمیں الگ کمرادے دیا گیا تھا۔ میں تو بستر پر لیٹتے ہی بے سدھ ہو گیا تھا۔

دو بجے دوپہر کے کھانے کی وجہ سے جاگنا پڑا۔ کھانے میں چونکہ گلاب دین اور اس

کا بہنوئی راسب خان شریک تھے اس لیے انہو کو نذیراں دوسرے کمرے میں لے گئی تھی۔ کھانے کے بعد چائے آئی تو گلاب دین نے نہایت ہی محتاط انداز میں دوسرے مرحلے کو موضوع بنایا تھا۔ ”میں نے راسب بھائی سے بات کر لی ہے۔“ گلاب دین نے بتایا۔ ”یہ سری نگر تک کئی پھیرے لگا چکا ہے تمام محفوظ راستوں سے آگاہ ہے۔ ایک ہزار معاوضے پر سری نگر تک ساتھ جائے گا۔ میں نے اسے معاوضہ ادا کر دیا ہے۔“

”معاوضے پر نیک کام کرنے پر شرمندہ ہوں۔“ راسب خان نگاہیں جھکا کر بولا۔ ”لیکن بارڈر سیل ہونے کی وجہ سے میرا ذریعہ معاش ختم ہو گیا ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے جواب میں بتایا۔ ”ہمارے پاس کچھ رقم ہے اس ہزار کے علاوہ سری نگر پہنچ کر ساری تمہارے حوالے کر دیں گے۔“

”آپ آرام کریں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے کم از کم ایک ٹٹو کا انتظام کرنا ہے زنانہ مسافر کے لیے۔“ انہو کھانا کھا کر دو منٹ کے لیے آئی اور پھر نذیراں کے ساتھ واپس چلی گئی تھی، گلاب دین بھی معذرت کرتا ہوا نکل گیا تھا۔

”کچھ اندازہ لگایا آپ نے؟“ ان کے جانے کے بعد گل احمد نے مدھم آواز میں پوچھا۔ ”مجھے یہ شخص راسب بڑا گھرا معلوم ہوتا ہے۔ پر لے درجے کا چالپوس ہے ایسے لوگ قابل بھروسہ نہیں ہوتے۔“

”کیسا بھی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”رقم کے لالچ میں ہمارا وفادار رہے گا۔“ ”ہاں آپ نے خوب چال چلی ہے کم از کم سری نگر تک کھوجی کتے کی طرح آگے آگے چلتا رہے گا۔“

باتوں باتوں میں شام ڈھل آئی۔ راسب خان نے خوش خبری سنائی تھی کہ ایک اچھے ٹٹو کا انتظام ہو گیا ہے۔ اس نے ٹٹو ہمارے لیے خرید لیا تھا، میرے پاس پاکستانی کرنسی کی بھی کئی گڈیاں محفوظ تھیں اس لیے میں نے فوراً ٹٹو کی قیمت راسب خان کو ادا کر دی تھی۔

راسب خان کو میں نے ارادتا گڈیوں کی جھلک دکھائی تھی، اس کی آنکھوں میں بھوک کی ایسی چمک ابھری تھی جیسے کتاب بوٹی دیکھ دم ہلانے لگتا ہے۔ راسب خان کچھ اور بھی زیادہ بچھنے لگا۔

ہیں۔“

”مظلوم کشمیریوں کو ایسی ہی بہادر بیٹیوں کی ضرورت ہے۔“ راسب خان نے بھی تعریف کی۔ ”ایک تیری بہن ہے گیدڑ جنگل میں روتے ہیں تو وہ گھر کے اندر ڈر جاتی ہے۔“

گلاب دین شاید اسے کوئی سخت جواب دیتا مگر ہماری وجہ سے وہ صرف تھوک نکل کر خاموش رہا تھا۔ جب راسب خان نے تیاری کا اعلان کیا تو نذیراں بھی انوکھ خدا حافظ کہنے چلی آئی۔ ہم اس کے گھر سے نکل کر اترائی کے دہانے پر جا کر انوکھ انتظار میں رک گئے تھے۔ انوکھ نذیراں محلے کی تنگ اور بل کھاتی گلی میں پیچھے پیچھے آ رہی تھیں۔

”گل احمد!“ میں نے بے نام سی بے چینی میں کہا۔ ”اسے لے آؤ۔ یہ عورتیں باتوں میں اصل مقصد تک بھول جاتی ہیں۔“

گل احمد نے سفری جھولانچے رکھا اتنے میں راسب خان ٹٹو کے ساتھ کہیں نیچے اتر گیا تھا۔ اترائی کے دونوں جانب درختوں اور جھاڑیوں کا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ جب گل احمد کو بھی واپسی میں دیر ہو گئی تو میرے اندر خطرے کی ساری گھنٹیاں بجنے لگیں۔

میں نے جھولانچہ اٹھا کر کندھے سے لٹکایا اور جدھر سے آیا تھا ادھر بڑھنے لگا۔ کلی دیران تھی زندگی اور آبادی کا احساس کتے دلا رہے تھے۔

”وہ کہاں ہے؟“ گل احمد کو تنہا آتے دیکھ میں نے ہڈیاں برمانے والی سرد آواز میں پوچھا۔

”میں دیکھتا ہوں شاید اندھیرے میں کسی دوسری گلی میں.....“

”وہ نذیراں کیا کہتی ہے؟“ میں نے گل احمد کا شانہ دبوچ کر کہا۔ ”وہ گلی میں گم ہونے والی نہیں ہے۔“

”حوصلہ، حوصلہ بھائی جی۔“ گل احمد نے میرا شانہ تھپک کر کہا۔ ”دیکھیں دائیں بائیں کتنی گلیاں مڑتی ہیں۔“

”میری بات کا جواب دو گل احمد۔ وہ عورت کیا کہتی ہے؟“

”وہ تو کہتی ہے آپ کے پیچھے، انکو جاتے دیکھا تھا۔“

میں پھر ملی ٹاہنوار گلی میں دوڑتا ہوا اترائی کے منہ تک گیا۔ ایک خیال آیا کہ ہو

جب میں نے ٹٹو دیکھا تو واقعی قد آور اور مضبوط تھا، گل احمد کو حیرت نے شک میں ڈال دیا تھا کہ اتنا اچھا جانور اتنا ستا مل ہی نہیں سکتا لیکن میں نے کوئی تبصرہ نہ کیا تھا۔

نوبے موم بتی کی روشنی میں راسب خان نے ایک نقشہ ہمارے سامنے بچھایا، نقشہ مار کر سے بنایا گیا تھا اہم مقامات کو سرخ دائروں، دریا اور نالوں کو نیلے رنگ اور سڑک کو سرمئی رنگ سے ظاہر کیا گیا تھا۔

”یہ دریا ہے جو مظفر آباد جا کر دوسرے دریا سے جا ملتا ہے۔“ راسب خان نے انگلی پھیرتے ہوئے بتانا شروع کیا۔ ”اس وقت آپ اس دائرے کے اندر ہیں۔ یہاں سے ہمیں آگے بڑھنا ہے۔ دیکھیے یہ نالہ ہے، نالے کی اس جانب ہماری فوج کی چوکی ہے اس پار بھارتی فوج کی پوسٹ ہے، دوسرا راستہ بذریعہ سڑک ہے ادھر بھی انڈین آرمی کی ایک مضبوط پوسٹ ہے۔ میں نے رابطہ قائم کیا تھا کچھ دے دلا کر نکل سکتے ہیں۔ یہ راستہ سفر کے لیے آسان ہے اور نالے والا جنگل سے گزرتا ہے۔ دو دن کے سفر کی منزل پر یہ پہاڑ ہے، اوپر توپ خانے کی ایک پوسٹ ہے لیکن وہ لوگ گشت نہیں کرتے۔ ہم بے خطر پہاڑ عبور کر جائیں گے، آدھے دن کا اور سفر ہے اگر کوئی رکاوٹ نہ پیش آئی تو ہم شام کے وقت میرا قتل شہر کے مرکزی حصے میں داخل ہو جائیں گے۔“

پہاڑ کے اس رخ کا سارا علاقہ میرا دیکھا ہوا تھا۔ اگر ہم پہاڑ سے بخیریت گزر جاتے تو آگے کوئی ایسا خطرہ نہ تھا، میرے دوست احباب بہت تھے ان میں کھل مل کر اپنے آپ کو محفوظ کیا جاسکتا تھا۔

”ہم جنگل والے راستے سے سرحد عبور کریں گے۔“ گل احمد نے حتی لہجے میں کہا۔ ”راستہ کٹھن تو ہے مگر محفوظ ہے۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں گل بھائی۔“ راسب خان فدویانہ آواز میں بولا۔ ”یہ تو چلو غیر سسی مگر تم میرے اپنے ہو، جیسے تم چاہو گے وہی ہوگا۔ کیا میری بہن نالے کا ٹاہنوار راستہ ٹٹو پر بیٹھ کر.....“

”ہاں بھائی صاحب۔“ انوکھ بولی پڑی۔ ”میں عورت ضرور ہوں مگر کمزور نہیں ہوں میں پیدل بھی چل سکتی ہوں۔“

”ہاں راسب بھائی۔“ گل احمد خیرہ آواز میں بولا۔ ”میری آپا ایک ہماڑر مجاہدہ

سکتا ہے رفع حاجت کے لیے جھاڑیوں میں چلی گئی ہو۔

لیکن وہاں بھی نہیں تھی۔ میں نے اسے تین بار پکارا کوئی جواب نہ ملا تھا۔ میں پھر پلٹ کر دوڑنے لگا تھا۔ شاید گل احمد نے اسے تلاش کر لیا ہو۔ گل احمد اور میں گلیوں میں دوڑنے لگے تو کتوں نے آسمان سر پر اٹھالیا تھا، ایک کتا میرا راستہ روکنے کی غلطی میں مارا گیا تھا۔ میں نے اچھل کر کتے کو کک لگائی جب وہ اچھلا تو اٹھا کر دیوار سے مارتا ہوا آگے نکل گیا تھا، ایک گھومتی گلی کے موڑ پر ہم پھر مل گئے تھے۔

”کوئی حادثہ کوئی گریز ضرور ہوئی ہے۔“

”میرے ساتھ آؤ۔“ میں نے دہکتی آواز میں کہا۔ ”اب نذیراں بتائے گی کیا گریز ہوئی ہے۔“ میری کنپٹیاں لہو کی ٹھوکروں کی زد میں تھیں اور بھنجی ہوئی مٹھیاں پسینے سے بھیگ رہی تھیں۔

میں نے جاتے ہی راسب خان کے بند دروازے کو پاؤں کی بھرپور ٹھوک لگائی کمزور کواڑ پر شور انداز میں اندر جا کرے تھے۔

نذیراں بچے کو سینے سے چٹائے دیوار کے ساتھ کھڑی پٹی کی زد میں آئی کبوتری کی مانند سہمی ہوئی تھی، گل احمد نے لمبا قدم اٹھایا اور میرے آگے نکل گیا۔ میں نے بڑی بے رحمی سے اسے دھکا دے کر ایک طرف کیا، میں نے ہمیشہ اپنی پیاس کے لیے خود کنواں کھودا ہے۔ جس پیاس سے مجھے حالات نے دو چار کر دیا تھا اس کا تقاضا بھی یہی تھا کہ میں اپنی پیاس اپنے کنوئیں سے بجھاؤں۔

”میری ساتھی لڑکی کہاں ہے؟“ میری آواز میں عریاں درندگی تھی۔ جس نے نذیراں پر نزع کی سی کیفیت طاری کر دی تھی۔ وہ کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی شاید کچھ بولنا بھی چاہتی تھی مگر آواز حلق میں ہی انک گئی تھی۔

”بولو وہ کہاں ہے؟“ میں نے اس کے بالوں کی لہرائی لٹ کو جھٹکا دیا تو نذیراں کا منہ کھل گیا۔

”سنو بتا دو۔“ گل احمد نے التجائیہ لہجے میں کہا۔ ”اسے تمہارا بھائی کہاں لے گیا ہے۔“

”اپنے ساتھ۔“ نذیراں لرزشوں کے درمیان بڑبڑائی۔ ”میں..... میں نے

اسے بہت روکا تھا، وہ اسے اٹھا کر لے گیا ہے، وہ بے ہوش تھی۔ گلاب دین نے عقب سے حملہ کیا تھا۔“

میں دوڑتا ہوا باہر نکلا میرے پیچھے گل احمد بھی نکل آیا تھا۔ ہم شور کرتے کتوں کو پھلاتے، ہٹاتے جب اڑے پر پہنچے تو وہاں گلاب دین کی پک اپ نہ تھی وہ نکل گیا تھا۔ گل احمد وہاں کھڑی سوزوکی دین کی طرف لپکا عین اسی وقت ایک گلی سے کار نمودار ہوئی۔ ناہموار زمین کی وجہ سے ڈرائیور آہستہ آہستہ کار چلا رہا تھا۔

میں نے ایک سیکنڈ میں فیصلہ کیا اور دوسرے سیکنڈ میں ڈرائیور سیٹ سے باہر تھا میں نے اسے گھسیٹ کر باہر اچھال دیا تھا۔ وہ وقت سوچنے اور معذرت کا نہ تھا۔ گل احمد کو بھی گزرتے ایک ایک سیکنڈ کا احساس تھا وہ چلتی کار کا دروازہ کھول کر اندر آن گرا تھا۔

”احتیاط سے میرے بھائی۔“ وہ سیٹ پر سنبھل کر بولا۔ ”جو ہوتا تھا وہ ہو چکا ہے جو نہیں ہونا چاہیے اس کے لیے محتاط ڈرائیونگ اور حواس کو قابو میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ سڑک تنگ اور اندھے موڑ ہیں۔“

میں دانتوں پر دانت بجائے اسٹیرنگ کو مضبوطی سے پکڑے کار کو اڑائے جا رہا تھا۔ گل داد کو شاید شک تھا کہ میں پہاڑی سڑک پر محفوظ ڈرائیونگ نہ کر سکوں گا، جبکہ مجھے اپنے ہاتھوں اور ڈرائیونگ پر مکمل اعتماد تھا، کشمیر کی سڑکوں پر پندرہ برس کی عمر سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ دس منٹ کا فرق ہو گا۔“ گل احمد بولا۔ ”ہم اسے بہت جلد جا لیں گے۔“

”اس سڑک سے ذیلی سڑکیں کتنی نکلتی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔ مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ گلاب دین اصل سڑک چھوڑ کر دائیں بائیں ہو گیا تو ہم ان کو جلدی رہائی نہ دلا سکیں گے۔

”میں بھی آپ کی طرح ناواقف ہوں۔“ گل احمد نے جواب دیا۔ ”بند دین میں مجھے کوئی سڑک دکھائی نہ دی تھی۔ اگر کوئی براچ روٹ ہوا تو ٹائروں کے نشانات مل جائیں گے۔“

ایک موڑ مڑتے ہی میرا سانس رک گیا۔ گلاب دین کی دین موڑ سے پندرہ بیس گز سائڈ میں رکی ہوئی تھی اور گلاب دین گھٹنوں کے بل بیٹھناٹ بولٹ کس رہا تھا اس کے قریب اسپر وہیل پڑا ہوا تھا۔

اس نے گردن موڑ کر کار کی جانب دیکھا وہ اٹھانہ تھا شاید اسے یہ توقع نہ رہی ہو گی کہ تعاقب کرنے والے پرائیویٹ کار میں ہو سکتے ہیں۔

میں نے پک اپ سے دس قدم آگے جا کر کار روکی اور ہم دائیں بائیں سے پھرنے کی نیت سے اس کی جانب بڑھنے لگے تو گل احمد پک اپ کی ہیڈلائٹس کی زد میں آگیا۔ تب ہی گلاب دین الٹی فلا بازیاں لیتا ہوا جنگل کی طرف دوڑا تھا۔

گل احمد نے عین اس وقت ڈائیو لگا کر اس کا پاؤں دیوچ لیا تھا جب وہ چڑھائی چڑھتا ہوا گھنے جنگل میں داخل ہونے جا رہا تھا۔ اگر وہ جنگل میں داخل ہو جاتا تو پھر اسے تلاش کرنا محال ہو جاتا کیونکہ ابھی صبح کی روشنی بہت دور تھی۔

میں نے نیم وا دروازے کو کھول کر انوکو پکارا مگر کوئی جواب نہ ملا، تب میں اندر رینگ گیا اور فرنٹ سیٹ کو ٹٹولنے لگا۔ سیٹ خالی تھی۔ دکھ کا میرے پیٹ پر زور دار جیسے گھونسا لگا تھا، عجیب درد تھا وہ جو زندگی میں پہلی بار محسوس ہوا تھا۔ ماں کی موت اور زبیدہ کی گمشدگی کا دکھ میں سہہ چکا تھا لیکن انوکو کو سیٹ پر نہ پا کر میری روح چیخ اٹھی تھی۔

”انو باجی پیچھے باڈی میں ہیں۔“ گل احمد کی آواز نے میری چیختی روح پر جیسے مزہم رکھ دیا۔ میں نیچے اترا تو دیکھا گلاب دین گل احمد کے پاؤں میں گھٹنوں پر سر رکھے لیٹا ہوا تھا، میں اسے نظر انداز کرتا ہوا اچھل کر پک اپ کے اندر گیا اور ٹٹول کر انوکو تلاش کیا۔ وہ فرش پر اوندھی پڑی ہوئی تھی۔

”انو..... انیلا.....“ میں اندھوں کی طرح اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر چیخا۔ ”بولو.....“ انو نے پہلے سر اثبات میں ہلایا اور پھر غوں غوں کرنے لگی۔ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا، اس کے منہ پر پٹی بندھی ہوئی تھی، میں نے پٹی کی گانٹھ ٹٹول کر تلاش کی اور پھر پٹی کھول دی۔

”میرے ہاتھ پاؤں بھی بندھے ہوئے ہیں۔“ انو نے سانسوں کو سنبھالتے ہوئے بتایا۔ چونکہ ٹائیٹوں کی ڈوری تھی، گلاب دین اتاری تھا یا انو نے تڑپ تڑپ کر گانٹھیں

مضبوط کر دی تھیں، کوشش کے باوجود میں ایک گانٹھ بھی نہ کھول سکا تھا۔ ”گل احمد! میں نے گھبراہٹ آواز میں آواز دی۔ ”کیا تم اپنی کار پیچھے لا سکتے ہو؟“ ”میرا پاؤں اس ناگ کی گردن پر ہے بھائی جی۔“ گل احمد نے جواب دیا۔ ”مجھے اٹھا کر باہر لے چلو جمائیکر۔“ انو نے میری کھوئی ہوئی عقل کو روشنی دی۔ ”ہیڈلائٹس میں رسیاں کھولنا آسان ہو گا۔“

میں نے اسے ایک مقدس امانت کی طرح سنبھال کر اٹھایا اور پک اپ کے سامنے جا کر سڑک پر رکھ دیا پھر ہیڈلائٹس روشن کیں، ٹائیٹوں کی پتلی ڈور انوکو کی گداز گھائیوں اور پنڈلیوں میں کھب گئی تھی۔

”میری جیکٹ کی بیک پاکٹ میں چاقو ہے۔“ انو نے بتایا۔ میں نے اسے زمین سے اوپر اٹھایا اور چاقو نکال لیا لیکن ڈوری جلد میں کھسی ہوئی تھی اس لیے بڑی احتیاط اور آہستگی سے ڈوری کاٹنے میں خاصا وقت لگ گیا تھا پھر بھی اس کی کلائی میں کٹ لگ گیا تھا۔

”مجھے یقین تو تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔“ انوکلائی سہلاتے ہوئے بولی۔ ”مگر سوچتی تھی بڑی دیر کر دی میرے مہربان نے آتے آتے۔“

”ہم کچھ وقت محلے میں تمہیں تلاش کرتے رہے تھے ورنہ اتنی دیر نہ ہوتی۔“ میں نے فیض کے دامن سے کلائی کے کٹ سے خون صاف کرتے ہوئے بتایا۔ ”ویسے تعجب ہے انو جیسی تربیت یافتہ لڑکی ایک ڈرائیور سے مار کھا گئی ہے۔“

”اول بات یہ ہے کہ وہ ڈرائیور نہیں ہے۔“ انو نے ہاتھ بالوں سے الجھاتے ہوئے کہا جب اس نے ہاتھ میرے سامنے کیا تو میں خون آلود ہاتھ دیکھ کر جڑوں سے ہل گیا تھا۔

”یہ..... یہ.....“

”گھبرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔“ انو نے ہاتھ سڑک پر رگڑا۔ ”معمولی زخم ہے۔ ہاں تو میں بتا رہی تھی کہ اسے محض ڈرائیور نہ سمجھنا، اگر میں بھی اسے ڈرائیور ہی سمجھتی رہتی تو اس وقت یہاں نہ ہوتی، جب ادھر میں اور نذیراں گلی میں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھا رہی تھیں، گلاب دین ہم سے چند قدم آگے تھا، اچانک میری سماعت

سے ٹرانسمیٹر کی مانوس سیٹی کی آواز ٹکرائی، ابھی میں سمت کا اندازہ ہی لگا رہی تھی کہ غلاب دین راستہ چھوڑ کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں اور نذیراں جب اس کے قریب سے گزر رہی تھیں تو پھر ٹرانسمیٹر کی کال آئی تو غیر ارادی طور پر میں نے پلٹ کر غلاب دین کی جانب دیکھا تو غلاب دین نے اچھل کر ڈنڈا مجھے مارا۔ چوٹ اتنی اچانک اور سر کے پیچھے حصے میں لگی تھی۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی پھر جب مجھے ہوش آیا تو وہ مجھے جکڑ چکا تھا۔

”گل احمد! میں نے آواز دی۔“ غلاب دین کو ادھر لے آؤ۔“

گل احمد اسے کچی سڑک پر کتے کی لاش کی طرح گھسیٹتا لے آیا تھا۔

”احسان فراموش بول تیرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟“ میں نے اس کے بھگے ہوئے چہرے کو پاؤں سے اوپر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ”تم نہ صرف انسان ہو بلکہ کشمیری بھی ہو پھر تم نے ایسی حرکت کیوں کی ہے؟“

”اگر معاف کرنے کا وعدہ کرو تو تمہیں ایک ایسی اطلاع دے سکتا ہوں جو تمہاری سلامتی کی ضمانت بن سکتی ہے۔“

”نہیں غلاب دین۔“ گل احمد بول پڑا۔ ”تم شرائط منوانے کی پوزیشن میں نہیں ہو، ہم تمہاری کھال ادھیڑ کر اندر سے وہ اطلاع نکال لیں گے۔“

”گل احمد بھائی!“ انو نے کہا۔ ”پہلے اس کی تلاشی لو اس کے پاس ٹرانسمیٹر ہے۔“

”یہ خود نکالے گا۔“ گل احمد نے اس کے چہرے پر پاؤں مارا وہ الٹ گیا۔ ”جلدی کر خنزیر کی اولاد۔“ اس نے واسکٹ کی اندرونی جیب سے چھوٹا مگر طاقت ور لائٹ ریٹج ٹرانسمیٹر نکال کر گل احمد کے پاؤں میں رکھ دیا تھا۔

”اوں۔“ گل احمد نے ٹرانسمیٹر اٹھا کر میری جانب بڑھایا۔ ”تو تمہارا تعلق ان لوگوں سے ہے، جن سے محتاط رہنے کی ہدایت میرے کمانڈر نے کی تھی، جہانگیر بھائی بھارتی فوج نے کچھ اپنے ایجنٹ اور کچھ ادھر کے کشمیریوں کو خرید رکھا ہے، یہ لوگ ان تمام راستوں کی نگرانی کرتے ہیں جن سے مجاہدین آتے جاتے ہیں، یہ لوگ جانے والوں کی اطلاع نگران ملٹری پوسٹوں کو دیتے ہیں اور آنے والے۔۔۔ وٹ کر شہید کر دیتے ہیں۔“

”جہانگیر!“ انو اٹھتے ہوئے سرد آواز میں بولی۔ ”چاقو مجھے دے کر چند قدم پیچھے ہٹ جاؤ، یہ اپنے وطن، قوم اور انسانیت کا ہی دشمن نہیں ہے میرا مجرم بھی ہے۔“ میں نے کمائی دار چاقو جب کھولا تو رات کے سائلے میں کھڑکھڑاہٹ ابھری تھی۔

”ٹھہرو۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر گڑگڑایا۔ ”میں ایک نہیں ہوں، مجھ جیسے بہت سے لوگ تمہارے راستے کی نگرانی کر رہے ہیں، دیکھو ہر معاملے کی کوئی نہ کوئی قیمت ہوتی ہے مجھ سے میری زندگی کے عوض محفوظ راستوں کو خرید لو، ورنہ کبھی منزل تک نہ پہنچ سکو گے۔“

”اس کی کیا ضمانت ہوگی کہ تم ہمیں دھوکا نہیں دو گے۔“ انو نے پوچھا۔

”ضمانت صرف اعتماد ہی ہو سکتا ہے۔“

”تم جیسے احسان فراموش اور ضمیر فروش پر اعتماد کیسے کیا جاسکتا ہے۔“

”ٹھیک ہے جس طرح کی ضمانت تم چاہتے ہو وہی کرو۔“

”ہم تمہاری بوٹیاں اس جنگل میں رہنے والی مخلوق کے لیے چھوڑ کر اللہ کے بھروسے پر سفر پر روانہ ہو جائیں گے۔“

”اگر تم مجھے خوف زدہ کر رہی ہو تو اپنا وقت ضائع کر رہی ہو۔“ وہ بے خونی سے بولا۔ ”جب ہمیں کوئی فرض سونپا جاتا ہے تو ساتھ زندگی کی ضمانت نہیں دی جاتی۔“

”بہن جی۔“ گل احمد ایک قدم اٹھا کر درمیان آگیا۔ ”اگر یہ بالکل سچ بولے گا تو میں اس کی زندگی کی سفارش کروں گا۔ آپ پیچھے ہٹ جائیں۔ ہاں اب بولو کیا بتانا چاہتے ہو۔“

”اس سے پوچھو گل بھائی۔“ انو نے کہا۔ ”اس کا تعلق کشمیر کے کس حصے سے ہے۔“

”میں پار سے بھیجا گیا تھا۔“ اس نے بتانا شروع کیا۔ ”جب ہمیں معلوم ہوا کہ باغیوں کی مین پاور اور ایمونیشن سے مدد برائے مظفر آباد کی جاتی ہے تو ہائی کمان نے تمام راستوں کی نگرانی کا فیصلہ کیا اور پچاس رضا کار ادھر بھیجے گئے تھے۔ نذیراں اور راسب بھی ہماری ٹیم کے ممبرز ہیں۔ ہوٹل والا چاچا ہمارا کمیشن ایجنٹ ہے، وہ ان ہی لوگوں کو میرے پاس لے آتا ہے جن کی منزل مقبوضہ حصہ ہو۔ اسی سڑک پر دو بانڈیاں ہیں جو

شکار مجھ سے بچ کر نکل جاتا ہے اسے وہ پھنسا لیتے ہیں۔“

”تم اپنے شکار کو بارڈر تک کیوں لے جاتے ہو۔“ میں نے سوال کیا۔ ”تمہارا مقصد یہاں بھی پورا ہو سکتا ہے۔“

”پوسٹ کمانڈرز کی یہی ہدایت ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اگر ہم کسی کو آگے نہ جانے دیں تو ان کی آمدنی کا ذریعہ رک جائے گا۔ ہر مجاہد کی جیب سے کچھ نہ کچھ ان کو مل جاتا ہے۔ میں نے تمہاری عورت کو روک کر تم پر احسان کیا تھا۔ تم مجھے احسان فراموش کہہ رہے ہو۔ میں اپنے بھگوان کی سوگند کھاتا ہوں کہ یہ عورت اگر تمہارے ساتھ چلی جاتی تو اسب اسے فوجیوں کے کیمپ میں پہنچا کر انعام حاصل کر لیتا۔ تم سوچ سکتے ہو کہ عورت ایک مرد کو تو برداشت کر سکتی ہے مگر کیمپ کے بھوکے فوجی اسے جس اذیت سے دوچار کر دیتے وہ تم لوگوں سے پوشیدہ نہیں ہو گا۔“

”بارڈر تک جس جس پوائنٹ پر تمہارے ساتھی ہیں کیا تم اپنی زندگی کی قیمت پر نشان دہی کر سکتے ہو؟“

”زیادہ نہیں ہیں صرف پندرہ ہیں جن میں پانچ عورتیں ہیں۔“

”زیادہ کم کی تم بات نہ کرو۔“ گل احمد نے اسے ٹوک کر کہا۔ ”یہ بولو غلو ص نیت سے تعاون کرو گے، میں تمہیں زندگی کی ضمانت دیتا ہوں۔“

”باقی لوگ کہاں ہیں؟“ انو نے سوال کیا۔

”وٹوق سے نہیں بتا سکتا۔“ اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”مظفر آباد اور دیگر شہروں کی جانب چلے گئے تھے۔ ان سے صرف ٹرانسمیٹر پر رابطہ ہوتا ہے کبھی کبھی ان میں سے کوئی مجاہدین کے قافلے کی پیشگی اطلاع دیتا ہے۔“

”تعاون کی یقین دہانی کا شکریہ۔“ میں نے اس کے شانے کو تھپکی دی۔ ”ایک بات کا خیال رکھنا دھوکا دہی کی صورت میں ہمارے پاس صرف سزائے موت ہے۔“

”میں زندہ رہنا چاہتا ہوں اس لیے دھوکا نہیں دوں گا۔“ اس نے تھوک نکل کر خشک ہونٹوں کو زبان سے تر کرتے ہوئے کہا۔ ہم نے احتیاطاً کار کو سائیڈ میں لگایا اور اپنے ساتھ پچھلی نشستوں پر اسے بٹھالیا تھا۔ اس نے اپنا اصل نام سنطورام بتایا تھا۔ انو نے کرایہ کر اس سے بارڈر پار کی بہت سی مفید معلومات بھی حاصل کر لی تھیں۔

”یہاں رکیں۔“ سڑک ایک سرائے سے آگے نکلی تو سنطورام نے زبان اور ہاتھ بیک وقت استعمال کیے۔ گل احمد نے پک اپ سائیڈ میں لگائی اور پیچھے آگیا۔ میں انوکو محتاط رہنے کی تلقین کرتا ہوا سنطورام کے ساتھ گاڑی سے اتر گیا۔ سرائے کے عقب میں چڑھائی پر دس پندرہ گھروں پر مشتمل آبادی چاندنی میں دکھائی دی، ہر مکان دوسرے مکان سے فاصلے پر تھا۔

”یہاں ایک جوڑا مقیم ہے۔“ سنطورام نے بتایا۔ ”وہ بے ہاتھ ایک سابقہ فوجی ہے، اسے ایک سیکنڈ کے لیے بھی آپ نے ڈھیل دی تو وہ نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے، اس کی بیوی مقامی ہے وہ اسے مظفر آباد کا رہائشی سمجھتی ہے، دو ماہ قبل اسلامی طریقے پر نکاح ہوا تھا۔“

”تمہارا کام صرف اتنا ہے کہ تم اسے باہر بلاؤ اور تعارف کرا دو، اسے بتانا کہ تمہاری گاڑی خراب ہو گئی ہے آگے نہیں جاسکتی۔“

”ٹھیک ہے میں اسے لے آتا ہوں۔“ سنطورام نے قدم بڑھایا تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے طویل سانس لی تھی۔ ”کیا آپ ساتھ چلیں گے؟“

”ہاں دوست۔“ میں نے کہا۔ ”کیا ہم احق دکھائی دیتے ہیں۔“

ابھی ہم نے ایک مکان کا فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک بھیڑیا نما کتا غراتا ہوا حملہ آور ہوا۔ میری پیدائش اور پرورش شہری ماحول میں ہوئی تھی۔ کتا پالنا میرے نزدیک ایک نجس اور فضول خرچی کے زمرے میں آتا تھا مگر دیہاتی اور جنگلی زندگی رکھوالے کتے کے بغیر چار دیواری غیر محفوظ گھر کے مترادف تھی۔ کتوں کی وجہ سے لوگ بے چنت سو جاتے تھے پھر کتے خطرے کے الارم کا بھی کام دیتے تھے۔ اگر کتا ہمارا راستہ نہ روکتا تو ہم بے روک ٹوک وے ہاتھ کے گریبان تک ہاتھ لے جاتے مگر کتے نے ہمیں اتنا ہی مشکل میں ڈال دیا تھا جتنا گمران فوجی مشکل کا سبب بنتا۔ گل احمد نے کتے کو بیٹھ کر ہاتھوں پر لیا اور جھاڑیوں میں اچھال دیا۔ شاید وہ کتا مارشل آرٹ کے فن سے واقف تھا یا کوئی دوسری وجہ رہی تھی، مگر تھی اچھل کر مجھ پر آیا تب گل احمد نے غالباً اضطراری حالت میں کتے پر فائر جھونک دیا۔

میں کتے کے حملے سے بچنے کے لیے پیچھے ہٹا تو ناہموار پتھر لی جگہ پر توازن برقرار نہ

رکھ سکا۔

دوسرے فائر کی آواز پر میں نے زمین پر پڑے پڑے گردن موڑی تو چند قدم اوپر سنتو رام کو جھاڑی میں گرتے دیکھا۔ جھاڑیوں اور درختوں نے چاندنی کی روشنی کو مدھم کر رکھا تھا اس لیے کوئی اندازہ لگانا مشکل تھا کہ سنتو رام کو کیا ہوا ہے۔

”اے کون ہے یہ فائرنگ کون کر رہا ہے؟“ اوپر سے کسی نے بلند آواز سے پوچھا۔
”وہجے یہ میں ہوں سنتو رام۔“ گل احمد اور میں کسی ٹھوس جسم کو تو گولی چھید سکتے تھے، روک سکتے تھے مگر آواز کو گولی سے روکنا ہمارے بس میں نہ تھا۔ گو گل احمد نے سنتو رام پر دوسری گولی چلائی تھی مگر آواز کو گولی نہ دبا سکی تھی۔ سنتو رام نے چیخ کر کہا تھا۔ ”وہجے دشمن ہے بھاگ جاؤ۔“

وہجے کوئی عام دیہاتی نہ تھا کہ دشمن کی خبر پا کر دبک جاتا یا فرار ہونے میں دیر نہ کرتا بقول سنتو رام وہ سابقہ فوجی اور حاضر اندیز ایجنٹ تھا، سنتو رام کی آواز تو دم توڑ گئی تھی مگر وہجے ناتھ نے ہم پر آگ کی بارش برسانا شروع کر دی۔ پہلی تڑاہٹ پر ہی میں نے اندازہ لگا لیا کہ ہمارے دشمن کے ہاتھ میں خود کار آتشیں ہتھیار ہے۔ گل احمد بھی زمین سے چپک گیا۔ میں تو پہلے ہی نشیب میں گرا ہوا تھا، وہجے ناتھ نے ہدف پر برست نہیں مارا تھا صرف اندازے سے اس نے آواز کو نشانہ بنایا تھا۔ گولیاں ہمارے اوپر سے گزر رہی تھیں۔

گل احمد نے وقفے سے فائدہ اٹھانے میں دیر نہ کی۔ کراسنگ میں وہ میرے قریب چلا آیا۔ میں بھی رینک کرتین فٹ ابھرے پتھر کی آڑ میں ہو گیا۔

”آپ فوراً نیچے چلے جائیں بہن جی کوئی غلطی نہ کر بیٹھیں۔“ گل احمد نے سرگوشی میں کہا۔ ”ہمارے پاس ریوالور ہیں ہم کلاشن کوف یا برین گن کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔“

”کیا سنتو رام.....“

”میری جلد بازی نے کھیل کا پانسا پلٹ دیا ہے۔“ گل احمد تاسف بھری آواز میں بولا۔ ”وہ فرار ہو رہا تھا، پھر بھی مجھے فائر نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”جو ہوتا تھا ہو چکا ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”تمہاری جگہ میں ہوتا تو یہی

کرتا۔ تم بھی نیچے چلو۔ یہاں رہنا خطرناک ہو گا۔“

”میں اسے الجھائے رکھوں گا۔“ گل احمد نے کہا۔ ”آپ گاڑی لے کر نکل جائیں۔“

”نہیں گل احمد میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ چلو ضد مت کرو۔“

چھوٹے بڑے پتھر اور اونچی نیچی جھاڑیوں سے ہمیں قدرتی آڑ مل گئی تھی ورنہ دشمن اور ہمارے درمیان فاصلہ زیادہ نہ تھا، چونکہ ہم سرگوشیوں میں گفتگو کر رہے تھے اس لیے وہجے ناتھ مغالطے کا شکار ہو گیا تھا یا وہ حماقت کی حد تک دلیر شخص تھا۔ اپنی کارروائی کا نتیجہ دیکھنے نیچے اتر آیا۔ میری نظر اس وقت اس پر پڑی جب وہ دو پتھروں کے درمیان سے سرکنا ہوا نیچے اتر رہا تھا۔ چاند اس کی پشت پر تھا اس لیے وہ نمایاں ہو گیا۔

میں نے پتھر سے پشت لگا کر گل احمد کا ہاتھ دبا دیا وہ فوراً نیچے ہو کر دبک گیا تھا پھر ہمارے درمیان جھاڑیاں حائل ہو گئیں، صرف پتھروں کی مدھم مدھم چڑچڑاہٹ اور بجری کی دبی دبی آواز سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ محتاط انداز میں نیچے آ رہا ہے۔

معاذہ نمودار ہوا اور اس کا طویل سایہ ہم پر چھا گیا تھا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا اور اچانک اتنے قریب دشمن کو دیکھ کر قدرتی طور پر اسے جھٹکا لگا تھا اور وہ پیچھے ہٹنا چاہ رہا تھا کہ میرے ریوالور سے یکے بعد دیگرے دو شعلے نکل کر اس سے ٹکرائے اور وہ جھاڑیوں میں الٹ گیا تھا۔

جس طرح اپنی کارروائی کا نتیجہ وہجے ناتھ نے دیکھ لیا تھا اسی طرح کی حماقت اگر میں بھی کرتا تو شاید موٹا سانپ سارا زہر میرے جسم میں اگل دیتا اس لیے میں اور گل احمد کرائنگ کرتے ہوئے سڑک پر اترے تھے۔

انوکئی عام سی عورت نہ تھی کہ فائرنگ کی آواز اسے حواس سے بیگانہ کر دیتی۔ اس نے فائرنگ شروع ہوتے ہی خود کو محفوظ کر لیا تھا، جب اس نے ہمیں سڑک اترتے دیکھا تو کسی طرف سے نکل کر فوراً قریب چلی آئی۔

”کیا وہ فرار ہو گیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“ گل احمد نے جواب دیا۔ ”عارضی دوزخ سے فرار ہو کر ابدی دوزخ میں

چلا گیا ہے۔“

”اب ذرا یونگ تم کرو گے گل احمد۔“ میں نے تھکے تھکے لمبے میں کہا۔ ”اس تباہی اور خونی کھیل نے میرا موڈ خراب کر دیا ہے، میرا وہ یقین اور خوش فہمی بھی ہلاک ہو گئی ہے کہ کم از کم آزاد کشمیر دشمن کی زد سے پاک ہے۔“

”لیکن میرا یقین اور پختہ ہو گیا ہے۔“ گل احمد بولا۔ ”کہ اللہ اپنے سپاہیوں کو پہاڑوں، صحراؤں اور جنگلوں میں بھی تنہا نہیں چھوڑتا۔ کیا ہماری عقل اور طاقت نے ہماری جان بچائی ہے؟“ گل احمد بولتا ہوا سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں اور انو گھوم کر فرنٹ ڈور سے فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھے۔

”ہاں اب پوری بات بتاؤ یہ اتنی فائرنگ کس نے کی تھی؟“ انو نے پوچھا تو گل احمد نے خود کو مورد الزام ٹھہراتے ہوئے اسے پورا واقعہ سنایا۔

”نہیں میرے بھائی تم نے جو کیا بالکل درست کیا ہے۔ میں سانپ کو آستین میں رکھنے کے خلاف تھی تم دونوں کی وجہ سے چپ تھی۔ دشمن اور پھر ہندو اور اس کے تعاون اور زبان پر بھروسہ دینے کا خواب تو ہو سکتا ہے کسی عقل مند کا فیصلہ نہیں۔“

”سوچنا یہ ہے کہ راستے میں چھپے ہوئے سانپوں سے کیسے بچ کر نکلیں۔“ میری بات کا جواب کسی نے نہ دیا تھا پھر میں بھی خاموش ہو گیا تھا۔ دل میں ندامت کا احساس بھی ہونے لگا تھا کہ گل احمد ہماری وجہ سے خطرناک سفر کا ساتھی بنا ہے ورنہ وہ کچھ دن اور اپنے والدین کے ساتھ رہتا۔

مشرقی افق کے لبوں پر نئی صبح کی روشنی آہستہ آہستہ ابھر رہی تھی۔ انو میرے شانے سے سر نکالے اپنی نیند پوری کر کے بیدار ہو چکی تھی کہ گل احمد کو بکریوں کے ریوڑ کی وجہ سے گاڑی کی رفتار کم کرنا پڑی تھی۔ شاید چرواہوں نے رات سڑک سے ہٹ کر اوپر بسر کی تھی اور صبح کے آثار دیکھ کر سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ بہت بڑا ریوڑ تھا آدھا سڑک پر اور ادا اترائی اتر رہا تھا۔

”یہ نوگ اگر مان جائیں تو ہم سرحد پار کر سکتے ہیں۔“ گل احمد بولا۔ ”ان لوگوں سے تاوان لے لیا جاتا ہے۔ یہ بہ آسانی ادھر ادھر ہو جاتے ہیں۔“

”کیا جرنی بیگ تم ساتھ لائے ہو؟“ انو نے پوچھا۔

”ہاں۔“ میں نے جوباب دیا۔ ”ٹھیک ہے گل احمد ہم آگے نکل کر ان لوگوں کا

روپ دھار لیں گے اور پھر ان سے معاملے کی بات کریں گے۔“

ایک ویران مگر خوش منظر جگہ گاڑی روک کر ہم نے باری باری چھوٹے سے پہاڑی جھرنے کے پانی سے پیاس بجھائی۔ پک اپ کے گرم انجن کو غسل دیا اور وضو کر کے ہم نے گل احمد کی امامت میں فجر کی نماز ادا کی تھی۔ سچی بات ہے نماز کے معاملے میں ہم دونوں بدبخت تھے۔ گل احمد کی تقلید میں مجھے اور انو کو اپنے رب کی عبادت کا خیال آیا تھا۔ میں تو بچپن سے ہی نماز کا پابند نہ تھا قصور میرا نہیں بلکہ ماڈرن طرز زندگی، ماحول اور سیکولر نظام تعلیم نے مجھے اپنے دین سے دور رکھا تھا۔ ہمارے گھر میں اللہ کی مقدس کتاب قرآن حکیم بھی تھی اور ایک صابر و شاکر اور متقی عورت بھی رہتی تھی جو ہماری ماں تھی لیکن بچے باہر سے سیکولر ازم کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور گھر پر بیوروکریٹ باپ کے نقش قدم پر چلتے تھے۔

مجھے یہ اعتراف ہے کہ اس صبح مجھے ندامت کے شدید احساس کے ساتھ ساتھ نماز ادا کرنے کی انجانی سی خوشی بھی محسوس ہوئی تھی۔ یوں لگا جیسے کوئی بھولا بسرا عہد ایفا ہو گیا۔

نماز سے فارغ ہو کر ہم نے جرنی بیگ سے چرواہوں کا مخصوص لباس اپنے اپنے لباس پر چڑھا لیا تھا، چونکہ لباس کھلا تھا اس لیے بہ آسانی نیچے کا لباس چھپ گیا۔ گل احمد کی ہدایت پر میں نے انو کے بالوں کا اسٹائل بھی بدل دیا تھا، چونکہ میرا اور انو کا قدرتی رنگ کھلے گلاب جیسا تھا اس لیے گل احمد کے مشورے پر ہم نے گاڑی کے گرلیں زدہ پرنوں سے ہاتھ اور گلے تک چہرہ میلا کر لیا تھا۔

میری رائے تھی کہ گاڑی سڑک کے کنارے چھوڑ دی جائے لیکن گل احمد اور انو اس آم کی گھٹلی کے دام کھرے کرنا چاہتے تھے۔ جب گاڑی فروخت کرنے کا فیصلہ ہوا تو گل احمد نے ہی یہ ذمہ داری قبول کی تھی۔

پانچ چھ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں تھا اور گاڑیوں کا ایک بازار بھی تھا۔ بازار میں سوختہ کڑیوں کی ٹال تھی۔ گل احمد نے پہاڑی لباس اتارا اور گاڑی لے کر ٹال پر چلا گیا۔ چونکہ گاڑی کے تمام کاغذات گاڑی کے ساتھ موجود تھے اس لیے خریدار نے لوٹ کا مال سستے داموں فوراً خرید لیا تھا اور گل احمد دس بجے اس سرائے میں داخل ہوا تھا

جس میں وہ ہمیں تنہا چھوڑ گیا تھا۔

”یہ نیچے رقم۔“ اس نے خالی لفافے کی پوٹلی ہمارے درمیان چارپائی پر رکھ دی۔
”پچاس ہزار نقد اور دو ہزار روپے ماہانہ قسط پر سودا ہوا ہے۔“

”دو ہزار مگر.....“ انو بولنے چپ ہو گئی۔ شاید گل احمد کی بات سمجھ آ گئی تھی۔
قسط کی شرط قبول کر کے گویا اس نے خریدار کو ہر شک سے دور کر دیا تھا اگر وہ نقد پر ہی
اصرار کرتا تو کوئی بھی عقل مند پرکھ پر چول کا راستہ اختیار کر سکتا تھا۔

کچھ رقم میرے پاس تھی۔ ہم نے کل رقم کو تین مساوی حصوں میں تقسیم کیا اور
خفیہ جیبوں میں نوٹ رکھ لیے۔

چوتھا حصہ پہلے ہی بکریوں کی خریداری کے لیے الگ کر لیا گیا تھا چونکہ گوجری زبان
کا ماہر گل احمد تھا ویسے بھی وہ محنت کش مجاہد چرے مرے سے چرواہا ہی دکھائی دیتا تھا اس
لیے بکریوں کے حصول کی ذمہ داری بھی اس کو سونپی گئی۔

کرائے کی گاڑی پر ہم نے واپسی کا سفر شروع کیا لیکن دس پندرہ کلو میٹر تک
بکریوں کا کوئی نشان نہ دکھائی دیا۔ گل احمد ڈرائیور سے کہہ رہا تھا کہ ہمیں اپنے ساتھیوں
کی تلاش ہے اس لیے ہر آتے جاتے شخص سے ڈرائیور چرواہوں کے بارے میں پوچھتا
تھا۔ ایک لڑکے نے بتایا کہ صبح اس نے ایک ریوڑ کو سڑک چھوڑ کر جنگل میں جاتے دیکھا
تھا۔ ہم نے گاڑی سے اتر کر بکریوں کے قدموں کے نشانات دیکھے اور اللہ کے بھروسے پر
ڈرائیور کو کرایہ دے کر واپس بھیج دیا۔

جربنی بیگ کو میلی چادر میں باندھ کر پہاڑی لوگوں کا بوجھ بنا لیا گیا تھا اور گل احمد
نے پوٹلی پشت پر لاد لی تھی۔ میں اور انو ٹیڑھی ٹیڑھی لاٹھیوں کو ٹیک ٹیک کر پتھر لیے اور ناہموار
راستے پر گل احمد کی رہنمائی میں چل رہے تھے۔ جنگلی راستے کے دونوں اطراف گھنا جنگل
پھیلا ہوا تھا۔ ہم سے ایک غلطی ہوئی تھی کہ بازار سے ہم نے پانی کے لیے کوئی برتن نہیں
لیا تھا۔ جوں جوں چڑھائی بلند ہو رہی تھی تھکاوٹ ہڈیوں تک اترتی جا رہی تھی اور پیاس
سے حلق خشک ہو رہا تھا۔

”گل احمد میرے بھائی۔“ اچانک چلتے چلتے انو دیودار کے درخت سے ٹیک لگا کر
بولی۔ ”میں پرندوں کی آواز سن رہی ہوں دیکھو شاید پانی کہیں ہو؟“

”میں بھی سن رہا ہوں آپاجی۔“ گل احمد نے پلٹ کر جواب دیا۔ ”میں آپ کو
خوف زدہ نہیں کر سکتا کیونکہ ایک بھائی اور ایک مرد کی موجودگی میں آپ کے نزدیک
خوف آہی نہیں سکتا۔ ویسے بھی آپ بہادر خاتون ہیں۔ میں پرندوں کی زبان سمجھتا ہوں یہ
آوازیں خوف کی علامت سمجھی جاتی ہیں۔ جب پرندے کسی درندے کو یا اپنے دشمن کو
دیکھتے ہیں تو دوسروں کے لیے سنگٹل نشر کرنے لگتے ہیں۔“

”کیا اس جنگل میں درندے ہوتے ہیں؟“ انو نے سپاٹ آوازیں پوچھا۔
”یہ دنیا درندوں کی ہے آپاجی۔“ گل احمد نے جواب دیا۔ ”ویسے میں اس جنگل
سے اتنا ہی واقف ہوں جتنے آپ دونوں۔ البتہ آپ نے پانی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یقیناً
پرندے پانی کے آس پاس رہتے ہیں۔ میرا خیال ہے اس چڑھائی کی اترائی بھی ہوگی اور
اترائی میں پانی بھی ہوگا۔“

”کیا بھوکا جنگل ہے۔“ انو نے دیودار کی شاخ توڑتے ہوئے کہا۔ ”کوئی جنگلی پھل
نک نہیں۔“ اس نے پتے منہ میں ڈالے اور جب چبانے لگی تو اس کا منہ عجیب سا بن گیا
تھا۔ میری ہنسی نکل گئی تھی۔ انو نے گھور کر میری جانب دیکھا اور چبائے ہوئے پتے
”تھو“ کر کے مجھ پر پھینک دیے۔

”نواب زادی حضور۔“ میں نے آستین جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”اس درخت کے
پتے چبائے شاید ذائقہ خوشگوار ہو۔“

اس نے چہرہ دوسری طرف کر لیا اور پھر لکڑی ٹیکتی ہوئی چلنے لگی تھی۔
میں بے حس تھا نہ ظالم کہ ایک خاتون کو تکلیف میں دیکھ کر قہقہے لگاتا۔ مجھے انو کی
اذیت اندر ہی اندر کاٹ رہی تھی لیکن میں اظہار کر کے اس کی مایوسی میں اضافہ نہیں کرنا
چاہتا تھا۔ طفل تسلیاں انو جیسی بالغ النظر اور تجربہ کار عورت کے لیے بے معنی تھیں۔
میں مذاق سے اس کے حوصلے کی لرزتی دیواروں کو سہارا دے رہا تھا۔

”اللہ کا بھروسہ ہمارے لیے زادِ راہ ہے آپاجی۔“ گل احمد نے راستے پر پڑا خار دار
خشک درخت ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”بندے کا دیا ہوا زادِ راہ دھوکہ دے سکتا ہے ختم ہو سکتا
ہے لیکن اللہ مہربان کا بھروسہ کبھی بندوں کو دھوکا نہیں دیتا۔ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ وہ دیکھیے
اس چڑھائی کا اختتام۔“

انوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا جیسے وہ اللہ کا شکر ادا کر رہی تھی کیونکہ تھکن اور پیاس نے اسے بری طرح تڑھال کر دیا تھا۔ ہم تکلیف دہ چڑھائی کے عذاب سے نکلے تو دوسری طرف سرسبز وادی نے ہماری ساری تھکن دور کر دی تھی۔ اترائی کے وسط میں چند گھردکھائی دے رہے تھے اور وادی میں ہم نے بکریوں کو بھی نالے کے کنارے چرتے دیکھ لیا۔ یعنی وہ پہلی منزل جس کی ہمیں تلاش تھی ہمارے پاؤں کے نیچے تھی۔ گل احمد ہمیں درخت کے نیچے چھوڑ کر آبادی میں گیا اور گاگر کے ساتھ واپس آیا۔ گاگر ایک لڑکے نے اٹھا رکھی تھی۔

ہم نے ٹھنڈا پانی پیا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ گل احمد نے بسکٹوں کے پیکٹوں سے ایک پیکٹ پہاڑی لڑکے کو دیا۔ اس نے بے صبری سے وہیں ڈبا پھاڑا اور بسکٹ کھاتا ہوا واپس گیا تھا۔

”نیچے چل کر ہمیں پہلے معلومات حاصل کرنا ہوں گی۔“ گل احمد بولا۔ ”اگر چرواہوں کی منزل مقبوضہ علاقہ ہے تو کچھ دے دلا کر ان میں شامل ہونا ہمارے لیے بہتر ہو گا۔ ورنہ ریوڑ سے جدا ہونے والی بکریاں ہمیں بہت پریشان کریں گی۔“

”ہمارے رہنما تم ہو جو بہتر سمجھتے ہو کرو۔“ انہوں نے کہا۔ ”ہاں اگر وہ شراکت پسند نہ کریں تو محفوظ راستہ ضرور معلوم کر لینا اور یہ بھی کہ کتنے دن کا سفر ہو گا۔“

”اگر ہم رات بھر سفر جاری رکھیں تو بارڈر کراس کر لیں گے۔“ گل احمد نے بتایا۔ ”جس راستے میں آیا تھا وہ خطرناک تو ہے مگر شارٹ کٹ ہے۔“

”چاچو۔“ جھاڑی سے جھانک کر اس لڑکے نے آواز دی۔ ”میری ماں پوچھتی ہے کھانا یا چائے کی ضرورت ہے؟“

”کیا خیال ہے اس نیک خاتون کی دعوت قبول کر لی جائے؟“ انہوں نے بولی۔ ”میں تھوڑا آرام کر لوں گی۔“

”اچھے نیچے۔“ میں نے اسے پکارت کر کہا۔ ”ہم تمہارے ساتھ چلیں گے۔“ وہ ایک کمرے کا مکان تھا۔ صحن میں پتھر اور مٹی دیکھ کر ہم نے پہاڑی کی جانب دیکھا۔ وہ صابر و شاکر اور نڈر لوگ تھے۔ خطرات کی زد میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ لڑکے نے بتایا کہ موسم برسات کے دوران اکثر راتیں وہ لوگ مکان سے دور کسی جگہ

گزارتے ہیں۔ کیونکہ پہاڑی سے پتھر اور مٹی کے تودے گرتے رہتے ہیں۔ تیس بیس برس کی وہ عورت خاصی خوش شکل اور صحت مند تھی۔ ایک کمرے کی وجہ سے پردے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی اس نے خندہ پیشانی کے ساتھ ہمارا استقبال کیا حالانکہ ہم چرواہوں کے روپ میں تھے۔

پہلی کمٹی کی روٹیاں اور کچے دودھ کی لسی جب ہمارے سامنے آئی تو کھٹی کھٹی بدبو سونگھ کر انہوں نے روکھی روٹی کے چند نوالے لیے اور پانی پی کر لیٹ گئی، وہ اتنی گہری نیند میں ڈوبی تھی کہ شام تک ہم میں سے کسی نے اسے جگانے کی جرأت نہ کی تھی۔ وہ معصوم بچے کی طرح بے سدھ پڑی رہی تھی۔

گل احمد جب چرواہوں سے معاملات طے کرنے جانے لگا تو میں نے بھی جانا چاہا مگر اس نے آنکھوں آنکھوں میں مجھے سمجھایا کہ ہمیں سابقہ تلخ تجربے سے سبق لینا چاہیے اور انہوں کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ گو اس گھر میں ایک عورت اور اس کا کم سن بیٹا تھا مگر گل احمد کی بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔

گل احمد آٹھ بجے واپس آیا اس وقت گھروالی کا گھر والا بھی آچکا تھا۔ کڑیل نوجوان تھا جنگل میں چرائی کا کام کرتا تھا۔ انہوں نے ہماری میزبان نے کسی بھی خیال کے تحت اپنے خاوند پر اندر جانے کی پابندی لگا دی۔ چونکہ میں نے انہوں کے ذریعے اپنی میزبان کا حق خدمت کچھ زیادہ ہی ادا کر دیا تھا اس لیے رات کے کھانے میں مرغ شامل تھا۔

”تین ہزار اور زائد راہ کی قیمت پر معاہدہ ہوا ہے۔“ گل احمد نے کھانے پر بتایا۔ ”ان لوگوں کو جانا تو ہے مگر وہ منزل بہ منزل جائیں گے اب معاہدے کے مطابق بیس بکریوں کے ساتھ ایک جوڑا ہمارے ساتھ جائے گا۔ بارڈر کراس کرتے ہی وہ ہم سے الگ ہو کر اپنے ڈیرے پر انتظار کریں گے۔“

”گڈ۔“ انہوں نے سانس لے لے میں بولی۔ ”بھائی گل احمد تم واقعی اللہ کا خاص انعام ہو“ ورنہ یہ صاحب اپنے ساتھ مجھے بھی پکڑوا دیتے، چلے تھے گائیڈ کے ساتھ۔“

”بھول رہی ہو۔“ میں نے اپنا دفاع کیا۔ ”وہ گائیڈ بھی گل احمد نے ہار کیے تھے۔“ ”جی بے شک میں ان لوگوں کو پہچان نہ سکا تھا۔“ گل احمد ندامت سے بولا۔

”انسان کو چنان لیتا دنیا کا مشکل ترین کام ہے“ اصل انسان تو اندر بہت گہرائی میں رہتا ہے۔
میں اصل میں کیا ہوں میں جانتا ہوں۔“

”چھوڑو بھائی کس فلسفے میں الجھ گئے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”کھانا کھاؤ اور میزبانوں
سے اجازت مانگو ہمیں بہر طور رات کا ہی سفر کرنا ہے۔“

خاتون اندر آئی تو انہوں نے مناسب انداز میں اس سے بات کی پھر ہم تاریکی میں وہاں
سے نکل کر گل احمد کی رہنمائی میں ڈیرے میں داخل ہوئے۔ چرواہوں کے کتوں نے ہمارا
راستہ روکا تو گل احمد نے آواز دی۔ ایک شخص نے گوجری زبان میں کتوں کو ڈانٹ پلائی
اور ہمیں خیمے میں لے گیا۔

بچے سوئے ہوئے تھے۔ نچروں کے تھڑوں (کاٹھیاں) کو بیٹھنے کے لیے بطور صوف
سیٹ ان لوگوں نے پیش کیا تھا۔ جن کو وہ لوگ بطور تکیہ استعمال کرتے تھے۔ بکریوں کے
دودھ کی بو بڑی ناگوار تھی۔ انہوں نے ناک پر چادر رکھ لی تھی۔ میں نے معذرت کر لی مگر گل
داد پورا کٹورا پی گیا تھا۔

”میں نے احمد خان کو راستہ بتا دیا ہے۔“ ایک بوڑھے نے بتایا۔ ”اگر کسی نے روکا
ٹوکا تو یہ ان سے معاملہ طے کر لے گا ہمیں دو چار بکریوں کی قربانی دینا پڑے گی۔ ہاں اگر
زیادہ بکریاں ضائع ہوئیں تو ہزار روپے فی بکری تم لوگوں کو ادا کرنے ہوں گے۔“
گل احمد نے اسے یقین دلایا کہ ان لوگوں کا نقصان پورا کر دیا جائے گا اور یہ بھی
کہا کہ ہمیں فوراً روانہ ہونا چاہیے۔

احمد خان تیس چوبیس برس کا طویل قامت نوجوان تھا جب کہ اس کی بیوی پندرہ
سولہ برس کی فربہ بدن تھی۔ وہی اٹھارہ بکریاں ہانک لائی تھی۔ ہمارا ہم سفر ایک جیتل کتا
بھی تھا جو احمد خان نے پکڑا رکھا تھا کیونکہ اسے ہمارا ساتھ پسند نہ تھا۔

بکریوں کو یقیناً راستوں کی پہچان تھی۔ ہولے ہولے آگے آگے چل رہی تھیں
بعض اوقات اچانک راستہ مڑ جاتا کہیں دو راہے اور کہیں چو راہے تھے لیکن بکریوں کو کسی
بھی مقام پر اپنے رکھوالے کی رہنمائی یا ہدایت کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔

اچانک ریوڑ کا اور پھر بکریاں بدکنے لگیں۔ احمد خان نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا
اور غراتے کتے کے ساتھ بکریوں کے درمیان سے گزرتا آگے چلا گیا۔

”میرا خیال ہے آگے کوئی درندہ ہے۔“ گل احمد بولا۔ ”ہمیں احمد خان کی مدد کے
لیے جانا چاہیے۔“ چونکہ انہوں اور احمد خان کی بیوی سیکنہ ہمارے قریب تھیں اس لیے
سیکنہ نے بھی درپیش خطرے کو محسوس کر لیا تھا اس سے قبل کہ ہم اسے روکتے وہ دوڑتی
ہوئی نالے میں کود گئی۔ اس وقت ہم ایک درے میں تھے اوپر سے آنے والے پہاڑی
نالے کے کنارے کنارے جا رہے تھے۔ خطرہ شاید نالے میں تھا۔

معا میری سماعت سے ایسی آوازیں نکلاں جیسے دو درندے ایک دوسرے کو
بھنبوڑ رہے ہوں۔ ابھی چاند طلوع نہ ہوا تھا۔ میں نے انوکھا ہاتھ پکڑا اور پھر ہم گل احمد
کے پیچھے چل پڑے۔

گل احمد نے بیک سے نارچ نکال کر روشنی ادھر ادھر گمائی اور پھر روشنی ایک جگہ
ساکت ہو گئی۔ روشن دائرے میں جیتل سیاہ کتا واقعی کسی درندے سے لڑ رہا تھا۔ قریب
ہی احمد خان اور سیکنہ کھڑے تھے جیسے وہ ان کے لیے ایک دلچسپ تماشا ہو۔ احمد خان نے
ہمیں روک کر بتایا کہ جنگلی انسان نے راستہ روک لیا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ریچھ کو
جنگلی انسان کہہ رہا تھا۔ ابھی احمد بول رہا تھا کہ کتے کے حلق سے دردناک چیخ ابھری تو احمد
خان دوڑتا ہوا ادھر گیا۔

نارچ کی مدد روشنی میں ہم اس لڑائی کو پوری طرح روشنی کے دائرے میں
قید نہیں کر سکتے تھے البتہ ہم نے دیکھا تھا کتا ریچھ اور احمد خان تینوں سمٹتے گتھے تھے۔ مالک
اپنے وفادار رکھوالے کی مدد کرتے ہوئے خونخوار درندے سے لڑ گیا تھا اور ہم بے بسی
سے کھڑے تھے حالانکہ ہمارے پاس آتشیں ہتھیار تھے ایک گولی ہی لڑائی کا فیصلہ کر سکتی
تھی مگر تین ہدف آپس میں گنڈتے تھے ہم مطلوبہ ہدف کو نشانہ بنانے کا خطرہ مول نہ لے
سکتے تھے۔

”میں جاتا ہوں۔“ گل داد بول پڑا۔ ”اگر احمد خان زخمی ہو گیا تو ہمارا نقصان ہو
گا۔“ اس سے قبل کہ میں بولتا احمد خان لڑکھڑاتا ہوا آتا دکھائی دیا اس کے پیچھے کتا تھا اور
ریچھ اچھل رہا تھا۔

”تم ٹھیک تو ہو احمد خان؟“ میں نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔

”ہاں جی۔“ احمد خان بولا۔ ”ٹھیک ہوں۔ ہم نے اس موزی کو ادھیڑ دیا ہے۔“

احمد خان کی جی داری اور جذبہ وفاداری دیکھ کر مجھے ایک گونہ تسکین ہوئی کہ جو شخص اپنے کتے کی خاطر جان کی بازی لگا سکتا ہے وہ ہم جیسے انسانوں کے لیے کیا کچھ نہ کرے گا۔

سکینہ کی ایک آواز پر بکھری ہوئی بکریاں ادھر ادھر سے نکل کر کر قطار میں چل پڑیں۔ ہمارے درمیان پھر وہی ترتیب اور فاصلہ آگیا۔ ان دونوں نے خود کو آگے رکھا ہوا تھا مقصد یہی رہا ہو گا کہ کسی بھی خطرے کا سامنا وہ کریں گے اور ہمیں سنبھلنے کا وقت مل جائے گا۔ سفر کا یہ محفوظ اور رضا کارانہ انداز لڑاکا فورس میں ہوتا ہے مگر ایک چرواہے نے نہ جانے وہ طریقہ کہاں سے سیکھ لیا تھا۔

سورج طلوع ہوا تو ہم بارڈر سے ایک کلو میٹر دور برساتی نالے کے کنارے بیٹھے بکریوں کے تازہ تازہ دودھ میں بسکٹ بھگو بھگو کر ناشتے کی ضرورت پوری کر رہے تھے۔ انوں نے پھر بکریوں کا دودھ استعمال کرنے سے خاموش انکار دیا۔ متبادل انتظام نہ تھا لہذا انوں نے نہایت صبر و شکر سے بسکٹ کھا کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

دائیں ہاتھ تاحہ نگاہ جنگل تھا اور جنگل کے وسط سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کہیں آگ لگی ہوئی ہے مگر احمد خان نے بتایا کہ جنگل کے اندر چھوٹی چھوٹی آبادیاں ہیں۔ وہ لوگ جو مسلسل سرحدی نوک جھونک سے تنگ تھے وہ جنگل میں چلے گئے تھے۔ انوں نے بھک کر سکینہ کے کان میں کچھ کہا پھر دونوں نالے کے کنارے کنارے گھنی جھاڑیوں کی جانب چلی گئی تھیں۔ ہم نے ان سے پوچھا نہیں۔ قدرتی ضرورت ان کو لے جا رہی تھی۔

”ہمیں بھی جنگل میں دن گزارنا ہو گا۔“ احمد خان بولا۔ ”یہ فاصلہ ادھر ادھر کی فوج کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔“

معا کچھ فوجی سامنے آگئے۔ ہمارا درمیانی فاصلہ پچاس قدم رہا ہو گا تعداد میں وہ پانچ تھے پانچوں مسلح فوجی تھے۔

”کافر ہیں۔“ احمد خان کے ہونٹوں سے لرزتی ہوئی آواز نکلی۔

”گھبرانے کی ضرورت نہیں آزاد علاقے میں اپنے فوجی ہوں گے۔“ گل احمد نے

کہا۔

وہ قریب آگئے ان میں ایک کیپٹن، ایک صوبیدار اور تین چھوٹے رینک کے تھے۔ میں نے یونیفارم سے دل ہی دل میں احمد خان کی تائید کرتے ہوئے دعا کی تھی کہ انوں اور سکینہ نئی صورت حال سے آگاہ ہو جائیں ورنہ ہمارے لیے مشکلات کا دروازہ کھل سکتا تھا۔ دونوں نوجوان اور خوبصورت تھیں، وہ پانچ تھے ان کے پاس جدید اسلحہ بھی تھا۔

”اے ادھر کیا کر رہے ہو؟“ صوبیدار نے اکھڑے لبے میں پوچھا۔

”بکریاں..... جی صاحب بکریاں چرانے والے ہیں۔“ احمد خان نے اپنی مخصوص بولی میں جواب دیا۔ ”آپ کے پرانے چاکر ہیں صاحب جی۔“

”سینئر مین اسٹینڈ اپ۔“ کیپٹن نے تحکمانہ آواز میں کہا۔ اس کا حربہ میں نے سر کے اوپر سے اسی کی طرف اچھال دیا۔ درمیان میں، میں تھا اگر میں کھڑا ہو جاتا تو پھر مزید چھان بین کی ان کو ضرورت نہ رہتی مگر میں بھی تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ میں بہ دستور سر جھکائے بیٹھا رہا۔

کیپٹن میرے اتنا قریب آن کھڑا ہوا تھا کہ میری جھکی ہوئی آنکھیں اس کے گرد آلود لانگ بوٹ دیکھ رہی تھیں۔ پھر اس نے میرے پھیلے ہوئے پاؤں پر اسٹین گن کے بٹ سے ہلکی سی دستک دی۔ تب ہی میری نگاہ اپنے پاؤں پر پڑی اور سانس سینے میں گھٹ کر رہ گیا تھا۔ چرواہوں کے لباس کے نیچے جو لباس تھا اس کی پتلون شلوار کے کھلے پائینچے سے جھانک رہی تھی۔

”صوبیدار صاحب اس جوان کی تلاشی لیں۔“ اس نے اسٹین گن کی نوک میرے بالوں پر لگاتے ہوئے حکم دیا۔ ”باقی لوگ پوزیشن۔“

کھیل شروع ہو چکا تھا اور ہماری ٹیم پہلے ہی ہلے میں مغلوب دکھائی دے رہی تھی۔ تینوں مسلح فوجیوں نے ہمیں گن پوائنٹ پر رکھ لیا تھا۔

”اتارو گے یا میں اتار دوں۔“ صوبیدار نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔

”سر! اس لباس کے نیچے شرٹ اور پینٹ ہے اس کی صاف چمڑی بتا رہی ہے کہ یہ

چرواہا نہیں ہو سکتا۔“

”گڈ۔“ کیپٹن مسکراتا ہوا ایک قدم آگے آیا۔ ”ٹھیک ہے صوبیدار صاحب، ہمیں

ادھر زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا ان کو لے چلو۔“

”بکریاں بھی.....؟“ صوبیدار نے پوچھا۔

”ہاں.....“ کیپٹن بولا۔ ”اصل مجرم تو چرواہا ہے۔ یہ لوگ ہماری دوستی کی آڑ

میں دہشت گردوں سے خوب کمائی کرتے ہیں۔“

”سنو کیپٹن!“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”پہلی بات یہ ہے کہ میں دہشت گرد نہیں ہوں اپنے عزیزوں سے ملنے ادھر آیا تھا۔ میں کشمیری ہوں دوسری بات یہ ہے کہ چرواہوں سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے مظفر آباد آنے سے بہت پہلے سوپور میں ہی یہ لباس خرید لیا تھا۔ ان دونوں سے میری ملاقات گزشتہ شام ہوئی تھی۔ میں نے ان کو بتایا تھا کہ میرا ذرا آگے ہے۔“

”ادھر چل کر تعلق جوڑیں توڑیں گے دوست۔“ کیپٹن کندھے اچکاتا ہوا چل پڑا۔

”صاحب ان تینوں کو لے چلیں.....“

”ارے تم بکریاں راستے پر لگاؤ۔“ صوبیدار نے احمد خان کو دھکا دیا۔

تقریباً آدھا کلو میٹر بل کھاتے نالے میں چلنے کے بعد ایک ٹیکری کی اوٹ لی گئی تھی چونکہ سورج اوپر آچکا تھا اس لیے روشنی میں وہ لوگ آزاد علاقے میں چھپ کر سفر کر رہے تھے۔ میری تلاشی لے کر مجھے ہنتا کر دیا گیا۔ احمد خان اور گل احمد کی تلاشی تو نہیں لی گئی تھی البتہ گل احمد سے بھی ریوالور لے لیا گیا تھا۔ میں اور گل داد سپاہیوں کی نگرانی میں تھے۔ احمد خان بکریاں ہانک رہا تھا۔

”تم آگے آؤ باتیں کر س گے۔“ کیپٹن نے مجھے بلایا۔ ”اب تمہارے قدموں کے

نیچے وہ زمین ہے جو ہماری ہے۔“

”اس زمین پر کیا کرنے گئے تھے جو آپ کی نہیں ہے۔“ میں نے دوستانہ انداز میں

پوچھا۔

”شکار۔“ کیپٹن نے جواب دے کر قہقہہ لگایا۔ ”ہم عموماً ادھر سے ادھر شکار کھینے

جاتے ہیں۔“

”غالباً اس بار آپ کو شکار نہیں ملا۔“

”ہاں یار۔“ کیپٹن بولا۔ ”وہ سسر اپنی بیٹیوں اور بیوی کو لے کر کہیں چلا گیا ہے“

خالی گھر میں رات بسر کی اور دیر سے آنکھ کھلی۔ جب وہ ہوتی تھیں تو سونے کا وقت ہی نہ

”ماتھا“ آج سو گئے تھے۔“

”کیا آپ پوسٹ کمانڈر نہیں کیپٹن؟“

”ہیں۔ ہوں۔“

اچانک تڑتڑاہٹ کی آواز گونجی اور میں غیر ارادی طور پر ایک دم نیچے لیٹ گیا۔ قلیل وقفے کے بعد پھر برسٹ کی آواز ابھری اور کیپٹن اچھل کر ایک جھاڑی پر جاگرا۔ میں نے لیٹے لیٹے گردن گھمائی احمد خان کے علاوہ سب زمین بوس تھے۔ غور سے دیکھا تو حیرت اور خوشی کی لہروں کو محسوس کیا پانچوں فوجی خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ کیپٹن کا آدھا دھڑ جھاڑی کے اندر تھا اور خون کا فوارہ اس کی پشت سے ابل رہا تھا۔

دوسرے لمحے میں نے ان کو دائیں جانب سے آتے دیکھا وہ جنگل کی پٹی سے باہر آ رہی تھی اس کے پیچھے سیکینہ تھی۔

”نعرۂ تکبیر!“ گل احمد نے گھٹنوں کے بل اٹھ کر نعرہ لگایا۔ میں تو حیرتوں کے سمندر

میں ڈوبا ہوا تھا شاید انو نے نعرے کے جواب میں اللہ اکبر کہا ہو گا۔

”جما تگیر! انو نے پکارا۔“ تم ٹھیک ہونا؟“

میں نے ہاتھ لہرا کر اسے اپنی خیریت بتائی۔

”گل احمد یہاں رکنا خطرناک ہے۔“ انو نے کہا۔ ”یکینہ! باتم لوگ ہمارے ساتھ

چلو گے؟“

”نہیں بی بی جی۔“ احمد نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ”اب ہمارا ساتھ آپ

لوگوں کے لیے نقصان دہ ہو گا۔ ہم بکریوں کی وجہ سے نہ تو تیز رفتاری سے سفر کر سکتے ہیں

نہ چھپ سکتے ہیں آپ درمیان رہ کر سفر کریں گے تو سوپور کے گاؤں میں آپ کو ہر قسم کی

مدد ملے گی۔“

ہم نے احمد خان سے باری باری ہاتھ ملائے اور انو نے سیکینہ کو گلے لگا کر اس کے

تعاون کا شکریہ ادا کیا تھا۔ پھر ہم نے جنگل میں داخل ہونے سے قبل پلٹ کر دیکھا احمد

خان اور سیکینہ فوجیوں کی لاشوں پر جھکے دکھائی دیے یقیناً جیبوں کو صاف کر رہے تھے۔

”تم پوچھو گے نہیں جما تگیر۔“ عورت اتنا ضبط کہاں سے لاتی ہے۔ تعریف و

سائز کی عادی انو نے مجھے چپ پا کر پوچھ لیا۔ ”میں یہاں کیسے پہنچی؟“

”جو کام حسب توقع ہو اس پر حیرت نہیں ہوا کرتی نواب زادی صاحبہ۔“ میں نے خار دار شاخوں کے ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے جواب دیا۔ ”جنگل کی متوازی پٹی دیکھ کر میں نے یقین کر لیا تھا کہ تم ساتھ ساتھ چل رہی ہو، اگر جذباتی گفتگو کا ماحول ہوتا تو میں کہتا تمہاری مانوس خوشبو نے مجھے تمہارے وجود کے قرب کا یقین دلایا تھا۔ ہاں البتہ کسی وقت یہ بات ضرور پوچھتا کہ ایل ایم جی تمہارے ہاتھ میں کیسے آئی؟“

”اللہ تعالیٰ جب اپنے بندے کی دعا کو شرف قبولیت بخشے ہیں تو۔“ انو نے ایل ایم جی کا ہیرل آسمان کی جانب اٹھا کر بتایا۔ ”مردوں کو بھی مدد کرنے کی قوت عطا کر دیتے ہیں“ میں نے جنگل میں غچی اور گلی سڑی لاش دیکھی رینک میں وہ انڈین حوالدار تھا اس کے قریب ایل ایم جی ایک فل میگزین پڑی ہوئی تھی، غالباً وہ کسی درندے کا شکار ہوا تھا اگر انسان اس کا قاتل ہوتا تو آرمز اینڈ ایمونیشن بھی لے جاتا، میں تو بہت پہلے ان کو مار گراتی مگر تم کیپٹن کے شانے سے لگے چل رہے تھے، اس لیے میں نے پیچھے آنے والوں پر پہلا برسٹ مارا تم بھی میری توقع کے عین مطابق نیچے چلے گئے تھے۔ مجھے یقین تھا فائرنگ ہوتے ہی تم خود کو نیچے گرا دو گے اور مجھے ہدف مل جائے گا۔“

گل احمد دس پندرہ قدم آگے راستہ بناتا چل رہا تھا۔ قد آدم خار دار جھاڑیوں اور تیز دھار خشک گھاس کی وجہ سے سفر مشکل اور ست تھا۔

گل احمد رکنے کا اشارہ کرتا ہوا واپس آتا دکھائی دیا تو انو ایک دم درخت کے تنے کی ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ شاید اس وقفے کو غنیمت جان کر سستانے لگی۔ میں تو اس کے چاند چہرے پر ظالم گھاس کی لگائی ہوئی خراشوں سے پہلے ہی پریشان تھا لیکن ہمدردی جتا کر اس کی تھکاوٹ دور کرنے کی میں نے کوشش نہ کی تھی۔

”یہاں سے پچاس ساٹھ قدم دور شرقاً غریباً کچی سڑک ہے۔“ گل احمد بتانے لگا۔ ”میں نے ایک فوجی جیب دیکھی ہے۔ فرنٹ سیٹ پر عورت بیٹھی ہے اور فوجی وہیل کھول یا جوڑ رہا ہے۔ وہ عورت سنگی بت کی مانند اکڑی ہوئی ہے۔“

”سنو۔“ انو اچھل کر اٹھی۔ ”کیا وہ فوجی اکیلا ہے؟“

”اگر وہ کانوائے کے ساتھ نہیں ہے تو تنہا ہے۔“ گل احمد نے جواب دیا۔ ”جہاں تک دائیں بائیں سڑک دکھائی دے رہی ہے کوئی شخص دکھائی نہیں دے رہا۔“

”آؤ دیکھتے ہیں۔“ انو چل پڑی۔ ”اگر وہ تنہا ہوا تو میں اس کی مت مار دوں گی۔“ میں نے اسے منع نہیں کیا، میں سمجھ گیا تھا وہ کیا سوچ رہی ہے اگر وہ کاسیاب ہو جاتی تو ہمارے دشوار سفر کو گاڑی کی سہولت آسان بنا سکتی تھی، جہاں تک خطرے کا تعلق تھا تو ہم نے اوکھلی میں سر دینے سے قبل تمام خطروں کو ذہن سے نکال دیا تھا۔ سنگ میل سے سر منزل تک خطرہ ہی خطرہ تھا، بالفاظ دیگر ہم خطرہ پروف ہو کر منزل کی جانب چلے۔

وہ فل لیفٹیننٹ تھا۔ ہمارا درمیانی فاصلہ دس گز رہا ہو گا ہم دبے پاؤں جھاڑیوں کے اندر جا کھڑے ہوئے تھے۔ آفسر نے جیب سے گلی اسٹپنی اتاری اور کچی سڑک پر اکڑوں بیٹھ کر وہیل فٹ کرنے لگا، انو نے میرے کندھے پر دستک دی تو میں نے اس کی آنکھوں کے کشکول میں اپنی رضا مندی کا سکہ ڈال دیا۔ گل احمد کو شاید انو کی بارروائی سے اختلاف تھا لیکن وہ بھی چپ چاپ اپنی سوچ کو دانتوں تلے دبائے کھڑا رہا۔

انو نے آواز منہ سے نہیں بلکہ پاؤں سے پیدا کی اور جواب میں لیفٹیننٹ نے چونک کر گردن گھمائی۔ میں نے اس نوجوان کی آنکھوں میں وہی چمک دیکھی جو شکار کو اچانک سامنے پا کر بھیڑیے کی آنکھوں میں ابھرتی ہے۔

”صاحب جی ادھر سے چرواہوں کو گزرتے آپ نے دیکھا ہو گا، کس طرف گئے ہیں، میری بکری نے دو بچے دیے ہیں۔ میں اس کے لیے پیچھے رک گئی تھی۔“ انو باتیں کرتی لپاتی بل کھاتی بالکل قریب چلی گئی تھی۔

”ادھر۔“ لیفٹیننٹ نے جیب کے مخالف کی سمت اشارہ کیا۔ ”دس پندرہ منٹ ہوئے گزرے ہیں۔ تم ٹھہرو میں بھی ادھر ہی جا رہا ہوں گاڑی میں بیٹھ جانا تمہارے ساتھیوں کے درمیان اتار دوں گا۔ چاہو تو اپنی بکری بھی لادلو۔“

”آپ کے بڑے صاحب نے دیکھ لیا تو دونوں کی شامت آ جائے گی۔“ انو تھوڑا فاصلہ رکھ کر بیٹھ گئی۔ ”اس دن مجھے صوبیدار اپنے ساتھ لے گیا تھا خواہ مخواہ کی جھل خواری ہوئی اس نے خالی ہاتھ بڑے صاحب کی ڈانٹ سن کر بھگا دیا تھا۔“

”نکر نہ کرو میں خود بڑا صاحب ہوں۔“ آفسر نے جلدی جلدی نٹ بولٹ کتے ہوئے کہا۔ ”ویسے میرا بڑا صاحب ڈانٹ نہیں بلکہ تمہیں فرسٹ کلاس ولایتی شراب پلائے گا اور تمہارے ہاتھ بھی بھر دے گا، چلو گی میرے ساتھ!“

”وہ کون ہے بانگے صاحب۔“ انو نے بے تکلفی سے فرنٹ سیٹ کی جانب اشارہ کیا۔ ”کیسے پھیل کر بیٹھی ہوئی ہے۔ اسے پیچھے بٹھاؤ صاحب جی، آگے آپ کے ساتھ میں بیٹھوں گی۔“

جوں ہی لیفٹیننٹ کی توجہ بنی انو نے گفتگو کے بل اٹھ کر اس کی گردن پر بھرپور کٹ مارا۔ ماہرانہ انداز کارگر ثابت ہوا۔ لیفٹیننٹ ایک طرف لڑھک کر مانی بے آب کی مانند ترپنے لگا۔ اس کے فوجی بوٹوں کی رگڑ سے گرداڑنے لگی تھی، انو اچھل کر اٹھی اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھی عورت پر جا کر جھک گئی پھر اس نے گردن موڑ کر ہماری جانب دیکھا۔ جب ہم پہنچے اس وقت انو عورت کے منہ پر چپکائیپ اڑھڑچکی تھی۔

”جماگیر!“ وہ ٹائیون کی باریک ڈور کی سخت گانٹھوں کو ٹٹولتے ہوئے بولی۔ ”گاڑی میں کوئی تیز دھار چیز دیکھو ڈوری اس کے چڑے میں کھب گئی ہے۔“ گل احمد کو کیس سے بلیڈ کا نیا پیکٹ مل گیا تھا اس نے بلیڈ نکال کر انو کو دے دیا۔ انو نے کسی ماہر سرجن کے انداز میں نہایت ہی احتیاط کے ساتھ ڈوری کاٹ دی۔

”کیا تم اب کچھ بہتر محسوس کر رہی ہو؟“ انو اس کی گداز کلائیوں پر مالش کرنے لگی۔ ”ہم انسانی ناتے سے تمہارے دوست ہیں اگر بول سکتی ہو تو بتاؤ کون ہو؟“

”ایک بد قسمت لڑکی ہوں، میرا سارا خاندان مجھے بچانے کے جرم میں ختم کر دیا گیا ہے۔ آپ لوگ یقین نہیں کریں گے، مجھے رونا چاہیے مگر میری آنکھیں خشک ہیں۔ میں تو اُس وقت بھی نہیں روئی جب میرے بوڑھے باپ کو وہ سنگینوں سے مار رہے تھے، میں بہت رو چکی ہوں چند دن قبل جب میرے بھائی کی لاش آئی تھی۔“

”بہادر لڑکیاں اپنے شہیدوں پر فخر کیا کرتی ہیں۔“ انو نے کہا۔ ”اب یہ بتاؤ کہ واپس اپنے گھر جانا چاہتی ہو۔ ہم ہر خطرہ پس پشت ڈال کر تمہیں گھر پہنچا دیں گے۔“

”نہیں۔“ وہ سپاٹ آواز میں بولی۔ ”کبھی ہمارا گھر تھا اب وہ راکھ کا ڈھیر بن چکا ہے۔ اگر آپ لوگ سری نگر جا رہے ہیں تو مجھے بھی لے چلے شاید وہ مل جائے۔“

”وہ کون؟“ انو نے پوچھا اور اس کے ساتھ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ”جماگیر یونیفارم پہن لو اور جیپ ڈرائیور کرو۔ ہم تمہارے قیدی ہوں گے۔ ہاں یہ تو بتاؤ یہ اکیلا اُدھر گیا تھا؟“

”نہیں۔“ لڑکی نے جھانک کر آفسیر کی لاش دیکھی۔ ”اس کے ساتھ پوری پلٹن

تھی یہ مجھے لے کر واپس نکل آیا تھا باقی فوجی گاؤں کی مفرد عورتوں کو جنگل میں تلاش کر رہے ہیں۔“

انو نے زبان سے تو ہمیشہ بائیں رہنے اور برابری کی سطح پر معاملات طے کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر وہ عورت فطرتاً حاکم تھی ہر جگہ برتر رہنا چاہتی تھی۔ وہ وقت اور جگہ ایسی تھی کہ میں اظہار ناپسندیدگی نہیں کر سکتا تھا اس لیے اس کے احقانہ حکم کی تعمیل کرتے ہوئے جان کنی کے عذاب میں آئے ہوئے انڈین آفسیر کی یونیفارم گھسیٹ لی۔ انو کو یہ غلط فہمی تھی کہ انڈین آرڈ فورسز گھامٹر اور عقل کی سواری سے محروم ہیں لیکن ایسا نہیں تھا وہ لوگ عیاری میں بے مثل تھے اور اپنے سائے سے بھی پدکتے رہتے تھے پھر بھی میں نے انو کی تجویز قبول کر لی تھی پیدل خطرات سے لڑنے سے بہتر تھا گاڑی استعمال کر لی جاتی۔

جیپ کی سیٹ اتنی تنگ تھی کہ انو نے اس لڑکی کو دھکیل کر ڈرائیونگ سیٹ سے لگا دیا تھا، پرانے ماڈل کی گاڑی کا گیر لڑکی کی ٹانگوں کے درمیان آگیا۔

”ہماری میزبانی تنگ ہے۔“ میں نے بہت سوچ کر دراصل اپنی مشکل کو الفاظ دیے تھے۔ ”سیٹ صرف ایک سواری کے لیے ہے۔“

گل احمد ڈرائیور کرے گا۔“ انو نے حل بتایا۔ ”ہم تینوں پیچھے چلے جاتے ہیں۔“ اس کی تجویز پھر مجھے اچھی نہ لگی تھی وہ دونوں پیچھے جاسکتی تھیں۔

”تم انڈین ہو اور ہم کشمیری۔“ میرے ناگوار تذبذب کو انو نے بھانپ کر کہا۔ ”لہذا قیدیوں پر تمہیں مسلط رہنا چاہیے۔“

وہ ڈری ڈری زرد رو لڑکی خاصی خوش شکل تھی اس کے گالوں کے مرچھائے ہوئے پھول اپنائیت اور تحفظ کے احساس سے پھر تر و تازہ ہو گئے تھے۔ جس طرح انڈین صوبیدار نے میری نرم اور شفاف جلد سے میری شخصیت کا اندازہ لگالیا تھا اسی بالغ نظری سے میں نے بھی اندازہ لگالیا تھا کہ لڑکی اجدگنوار ہے نہ جنگلوں میں رہنے والی میلی میلی لڑکی ہے۔ ہاں تو اس کے بکھرے ہوئے اور گرد آلود تھے مگر لباس جدید تراش خراش کا تھا اور رنگوں کا انتخاب بتا رہا تھا کہ لڑکی لباس کے معاملے میں بازوق ہے۔

”مس.....!“

”عظمیٰ کریم۔“ اس کے ہونٹ ٹانیہ بھر کے لیے مسکرائے تھے۔

”عظمیٰ کریم آپ شہر سے گاؤں کب آئی تھیں؟“

”تقریباً دو ماہ قبل۔“ عظمیٰ نے جواب دیا۔ ”بھائی جان نے جب جمعیت میں اعلانیہ شرکت اختیار کر لی تو ابوجی کو قبل از وقت ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا تھا، ان دنوں فوراً اتر میں تھی جب ہمارے کالج کو فوجی کیمپ بنا لیا گیا۔ ہندو مسلم سب نے احتجاجی جلوس نکالا۔ بھائی جان پولیس میں انہیکٹر تھے انہوں نے یونیفارم اپنے چیف کے منہ پر ماری اور مستعفی ہو گئے۔ بس ہمارے خاندان کو نشانے پر رکھ لیا گیا۔ کبھی دہشت گردوں کی تلاش اور کبھی بھائی جان کے لیے۔ سکیورٹی والے دندناتے آتے توڑ پھوڑ کرتے۔ ایک شام ابو امی اور میں تینوں ایک شہید کی ماں سے تعزیت کرنے گئے ہوئے تھے۔ بھائی جان نے پیغام بھجوایا کہ ہمارا ایک ساتھی نصر اللہ شہید ہو گیا ہے آپ لوگ اس کی ماں کے پاس جائیں۔ ویسے بھی شہید کو خراج عقیدت پیش کرنے کی رسم اب وادی میں عام ہے، میں نے ایسے والدین بھی دیکھے ہیں جن کی خواہش ہوتی ہے لوگ ان کے شہید بیٹے کی شہادت پر مبارک باد دیں، مائیں اور بہنیں اب فخر سے لوگوں کو بتاتی ہیں کہ ان کا بیٹا اور بھائی فلاں معرکے میں شہادت کی سعادت پا گیا ہے۔ جب ہمیں بھائی جان کی ناقابل شناخت لاش ملی تو میرے امی نے فخر سے ان کی پیشانی چوم لی تھی اور ابو نے کہا میرے بیٹے تو نے یہاں اور وہاں اپنے باپ کو سرخرو کر دیا ہے، لیکن وہی ماں اور باپ اس رات بیٹی کی زندہ لاش دیکھ کر بے ہوش ہو گئے تھے۔“

”کیا تمہاری کوئی اور بھی بہن ہے؟“ انو نے سوال کیا۔

”جی تھی۔“ عظمیٰ نے دکھ سے ہونٹ کاٹ لیے۔ ”مجھ سے چھوٹی ساتویں کی اسٹوڈنٹ تھی جسے بھارتی کتے کھا گئے۔“

”ادھ تو کیا اس شام وہ گھر پر تھا؟“ انو نے پوچھا۔

”نہیں دادا جان اور ایک ملازم بھی گھر پر تھے۔“ عظمیٰ نے بتایا۔ اس کی آواز گلے میں گھسنے لگی تھی۔ ”جب رات آٹھ بجے ہم گھر میں داخل ہوئے تو دلہن پر ملازم کی لاش پڑی دکھائی دی۔ ہم دوڑتے ہوئے اندر گئے تو وہاں دل خراش منظر تھا۔ دادا جان کی خون آلود لاش نغمہ کی کتابوں پر پڑی ہوئی تھی اور پلنگ پر نغمہ کو دیکھا وہ زخمی تھی جیسے کتے اسے نوچتے رہے تھے۔ ڈاکٹر عارفہ نے روتے ہوئے رپورٹ لکھی کہ مروجہ کی موت

جنسی تشدد کے باعث واقع ہوئی ہے۔ اسی رات ابو نے نغمہ کی میت کے ساتھ شہر چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔“

”میرے خدا۔“ انو نے غم ناک آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا معصوم بچیوں کو بھی معاف نہیں کرتے۔ کل کا مؤرخ جب کشمیر کی تاریخ لکھے گا تو ان کو کس نام سے یاد کرے گا۔ ایسا ظلم تو رسوائے زمانہ گستاخوں نے بھی نہ کیا ہو گا۔“

”میڈم۔“ عظمیٰ بولی۔ ”یہ تو ایسے بھوکے درندے ہیں جن کی مثال کسی جنگی تاریخ میں نہیں ملتی۔ شاید دنیا والے یقین نہیں کریں گے مگر ہم کشمیری اس کراہت آمیز حقیقت کے گواہ ہیں کہ سکیورٹی فورسز کی ہوس کا شکار ہونے والوں میں دادیاں نانیاں بھی شامل ہیں۔“

”شاید اس لیے کہ یہ لادین ہیں کس کے خوف سے ڈریں۔“ انو نفرت سے بڑبڑائی۔ اچانک جیب نے ہچکولا لیا اور رگ گھنی تھی۔

”آگے ملٹری پوسٹ دکھائی دے رہی ہے بھائی جی۔“ درمیانی پردہ ہٹا کر گل احمد نے بتایا۔ میں نے باہر جا کر جائزہ لیا پوسٹ ایک ٹیکری کے نیچے تھی۔ تین چھوٹا دریاں تھیں درمیان میں ایک گاڑ کھڑا تھا۔ چھوٹا دریا کے ساتھ ایک ڈاج کھڑی تھی باقی کوئی فوجی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ شاید بوند باندی کی وجہ سے اندر چلے گئے تھے۔

فیصلہ کرنا میرے لیے اس لیے مشکل تھا کہ میں جس شخص کی یونیفارم میں لمبوس تھا۔ اس کے چہرے کا ماسک اس بے سروسامانی کی حالت میں نہیں پہنا جاسکتا تھا۔ اگر پوسٹ والے اس لیفٹیننٹ کو جانتے تھے تو میں اس کا نام استعمال بھی نہیں کر سکتا تھا۔

”چلتے رہو گل احمد۔“ فوراً میرے ذہن میں ایک ترکیب آگئی تھی۔ ”جب بھی کوئی روکے گھبرائے بغیر ٹوک جانا۔ تم بریگیڈیئر چوہان کے ذاتی ڈرائیور ہو، میں باقی معاملات سنبھال لوں گا۔“ دونوں چوہان کی بیٹیاں ہیں۔“

گل احمد نے مسکرا کر سر کو اثباتی جنبش دی اور میں اچھل کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

”نہیں بھائی۔“ گل احمد بولا۔ ”آپ کو پیچھے جا کر خواتین کو بھی اپنے پلان سے آگاہ کرنا چاہیے۔ وہ خوف زدہ لڑکی ہمارا منصوبہ خراب کر سکتی ہے۔“

مجھے گل احمد کی تجویز پسند آئی اور پیچھے جا کر میں نے ابو اور عظمیٰ کو ذہنی طور پر تیار کرنا شروع کر دیا تھا، لیکن ہماری جیب بخیر و خوبی اس پوسٹ سے گزر گئی۔

”میرے محسنو۔“ عظمیٰ کے اندر جو لڑکی تھی اب وہ پوری طرح باہر نکل آئی تھی۔ بڑے ہی منذب لہجے میں بولنے لگی۔ ”جتنا آپ لوگوں نے پوچھا اتنا ہی میں نے بتایا ہے لیکن اتنا ہی کچھ میرے پاس نہیں ہے۔ پھر آپ لوگوں کے بارے میں مجھے صرف ایک یقین ملا ہے کہ آپ مسلمان اور منذب لوگ ہیں۔ میں نہیں جانتی آپ کہاں سے آئے ہیں اور کہاں کس مقصد سے جا رہے ہیں۔ ساتھ ہی میرا اپنا تجربہ مجھے بتا رہا ہے کہ شاید آپ کی منزل اور مقاصد وہی ہے جو اب ہر کشمیری کی ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو میں پوچھنا چاہوں گی آپ کے سامنے کوئی ایسی محفوظ پناہ گاہ ہے جو آپ کو وادی میں دوڑتے پھرتے بھیڑیوں کی نگاہوں سے بچا سکے۔“

انوں نے متنی خیز نگاہوں سے میری جانب دیکھا اور میں نے اسے کھل کر بات کرنے کی اجازت دے دی کیونکہ مجھے وہ لڑکی گہری اور معقول محسوس ہونے لگی تھی۔ ہمیں کسی ایسی ہی مخلص اور قابلِ اعتماد ہستی کی اشد ضرورت تھی جو ہماری مدد کرتی ہمارے لیے ہماری منزل مقصود آسان بناتی کیونکہ میرا اپنا گھر بقول اباجی راکھ کا ڈھیر تھا اور میں کسی ایسے شخص سے رابطہ قائم کرنا نہیں چاہتا تھا جس سے ماضی میں کوئی تعلق رہا ہو۔ مجھے ڈر تھا کہ میری تلاش شروع ہوگی اور سکیورٹی والوں نے ایسے تمام ناتے داروں کے گرد نگراں آنکھیں بٹھا رکھی ہوں گی۔

”عظمیٰ ڈیر۔“ انوں نے اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لیتے ہوئے پیار سے بولنا شروع کیا۔ وہ علم الکلام کی ماہر عورت تھی۔ موقع محل کے مطابق بولنے کا فن جانتی تھی۔ ”بے شک ہمارا اشار ان لوگوں میں ہے جو آزادی صبح کی خاطر جان عزیز کی بھی پروا نہیں کرتے۔ ہم اس ظلم کے خلاف جہاد کرنے کا عزم لے کر بہت دور سے آئے ہیں۔ جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں ہمارے سب ہیں مگر ہم ان کے لیے اجنبی ہیں۔ اگر تم اپنائیت کی روشنی دو گی تو ہم اس روشنی میں اپنے مقاصد کے راستوں پر بے خطر چلتے رہیں گے لیکن چندا ایک بات کا مجھے دکھ ہو گا اگر ہماری وجہ سے تمہیں کوئی پریشانی یا نقصان اٹھانا پڑا تو۔“

”کیا ہم ایک دوسرے کے لیے ایسے رسک نہیں لے سکتے؟“ عظمیٰ نے پوچھا۔

”دیے آپ کی تسلی کے لیے کہہ رہی ہوں کہ وہاں اگر ہم پہنچ گئے تو مجھے کوئی پریشانی ہو گی نہ نقصان۔ کیونکہ میں آپ کو کسی محلے میں نہیں لے جانا چاہتی بلکہ ایک خواہد بنالین میں لے جاؤں گی۔ اس کی کمانڈ میرے کزن حماد الدین کے ہاتھ میں ہے۔“

میں حماد الدین کے نام پر شاید نہ چونکتا مگر ایک حماد الدین نہ صرف میرا کلاس فیلو تھا بلکہ ہم نے پولیس اکیڈمی میں بھی ایک ساتھ ٹریننگ کی تھی۔ پر مجھے اباجی کی سفارش پر سری نگر شہر کے بڑے پولیس اسٹیشن میں تعینات کیا گیا اور حماد الدین کو کپواڑہ کی ایک چوکی پر بھیج دیا گیا تھا۔ چونکہ میری بھی ٹرانسفر خفیہ ونگ میں ہو گئی تھی اس لیے پھر میں اور حماد الدین نہ مل سکے تھے۔

”عظمیٰ بہن، یہ حماد الدین وہی ہے نا جو پولیس جاسن کرنے سے قبل ایک کیس میں جیل چلا گیا تھا۔“

”جی ہاں۔“ عظمیٰ چونک کر بولی۔ ”کیا آپ اسے جانتے ہیں؟“

”ہاں اتنا ہی جتنا آپ جانتی ہوں گی۔“ میں نے مسکرا کر اثبات میں گردن ہلائی۔

مجھے وہ حماد الدین یاد آ رہا تھا جو ایک پیریڈ پہلے کالج سے نکل جاتا تھا تاکہ گرلز کالج کو جب چھٹی طے تو وہ گیٹ پر ٹھکر بھاڑنے موجود ہو۔ بڑا ہی ٹھکر لڑکا ہوا کرتا تھا لیکن یہ بات میں عظمیٰ کو نہیں بتا سکتا تھا۔

”پھر تو آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ اس نے سروس چھوڑ دی ہے۔“

”نہیں یہ بعد کی بات ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے، یہ طے ہوا کہ ہم حماد الدین کے پاس جائیں گے۔“

جب میری الیکٹرانک وائچ نے دو کا الارم دیا تو ہم سری نگر شہر کی حدود سے چند میل دور ایک گرلز ہائی اسکول کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ گل احمد کو ریٹ دینے کے لیے پیچھے بھیج دیا گیا تھا۔ میرے پہلو میں انو بیٹھی ہوئی وادی کو پر شوق نگاہوں سے دیکھتی جا رہی تھی۔ چونکہ میں ساری وادی کے تاریخ جغرافیہ سے واقف تھا۔ اس لیے قابلِ ذکر جگہوں کے بارے میں بتا دیتا تھا۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ شہر سے دور کے اسکول پر بھی سکیورٹی فورسز کا قبضہ ہو گا۔ انوں نے ران پر دستک دے کر میری توجہ اس فلیگ پر دلائی جو اسکول کی عمارت

پہلے انہوں کی قطاریں دیکھ لی تھیں۔

”سوری دیوی جی۔“ خوشی رام معذرت خواہانہ آواز میں بولا۔ ”یہ ٹہری
ایکونیشن ڈپو ہے۔“

”تو کیا ہم ایمونیشن کھا جائیں گے۔“ انو سڑک کر اس کرگئی پھر گردن موڑ کر بولی۔ ”کم آن سڑپ ادھر گاڑی لے آؤ۔“

میں نے جیب کو ٹرن دیا تو خوشی رام بدبوتا ہوا پیچھے ہٹا تھا۔
 ”صوبیدار مجرب! انو چڑھائی چڑھ کر بولی۔“ کیا تمہاری پوسٹ پر ٹیلی فون ہے؟ میں
 پیاسے کنٹیکٹ کرنا چاہتی ہوں۔“
 ”یس مس.....“

”سمترا چوہان۔“ انو نے اپنا فرضی نام بتا دیا۔
 ”سمترا دیوی۔“ خوشی رام جھک کر بے شکل پھسلوان چڑھائی چڑھنے لگا تھا۔ میں نے
 جیب فرسٹ گیئر میں ڈالی اور جیب غراتی اور گرد اڑاتی چڑھائی چڑھ گئی۔ ”ادھر اندر ٹیلی
 فون اور وائرلیس سیٹ ہے۔“

”نہیں ہم ادھر نہیں جائیں گے۔“ انوکڑے لہجے میں بولی۔ ”ہمیں بس بیٹھنے کے لیے ٹینٹ میں جگہ دے دو، صبح سے مسلسل سفر کر رہے ہیں۔“

دس ٹینٹ تین قطاروں میں ایک دوسرے سے جڑے کھڑے تھے جگہ بھی اچھی تھی ایک طرف تو خود رو چھاڑیوں کا جنگل تھا دوسری جانب برساتی ٹالا تھا اور ادھر سڑک

تھی، خیموں کی نگرانی کے لیے دو گارڈز تھے۔ دونوں ہمیں دیکھ کر سامنے آئے تھے لیکن خوشی رام نے ہاتھ کے اشارے سے ان کو واپس اپنی اپنی پوسٹ پر بھیج دیا تھا۔

میں نے جیب غیر ارادی طور پر ہی خیمے سے ٹکراتے ہوئے روکی تھی۔ شاید وجہ یہ رہی ہو کہ جہانم کے لیے انجیل کو جو ریس دی گئی تھی جیب اسی تیزی سے خیمے سے جا

نکرائی تھی۔ وجہ کچھ بھی ہو مگر ہمارے لیے وہ قدرتی وجہ بڑی سودمند بن گئی تھی۔ صوبیدار میجر خوشی رام، ہمیں دوسرے خیمے میں لے گیا تھا اس خیمے میں فولنگ چیریز، فاضل خیمے، بانس رسیاں اور چند تابوت نما بسکے پڑے تھے۔ اس سے قبل کہ خوشی رام ہمارے لیے معذرتی الفاظ استعمال کرتا انو اور عطشی نے رولڈ خیمے کھولنے شروع کر دیے۔

تھے اور ہم دونوں مرد بکسوں میں بیٹھ گئے تھے۔

”ٹھینک یو سر۔“ انو خوشی سے چکی۔ ”یہاں ہم کچھ وقت آرام کر سکتے ہیں۔“
”آپ کے لیے کیا منگوایا جائے؟“ خوشی رام انو جیسی خوش شکل عورت کو مہربان پا کر ہر مرد کی طرح احمق بن گیا تھا۔ ”کیٹینین سے سب کچھ مل سکتا ہے۔“

”ٹھینک یو۔“ انو ادا سے بولی۔ ”آپ بہت اچھے ہیں۔ کیا نام بتایا تھا ہاں صوبیدار میجر خوشی رام۔ میں پیپا سے آپ کا ذکر کروں گی، ہاں اگر سہولت کے ساتھ گرم گرم کافی یا چائے مل جائے تو کیا بات ہے لیکن ایک بات کا خال رکھیے گا، ہم آفیشل ٹریٹ منٹ پسند نہیں کرتے اس لیے ہماری آمد اور موجودگی کی خبر آپ اپنے سینئرز کو نہیں دیں گے۔“

”آپ فکر نہ کریں۔“ خوشی رام خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو ڈسٹرب کرنے کوئی نہیں آئے گا۔“

”سر؟“ میں نے بکس کو بجایا۔ ”اس میں کوئی خطرناک شے تو نہیں؟“

”ہینڈ گرنیڈز ہیں مگر محفوظ ہیں۔“ خوشی رام ہنس پڑا۔ ”ڈیو نیٹرز اس بکس میں ہیں لہذا یہ صرف لوہے کے بے جان گولے ہیں۔“

”قدرت کا اشارہ تم لوگوں کی سمجھ میں آیا؟“ خوشی رام باہر چلا گیا تو ایک منٹ بعد خاموشی کو انو نے توڑا۔ ”میرا تو ایمان ہے کہ ہمیں کسی خاص مقصد کے تحت یہاں لایا گیا ہے اب اگر ہم ہاتھوں پر ہاتھ دھرے بیٹھتے ہیں تو یہ ہماری بد قسمتی اور کم عقلی ہی ہوگی۔“
”اپنی بات کی وضاحت کرو۔“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

”گل احمد بھائی؟“ انو نے سرگوشی میں کہا۔ ”باہر جاؤ گاڑی کا دروازہ کھولو اور پھر بند کر دو لیکن دیکھنا کوئی آس پاس نگران تو نہیں۔“ گل احمد فوراً باہر نکل گیا اس کی واپسی تک انو جیسے مراقبے میں ڈوب گئی تھی۔

”ایک سنتری یہاں ہے پندرہ بیس قدم دور کھڑا ہے اور خوشی رام اسکول کی عمارت کی جانب جا رہا ہے۔“ گل احمد نے رپورٹ دی۔

”گڈ۔“ وہ اچھل کر اٹھی۔ ”سنو یہاں سے خالی جانا بزدلی ہوگی اگر اللہ نے ایک چانس دیا ہے تو ہمیں ثابت کرنا ہو گا کہ ہم اس کے بیدار اور عاقل بندے ہیں۔ تم لوگ ریگ ردو۔“ ٹینٹ میں داخل ہو گئے وہاں سے آگے، جو جو کار آمد قابل انتقال تھیاری

لے یہاں لے آنا پھر ہم کسی نہ کسی طرح جیب کا رخ بدلیں گے۔ ٹیل ساتھ لگا کہ آسانی کے ساتھ یہ بکس لوڈ کیے جاسکتے ہیں۔“

”جذبے کی حد تک پلاننگ بہت اچھی ہے اور میں تمہارا شکریہ بھی ادا کروں گا لیکن مائی ڈیر ہم اس وقت احمقوں کی جنت میں نہیں ہیں۔“
”تم اپنے حصے کا کام کرو۔“ میری بات سن کر وہ بھڑک اٹھی۔ ”باقی میں سنبھال لوں گی۔“

”جہانگیر بھائی؟“ گل احمد قدرے نرم آواز میں کہنے لگا۔ ”کامیابی اللہ کی رضا سے مشروط ہے مگر کوشش تو ہم کر سکتے ہیں۔ ٹھیک ہے بہن جی میں تیار ہوں۔ ہمیں واقعی اس سنتری موقعے کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ کیا اسلحہ اس ٹینٹ تک لانا ہے؟“
”نہیں۔“ انو کسی سخت گیر کمانڈر کے لہجے میں بولی۔ ”ساتھ والے ٹینٹ میں۔“

گل احمد اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے سانپ کے مانند رینگتا ہوا لگا ہوں سے اوجھل ہو گیا، انو نے گھور کر میری جانب دیکھا تو میں بھی زمین بوس ہو گیا تھا۔

گل احمد گھٹنوں کے بل ایک بکس میں جھکا ہوا تھا، وہ ایک دم مڑا تھا پھر مجھے دیکھ کر پڑسکون ہونے کے لیے اس نے گہری سانس لی۔ میں نے بکس کی سائیڈ میں چپکا ہوا لیبل پڑھا بکس کے اندر رگن پاؤڈر تھا۔

”آؤ آگے چلیں۔“ میں نے ٹینٹ کا پردہ اٹھایا اور گل احمد میرے دائیں پہلو سے لگ گیا دو سرا ٹینٹ بھی بکسوں سے بھرا ہوا تھا، ہم تیزی سے لیبل پڑھنے لگے زیادہ بکس مختلف قسم کے راؤنڈز کے تھے۔ ایک بکس میں ٹائم بم تھے۔ میں نے بکس پر انگلی رکھی تو گل احمد نے چشم زدن میں وہ بکس تھمیت کر دوسرے ٹینٹ میں پہنچا دیا۔

ہم نے پانچ منٹوں میں ایل ایم جی گن، اسٹین گن، جی تھری رائفل اور ٹائم بم کے بکس دوسرے ٹینٹ میں جمع کر دیے تھے اور پہلے ٹینٹ میں بیٹھی اپنی کمانڈر کو کارکردگی سے آگاہ کر دیا تھا۔

انو نے سرسراتی اور مضبوط آواز میں پلاننگ سے ہمیں آگاہ کیا۔ وہ بے حد خطرناک اقدام کا فیصلہ کر چکی تھی۔ ہم مرد تھے ہمیں اس کی پلاننگ سے کہیں زیادہ اپنی مردانگی کی سادھ کا احساس تھا اگر ہم اختلاف کرتے، اسے خطرات اور نتائج سے ڈراتے تو

وہ ہمیں بزدل سمجھ سکتی تھی۔

خوشی رام کے ساتھ ایک نوجوان تھا جو چائے لایا تھا۔ ہم نے ٹھنڈا پانی پیا اور نوجوان نے پیالیوں میں چائے سرو کی۔ خوشی رام بھی ایک بکس پر بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ جزل صاحب کا قافلہ گزر گیا ہے اور قافلے کے ساتھ اس کے تمام سینئر آفیسرز بھی چلے گئے ہیں۔ جزل کسی نئے پل کی افتتاحی تقریب میں مہمان خصوصی تھا۔

خالی برتن لے کر جب نوجوان چلا گیا تو انو نے پہلے بالوں پر ہاتھ پھیرا پھر رست وایچ دیکھ کر بولی۔

”گل کو ساتھ لے جائیں اور گاڑی کو موڑ کر سیدھی کر دیں، میرا خیال ہے آپ اچھے ڈرائیور نہیں ہیں آپ کو گاڑی ریورس میں لانا چاہیے تھی۔“

گل احمد مودب آواز میں بولا۔ ”چڑھائی کھڑی تھی اس لیے سر کو سیدھی چڑھانا پڑی تھی۔“

”اور اب اترائی ہے میں نہیں چاہتی تم ادھر کھڑے میں گاڑی کے ساتھ جا کرو۔“ انو ہنس کر بولی۔

ہم نے جیب کو بمشکل آہستہ آہستہ موڑا اور ٹینٹ سے لگا دی۔ انو یہی چاہتی تھی کہ بکس لوڈ کرنے میں آسانی ہو۔ حالانکہ مجھے ایک فی صد بھی کامیابی کا امکان دکھائی نہ دے رہا تھا۔ انوکونوں میں چھلانگ لگانے کا حکم دے رہی تھی اور ہمارے پاس تعمیل کے سوا کچھ نہ تھا۔

اندر آئے تو انو ہاتھ جھاڑ رہی تھی اور خوشی رام دکھائی نہ دے رہا تھا۔

”صوبیدار میجر کہاں گیا؟“ میں نے پوچھا۔

”ادھر سلا دیا ہے۔“ انو ٹھٹک کر بولی۔ ”بے چارہ بوڑھا بہت تھک گیا تھا۔“

”اوہ مائی گاڈ۔“ میں ماتھے پر ہاتھ مارتا ہوا بکس پر بیٹھ گیا۔

”بی بریو مسٹر جہانگیر۔“ انو دھڑک کر بولی۔ ”میں باہر جا رہی ہوں ادھر والے گاڑ

کو لاؤں گی اس کو تم نے تھپک کر سلاتا ہے۔ اوکے بی ریڈی۔“

وہ لہراتی ہوئی ٹینٹ سے نکل گئی، میں نے دیکھا عظمیٰ کے لبوں پر زندگی سے بھرپور

بڑی آسودہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ یعنی وہ نازک اندام لڑکی بھی اپنے اندر لوہے کا حوصلہ رکھتی تھی۔

”میڈم نے اجازت نہیں دی۔“ عظمیٰ نے کہا۔ ”ورنہ میں بھی آپ کا ہاتھ بٹاتی۔ مجھے بے حد خوشی ہے میں میڈم جیسی کمائڈر خاتون کے ساتھ حماد کے پاس جاؤں۔ ان سے بہتر کوئی تحفہ میں نے کبھی اسے نہیں دیا۔“

”آؤ آؤ۔“ انو نے ٹینٹ کا پردہ ہٹا کر گاڑو کو راستہ بتا دیا۔ وہ جوں ہی جھک کر اندر داخل ہوا انو نے اس کی جھکی ہوئی گردن پر ہتھیلی کاٹ مارا وہ لڑکھڑایا تو اس کی رائفل نیچے جا پڑی۔ گرنے سے قبل ہی میں نے اس کے چہرے پر نیچے سے پاؤں کی ہک لگائی وہ اوپر اٹھ کر پہلو کے بل گرنے لگا تو گل احمد نے اس کے منہ پر ہتھیلی رکھ لی تھی۔

”اسے بھی بوڑھے کے پہلو میں لگا دو۔“ انو نے رائفل کو پاؤں سے ٹھوکر لگاتے ہوئے کہا۔ ”اور جلدی سے تمام بکس لوڈ کر دو۔“

میں اور گل احمد جیسے ریموٹ کنٹرول سے چلنے والے بھالو تھے۔ انو نے ٹینٹ دیا تو ہم نے بھاری بھر کم چھوٹے بڑے بکس گاڑی پر لا دیے۔ ابھی ہاتھ جھاڑنے بھی نہ پائے تھے کہ انو نے مکئیہ آواز میں کہا۔ ”اب ان پر تریپال پھیلا دو۔“ ہم نے فوراً چار تریپالوں سے سامان ڈھانپ دیا۔

بیمیزر اٹھا کر دونوں سنتریوں نے ایڑیاں بجا کر سلوٹ دیا۔ ایک کو میں نے اور دوسرے کو ہاتھ اٹھا کر انو نے جواب دے کر نمال کر دیا تھا۔ چھوٹے ریک کے فوجی تو سرخ دوپٹے کو بھی اپنی بور اور خشک راتوں میں بہت یاد کرتے ہیں۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا وہ سپاہی حسرت بھری نگاہوں سے اس جیب کو دیکھ رہا تھا جس میں بیٹھی حسینہ نے اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔

”عظمیٰ کیا بتاتی ہے کتنا اور سفر باقی ہے؟“ میں نے اگلے مراحل کے لیے سوچنا شروع کر دیا تھا۔ جو گزر گیا تھا وہ ماضی کا اندھیرا تھا اور جو آنے والا تھا وہ بھی دھند میں چھپا ہوا تھا۔ ہمارے جیسے مسافروں کے لیے آگے پیچھے اندھیرا تھا۔ البتہ امید کی شمع ہمارے اندر روشن تھی جس کی روشنی ہمارے لیے بڑا سہارا اور سرمایہ تھی۔

”اس کی پٹالین تو وادی میں معروف جہاد ہے۔“ انو نے جواب میں بتایا۔ ”لیکن

حماد الدین بندہ ذہین اور بولد لگتا ہے۔ جانتے ہو اس نے انسانی نفسیات کو آڑ بتایا ہے۔ اس کا مرکزی ہیڈ کوارٹر ان کی ناک کے نیچے ہے۔ کون سوچ سکتا ہے کہ ٹائم بم کے اوپر کوئی بیٹھ کر دشمن کی ہلاکت کے پروگرام چاک آؤٹ کر سکتا ہے لیکن وہ تمہارا کلاس فیلو ایسا ہی ہے۔“

”کیا ہمیں بھی وہ دشمن کی ناک.....“

”نہیں۔“ انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہم ملٹری ہسپتال میں جیپ پارک کر کے خود کسی بھی اسپیشلسٹ کے وینٹنگ روم میں بیٹھ جائیں گے۔ باری آگئی تو میں اندر چل جاؤں گی، اتنی دیر میں عظمیٰ کسی نہ کسی طرح حماد سے رابطہ قائم کر لے گی۔“

”تمہارا کوئی دو پار کا کزن بھی تو یہاں ڈاکٹر ہے۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”ہاں ہے مگر میں اپنے کسی بھی کزن سے ملنا پسند نہیں کرتی۔ میں اپنی آزادی کسی کے حوالے کیوں کروں، یہاں بیٹھو وہاں اٹھو یہ نہ کرو وہ نہ کرو۔ یہ کزن قسم کے مرد خواہ خواہ حق جتانے لگتے ہیں۔“

”ایک بات تم بھول رہی ہو انیلا بیگم۔“ میں نے بازار میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ”یہاں کا ذرہ ذرہ میرا آشنا ہے، کیا فوجی یونیفارم میری صورت بدل سکتی ہے؟“

”تم جیپ کے اندر بٹھے رہنا بلکہ اسٹینڈنگ پر سر رکھ دینا دیکھنے والے یہی سمجھیں گے صاحب تھک کر سو رہا ہے۔ میں گل کو ساتھ لے جاتی مگر عظمیٰ کو بھی تمہا نہیں چھوڑا جاسکتا۔ سنو جہانگیر، میں نے عظمیٰ کی آنکھوں میں گل کے لیے وہی چمک دیکھی ہے جو میری آنکھوں میں تمہیں دیکھ کر جاگی تھی۔“

”اچھا شکون ہے اللہ کرے میری طرح گل احمق ثابت نہ ہو۔“

”ہمت تیرا ستیا ناس۔“ انو نے برا منہ بتایا۔ ”ظالم سارا نشہ ہی تم نے خراب کر دیا ہے۔“

باتوں باتوں میں جانے پہچانے محفوظ راستوں سے میں نے جیپ ہسپتال کی کمپاؤنڈ میں دوسری گاڑیوں کے درمیان جگہ دیکھ کر پارک کی۔ چونکہ مجھے اترا نہیں تھا اس لئے انو اتر کر پیچھے چلی گئی پھر پورے دو گھنٹے میں اوگھتا اور بچ بچ سوتا رہا تھا۔ انو نے دروازہ بجا کر جب مجھے بیدار کیا تو پارکنگ شیڈ کی بتیاں جل رہی تھیں۔ انو کے پیچھے دو آدمی کھڑے

تھے۔

”حماد الدین ہیڈ کوارٹر میں تمہارا منتظر ہے، میں عظمیٰ اور تم ٹٹلتے ہوئے چلیں گے۔“

ناہے فارن سفارت کاروں کا ایک ڈیلی گیٹ آیا ہوا ہے۔ ڈیلی گیٹ کو آرمی کی نگرانی میں تھمایا پھرایا جا رہا ہے اس لیے آج سڑکیں محفوظ ہیں۔“

اس شہر نے مجھے لوریاں دے دے کر پروان چڑھایا تھا۔ اسی کے آب و گل سے میرا خیر گوندھا گیا تھا۔ اس کی گلیاں، سڑکیں، پارکیں اور مائیں مجھ سے محبت کرنے والی تھیں لیکن اس شہر کی بربادی، گلیوں کی ویرانی اور ماؤں کی سسکیوں نے میرا دل اداس اور آنکھوں کو غمناک کر دیا تھا۔ میں کس قدر بد نصیب اور بے بس تھا کہ ماں جیسے مہربان گلی کوچوں میں ڈرا ڈرا چوروں کی طرح داخل ہوا تھا۔

میرے اندر منافق اور کافر آنکھوں کا خوف تھا۔ اگر ایسی کوئی آنکھ ماضی کے انپکٹر جہانگیر کو پہچان لیتی تو میری ساری محنت پر پانی پھر جاتا۔ فوراً شکاری کتوں کو میری بو پر لگا دیا جاتا اور مجھے اپنی ساری انرجی اپنے دفاع پر خرچ کرنا پڑتی جبکہ میری ترجیحات میں پہلی ترجیح اپنی بہن زبیدہ کی بازیابی تھی۔

سری نگر ہوٹل کا نیون سائن بورڈ دیکھ کر کتنی ہی خوش گوار یادوں نے میرا استقبال کیا تھا۔ یہ وہی ہوٹل تھا جس میں مجھے الوداعی پارٹی دی گئی تھی اور غیر مسلم اسٹاف نے مسلم ہوٹل کا جواز بنا کر پارٹی کا بائیکاٹ کیا تھا جسے ڈی ایس پی سلیم بٹ نے الگ الگ انتظام کر کے ختم کر دیا تھا۔ ہوٹل کا مالک میرے ابا جی کا گھرا دوست تھا اور اس نے مسلمان ساتھیوں سے بے منٹ نہیں لی تھی یعنی آدمی رقم اس نے واپس کر دی تھی۔

مجھے کوئی شک نہ تھا بلکہ یقین تھا کہ موجودہ صورت حال میں اس ہوٹل پر سیورٹی والوں کی خصوصی توجہ ہو گی، انتظامیہ اور سروس ڈپارٹمنٹ میں کئی جاسوس موجود ہوں گے، اگر انکل رحمان جانتے بھی ہوں گے تو مجبوری کی بھل میں چپ رہتے ہوں گے۔

ہاں یہ بتانا بھول گیا ہوں کہ انو نے میری فوجی وردی جیپ میں اترا دی تھی۔

ہم نے حسبِ روایت کاؤنٹر پر کوائف درج کروائے، دونوں خواتین کنارے پر کھڑی ہو گئی تھیں میں نے اپنا نام سردار نوازش علی معہ زوجہ اور سالی لکھا اور چابی لے کر ایک پورٹر کی رہنمائی میں روم نمبر ۲۰۷ میں داخل ہوئے، عظمیٰ نے پورٹر کو دروازے

سے ہی واپس کر دیا تھا جب پورٹر چلا گیا تو میں نے تالا کھولا۔ اخلاقاً مجھے خواتین کو پہلے اندر جانے کے لیے راستہ دینا چاہیے تھا مگر ذہن پریشان تھا اور ہوٹل میں کمرابک کروانے کی حماقت پر دماغ اور بھی گرم ہو گیا تھا اس لیے میں نے پاؤں کی ٹھوک سے کواڑ کھولے پھر اٹھا ہوا قدم جام ہو گیا۔ بالکل سامنے ایک شخص صوفے پر بیٹھا دکھائی دیا۔

”ویل کم مائی آئر بیل فرینڈ۔“ وہ اٹھا اور مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ خالی ہاتھ تھا اس لیے میں نے بھی اپنا ریو اور نکالنے کی کوشش نہ کی تھی۔

”گھبرانے کی ضرورت نہیں۔“ ان کی آواز سنائی دی۔ ”یہ ہمارا میزبان ہے۔“

میں نے میزبان نوجوان کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

”گھبراہٹ پس آنے کی مبارک باد قبول فرمائیے۔“ اس نے پُر جوش انداز میں ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ”میرے کمانڈر ز آپ کی آمد پر بے حد خوش ہیں۔ میں ابو منصور ہوں‘ آپ کی میزبانی اور آگے کے سفر کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے۔“ انہوں نے مجھے ہلکا سا دھکا دے کر کنارے کیا اور عظمیٰ کے ساتھ سیدھی جا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ مجھے ابو منصور نے بانہوں کے حصار میں لے کر دوسرے صوفے تک پہنچایا تھا۔

”محترم دوست۔“ میں نے پوچھا۔ ”ہوٹل میں قیام کے پیچھے کون سی مصلحت ہے؟“

”میرے کمانڈر کا نفسیاتی تجربہ کامیاب رہا ہے۔“ ابو منصور نے جواب دیا۔ ”اب یہاں چھپنے کی کوئی جگہ محفوظ نہیں رہی بالخصوص مسلمان گھرانے۔ اس لیے ہم کھلے بندوں عوامی جگہوں پر گھومتے پھرتے ہیں‘ یہاں باہر جو نگرانی کر رہے ہیں وہ سمجھ بھی نہیں سکتے کوئی مجاہد اپنی عزیز خواتین کے ساتھ ہوٹل میں آنے کا رسک لے سکتا ہے۔ متبادل انتظام تک آپ یہاں محفوظ رہیں گے۔“

عظمیٰ کو جب منزل ملی تو وہ خاتون خانہ کی طرح مسافر سے میزبان بن گئی تھی۔ ہم بھی انجانے راستوں کے ڈرے ڈرے مسافر مسافروں کے اختتام پر سہماں ہو گئے تھے‘ تھکے ٹوٹے اجسام کو جب گداز بستر، غسل کی بہترین سہولت اور لذیذ کھانے ملے تو خمار کے غبار میں ڈوبنے لگے تھے۔

رشتوں کی مناسبت سے مجھے اور انہوں کو ایک ڈبل بیڈ دیا گیا تھا۔ گل کو ساتھ والا کمرہ

ملاحظہ۔ انوکھانا کھاتے ہی کبیل اوڑھ کر نیند کی وادی میں اتر گئی تھی۔ میری آنکھوں میں اترتی نیند کی سرخ دھند دیکھ کر ہمارے دونوں میزبان کمرے سے نکل گئے تھے۔ میں نے عظمیٰ سے پوچھا تک نہ تھا کہ وہ ہمیں اپنے کزن کے پاس لے جانے کب واپس آئے گی۔ کیونکہ میں صرف سونا چاہتا تھا نیند نے جیسے سارے جذبے اور منصوبے اپنی پلیٹ میں لے کر اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا تھا۔ کانٹوں پر نیند آتی ہے یا نہیں مگر پیٹ بھرا ہوا ہو اور لینے کے لیے جگہ مل جائے تو پھر نیند زندگی کے تمام مقاصد سے اہم محسوس ہونے لگتی ہے۔ عمار تو تا وہ بیڈ بھی کانٹوں کا چھوٹا تھا۔ ایک مفروز سرکاری ملازم اور ایک باغی دشمنوں کے درمیان راحت بھری نیند لینے کا خطرہ اگر مول لے رہا تھا تو گویا وہ کانٹوں پر سو جانا چاہتا تھا۔

جوں ہی دونوں میزبان کمرے سے نکلے میں نے درمیانی دروازہ بند کیا‘ حالانکہ اس طرف گل تھا خطرے کی کوئی بات نہ تھی لیکن مجھے اس بیڈ پر لیٹنا تھا جس پر انولٹی ہوئی تھی۔ بڑا سا کبیل بھی ایک تھا‘ ہمیں ایک ہی بیڈ کے اوپر ایک ہی کبیل کے نیچے سونا تھا۔ یوں ہی بلا تامل و تکلف سو جانا ہم دونوں کو پسند نہ تھا‘ میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ گل میرے اور انہوں کے درمیان اخلاقی اور احتیاط کی حد بندی دیکھے اور ہمارا جھوٹ اس پر ظاہر ہو جائے۔ ہمیں بہر طور ہر جگہ بحیثیت میاں بیوی رہنا تھا۔

میں نے کشن اٹھا کر ایک سرحد قائم کر دی۔ انہوں نے سدھ پڑی تھی میں جب اس کے کبیل کے نیچے گیا تو انہوں کے بدن اور بالوں سے پھونتی پاگل کر دینے والی مہک نے میرا استقبال کیا تھا۔

وقت کا اندازہ نہیں کہ ہمیں کتنی دیر نیند لینے کی اجازت دی گئی تھی اور یہ بھی کہ کیوں دی گئی تھی۔ میرے کبیل کا کونا کھینچا گیا تو میری نیند ٹوٹ گئی۔ پہلے سوئے سوئے ذہن میں خیال آیا کہ انہوں ہوگی لیکن اس کا ایک ہاتھ اپنے سینے پر ٹکا محسوس کر کے سوچا گل احمد نے کسی وجہ سے جگانا ضروری سمجھا ہو گا۔ دوسرے جھٹکے پر میں نے نہیں کسی نے میرے چہرے سے کبیل الٹ دیا تھا۔ چند سیکنڈ تو میں خمار آلود نگاہوں سے اس اجنبی مردانہ چہرے کو گھورتا رہا پھر جیسے خطرے کی بھڑنے ڈنک مارا تھا۔ میں نے کبیل اچھال کر انہوں پر پھینک دیا کمرے میں چار مسلح افراد تھے چاروں نے بیڈ کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔

”اپنی وائف کو بھی جگاؤ صاحب۔“ ایک آدمی نے نرم گرز ہریلے لمبے میں کہا۔
”لیکن کیوں؟“ میں خرمناک نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ”تم کون لوگ ہو اور بلا
اجازت کیوں اندر گھس آئے ہو؟“

”یار۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”پروفیشنل ٹیچر ہو شاید، بہت سوال کرتے ہو۔ تم نے تین
سوال پوچھے ہیں میں دن بائی دن جواب دوں گا۔ ہمارے بڑے صاحب نے تمہاری دعوت
کا انتظام کیا ہے۔ ہم لوگ حکم کے غلام ہیں اور ہمیں لاک کی چابی دے دی گئی تھی اس
لیے لاک سے اجازت لے کر اندر گھس آئے ہیں۔“ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”کوئی اور
سوال ہو تو وہ بھی پوچھ لو۔“

”تمہیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے اور کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔“ میں نے کلبلائی
انو کو اشارتی تھپکی دی کہ ابھی مت اٹھنا۔ ”تمہیں نہیں بتایا گیا ہو گا کہ میری بیوی کا باپ
کون ہے؟“

”کوئی مرد ہی ہو گا۔“ اس نے جواب دیا۔

”ہاں مرد اور اعلیٰ فوجی آفیسر جو اپنی کار پر فلنگ لگانے کا حق دار ہے۔“
”ویری گڈ۔“ وہ چمک کر بولا۔ ”اس کا میزبان بھی فلنگ آفیسر ہے ہم تم خواہ مخواہ
کیوں ڈانیاگ میں وقت ضائع کریں۔ ہاں یہ بتاؤ اپنے ساتھی کو کس کام سے بھیجا ہے؟“
”وہ ہمارا کرائے کا ڈرائیور تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں ہی ہو گا ہم نے
پورے دیک کے لیے بک کیا ہوا ہے۔“

”او بھائی او بھائی۔“ دوسرا مضحکہ اڑانے والے انداز میں بول پڑا۔ ”کیوں ہمارا
مغز پھیرتا ہے بول کب واپس آئے گا؟“

”مجھے بتا کر نہیں گیا۔“ میں نے ناراض لمبے میں جواب دیا۔ ”تم میں سے کوئی اس
کا انتظار کرے جب آئے تو.....“

”تو پھر بیوی کو اٹھاؤ وہ جاگ رہی ہے۔ تم نے ٹھیک بولا ہم اسے تلاش کر لیں
گے۔“ اس سے قبل کہ میں ان کو اٹھاتا کمبل پرے کر کے چادر اوڑھتی ہوئی وہ اٹھ بیٹھی۔
اس دیکھ کر وہ چاروں ہونق سے ہو گئے تھے۔

”دیر سے میں ان سوروں کی آواز سن رہی ہوں۔“ وہ دہکتی آواز میں بولی۔ ”اے

مستر تمہارا کون سا رینک ہے؟“

”انسپکٹر سب انسپکٹر مدن گوپال۔“ اس نے بوکھلاہٹ میں رینک کے ساتھ نام بھی
بتا دیا۔

”گھٹ آؤٹ۔“ انو ہاتھ اٹھا کر دہانزی۔ ”دفع ہو جاؤ اور کم از کم ایس پی کو بھیجو
ایک جنرل کی بیٹی اور کرنل کی بیوی تم جیسے سب انسپکٹر کے ساتھ نہیں جائے گی۔ چاہو تو
باہر گاڑ کھڑا کر جانا۔“

”لیس میڈم۔“ سب انسپکٹر مدن کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ باقی تینوں
پاؤں جوڑ کر کھڑے تھے۔ ”م میں.....“

”سٹ اپ۔“ انو پھٹ پڑی۔ ”کیا بکرے جیسا بولتا ہے۔ جاؤ اور ان کو باہر کھڑا
کرو۔“

”ڈارلنگ!“ میں نے پاؤں اتار کر جوتے سیدھے کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ملازم ہے
اسے آرڈر ملا ہو گا اس بے چارے پر آپ کیوں برس رہی ہیں۔ اٹھو اپنے پیلا کو کال کرو۔
خود ان کو سنبھال لیں گے۔“

”لیس میڈم، سر کی تجویز معقول ہے۔“ سب انسپکٹر ادب سے بولا۔ ”آپ جنرل
صاحب سے بات کریں یقیناً ادھر انفارمر نے غلط اطلاع دی ہوگی۔ میں بھی اپنے ہیڈ کوارٹر
بات کرتا ہوں۔“

”وہ کتنا کون ہے؟“

”وہ..... وہ کتیا ہے میڈم۔“ مدن نے بتایا۔ ”وہی لڑکی جسے آپ مظلوم مسلمان
سمجھ کر خواہ مخواہ ایک جرم کر بیٹھے ہیں۔“

”اوہ!“ انو کے حلق سے عجیب آواز ابھری۔ ”آئی سی.....“

”وہ سیکورٹی فورسز کے لیے اجرت پر کام کرتی ہے۔“ مدن بتانے لگا۔ میرے کان
سائیں سائیں بیجنے لگے تھے اور خون کی گردش رگوں کو ٹھوکریں مارنے لگی تھی۔ ہمیں
ایک لڑکی نے کتنا بے وقوف بنایا تھا۔ ”ہم نے اسے ایک دہشت گرد کمانڈر کے لیے بطور
چارہ استعمال کیا تھا۔ آپ لوگ تو بائی چانس اس کے جال میں پھنسے ہیں۔ اس نے جو
تحریری رپورٹ ہیڈ کوارٹر کو دی ہے اس کے مطابق آپ بھی دہشت گرد ہیں۔ کیا آپ

لوگوں نے ایمونیشن ڈپو کے صوبیدار میجر اور ایک گارڈ کو قتل نہیں کیا اور وہاں سے ایمونیشن نہیں اڑایا؟“

”وہ جھوٹ بولتی ہے۔“ انو بولی۔ ”ہمیں ایک جگہ ایم پی نے روک کر کیمپ میں بٹھایا تھا ہمارا ڈرائیور اور وہ لڑکی گاڑی لے کر اوپر چلے گئے تھے لیکن ہم دوسروں کے فعل کے ذمے دار نہیں ہیں۔“

”پلیز آپ میرے ساتھ چلیں۔“ من التجائیہ انداز میں بولا۔ ”آپ کو احترام کے ساتھ لے جاؤں گا۔“

”اچھا تم لوگ باہر انتظار کرو۔“ انو اٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں پیلا سے بات کر لوں پھر چلوں گی۔“

”تھینک یو میڈم۔“ من بولا۔ ”رام کرے آپ وہ نہ ہوں۔“ اس نے ساتھیوں کو باہر چلنے کا حکم دیا اس کا مطلب یہی تھا کہ وہی ریڈ کمانڈر تھا۔

انو نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر راہداری میں دیکھا اور منہ بتاتی کھڑکی سے ہٹ آئی۔ ”ابھی تو ہم نے سرمندا کر ہاتھ بھی سر پر نہیں پھیرا تھا اور اولے برس پڑے۔ وہ باہر ہیں تم دیکھو بیک ڈور استعمال کرنے کا کتنا چانس ہے؟“

میں نے دوسرے کمرے میں جا کر دیکھا بیک ڈور نہ تھا، دو کھڑکیاں تھیں اور دونوں پر موٹی گرل چڑھی ہوئی تھی۔ ہاتھ روم میں بھی کوئی روشن دان نہ تھا۔ گل احمد یقیناً فرنٹ ڈور سے نکلا ہو گا۔ کسی کام سے گیا ہو گا ورنہ خطرہ کی صورت میں وہ ہمیں کبھی چھوڑ نہ سکتا تھا۔

واپس آیا تو عجیب منظر دیکھا انو کسی چھپکلی کی طرح دیوار سے چپٹی روشن دان کھول رہی تھی۔ آج بھی میں حیران ہوں کہ انسان میں چیونٹی اور چھپکلی جیسی خوبی کیسے تھی، انو بلاشبہ دیوار سے چپکی ہوئی تھی۔

پتھروں کی اٹھارہ انچ موٹی دیوار میں روشن دان بھی بڑے سائز کا تھا جسے دونوں دیواروں کے ساتھ لیور کے ساتھ جوڑا گیا تھا۔ پٹ اوپر اٹھا کر وہ سمنٹی ہوئی ہول میں داخل ہو گئی پھر گردن موڑ کر اس نے اشارہ کیا کہ دروازہ بہ آہستگی اندر سے بولٹ کر دیا جائے۔ میں کنڈی لگا کر پلٹا تو انو نے اپنے دونوں ٹخنوں کے ساتھ چادر باندھی اور مجھے اوپر

انے کا اشارہ کرتی ہوئی دوسری طرف اتر گئی تھی۔ اس کا آدھا دھڑ نیچے تھا آدھا دوسری طرف تھا۔

میں نے تپائی پر کرسی رکھی اور چادر پکڑ کر اوپر جا پہنچا مجھے اوپر دیکھ کر اس نے انگلیں اوپر کیوں اور میں نے چادر کھول دی۔

روشن دان کے نیچے غالباً ملازم پیشہ لوگوں کے لیے چھوٹے چھوٹے کوارٹر تھے۔ روشن دان کی بلندی سے چھت کا فاصلہ دس بارہ فٹ رہا ہو گا۔

”چادر پکڑو کم از کم آدھا فاصلہ رہ جائے گا۔“ انو نے چادر کا کونا پکڑ کر مجھے زبردستی نیچے دھکا دے دیا۔ وہ اوپر گھٹنوں کے بل جھکی مجھے چادر کے ذریعے اتار رہی تھی اور میں مرد ہونے کے ناتے ہر بار اس کا سہارا لینے پر ندامت محسوس کرتا نیچے گیا تھا۔ آدھے سے بھی کم فاصلہ رہ گیا تھا میں نے چادر چھوڑی اور سہولت سے بچوں کے بل چھت پر جا کھڑا ہوا تھا۔ اوپر دیکھا تو اوپر تول رہی تھی۔

”مجھے سنبھال کر فوراً سِلپ میں چلے جانا۔“ اس نے سرگوشی کے ساتھ چھلانگ لگا دی، میں نے پاؤں جما کر اسے ہاتھوں پر سنبھالا اور پھر ہم دونوں لڑھکتے چلے گئے تھے۔ ہوٹل کی چکاچوند فرنٹ پر تھی جس طرح فیشن زدہ عورت کا چہرہ ہی چہرہ دکھتا ہے، پچھواڑے غربت کی تاریکی تھی، ہم بغیر کسی رکاوٹ ہوٹل کی کمپاؤنڈ وال اتر کر سڑک کی اترائی میں ڈوبنے لگے تھے، انو کی ذہانت اور جرأت نے بچا لیا تھا۔

”جہانگیر!“ ویران اور سکوت میں ڈوبی سڑک پر انو بولی۔ ”میرا خیال ہے ہم کرفو کی غلاف ورزی کر رہے ہیں۔“

”اگر یہ سچ ہے تو کسی بھی وقت اندھی گولیاں یا بھونکتے کتے ہمارے قدم روک لیں گے۔“

”چلو وہاں رات کا بقیہ حصہ گزارتے ہیں۔“ انو نے ایک شکستہ کیمبن کی جانب اشارہ کیا، کیمبن سڑک کے پندرہ بیس قدم ہٹ کر چڑھائی پر تھا۔ ”ویسے بھی ہمارے مریبان ہمارے لیے پریشان ہو چکے ہوں گے۔“

پھسلواں چڑھائی تھی۔ انو تو ہاتھ پاؤں سے چوپائے کی طرح بہ آسانی چڑھ گئی تھی میرے جوتوں کے تلے گھس جانے کی وجہ سے پھسل پھسل جاتے تھے مجبوراً مجھے بھی انو کا

ہی انداز اپنانا پڑا تھا۔ کیبن نہ جانے کب سے متروک تھا اندر باہر شکستہ دیواروں کے پتھر بکھرے ہوئے تھے، البتہ اندر دیوار کے ساتھ بنا تھا نہ صرف محفوظ تھا بلکہ اس پر چھٹی ہوئی چٹائی بھی بچھی ہوئی تھی، موسم ایسا تھا کہ خشک رات بغیر کیمبل کے بسر کرنا دشوار تھی، انوکے پاس ایک چادر تھی، میں افزا تفری میں اپنا کوٹ ساتھ نہ لاسکا تھا۔

ابھی ہم ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر تھڑے کا طول و عرض ناپ رہے تھے کہ زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی، ابھی دھماکے کی بازگشت گونج رہی تھی کہ خود کار ہتھیاروں نے تراز گولیاں برسانی شروع کر دی تھیں، لگتا تھا دھماکا مجاہدوں نے کیا تھا اور فوجی اندھے کتے کی مانند بھونک رہے تھے، ہم نے سڑک پر دوڑتی فوجی گاڑیاں بھی دیکھی تھیں اور خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ ہم بروقت محفوظ آڑ میں چلے آئے تھے۔

”چلو باری باری سوئیں گے۔“ انو نے جوتے اتارتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمہارے ساتھ یہاں شیلہ کماری ہوتی تو دل اور شرعی اجازت سے تم دونوں فائدہ اٹھا لیتے، یک جا جانی کے لیے تھرا انکار نہ کرتا۔“

”دل اور تھرا۔“ میں نے ایک ایک لفظ چبا کر ادا کیا۔ ”دونوں کججانی کے لیے ترس رہے ہیں، البتہ شرعی پوزیشن درمیان میں حائل ہے۔“

”میرا خیال ہے یہ وقت ابھی ایسی گفتگو کے لیے موزوں نہیں ہے۔“ انو ایک دم سکڑتی ہوئی دور ہو گئی تو میں منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستا چلا گیا۔ ”سنو میں سونے لگی ہوں جب نیند محسوس کرو تو مجھے جگا دیتا۔“

”اگر اتنی ہمت نہ تھی تو پہلے چھیڑا ہی کیوں تھا۔“

”معاف کرنا..... پلیز مجھے معاف کر دو، دراصل میں انیلا بیگم کے اس جسم کو نہیں پہچانا چاہتی۔ میں اس آرزو کی پاسبانی کر رہی ہوں جو تمہارے لیے میرے اندر ہے کیا تم انوکے بدن کے بھوکے ہو جتنا کیر۔ اگر تمہارا جواب اثبات میں ہے تو ہاتھ بڑھا کر اس بدن سے اپنی بھوک مٹا لو اور پھر بھس بھر کر یہاں چھوڑ کر تاریکی میں گم ہو جاؤ۔“

”مت ایسی فضول باتیں کرو۔“ میں نے اسے جھڑک دیا۔ ”اب سو جاؤ۔“

”جزاک اللہ، میرے پیارے دوست۔“ انو لرزتی آواز میں بولی۔ ”انیلا کے مان اور بھرم کے پاسبان تم ہی ہو۔“

وہ ایسا منہ زور جذباتی لمحہ تھا کہ بس ہاتھ اٹھانے کا فاصلہ درمیان تھا۔ ہم دو تھے اور درمیان میں شیطان، اس لیے میں کیبن سے باہر نکل گیا تھا۔ کیبن کے سامنے میرا جانا پہچانا محلہ تھا جس میں سادات خاندانوں کی اکثریت تھی اس محلے میں میرا ایک دوست تھا جس کی ماں کو میں بھی اماں بی کہا کرتا تھا۔ سید سبط حسن اس کی بہن بتول جو دسویں جماعت کی طالبہ تھی مجھے بھی اپنے بھائی کی طرح چاہتی تھی۔ بقول اماں بی بتول انگریزی میں فرفر تھی لیکن حساب میں قہر قہر تھی۔ اس نے خود بتایا تھا کہ وہ حساب کا پیپر دیکھ کر قہر قہر کانپنے لگتی ہے، میں عموماً اسے حساب کے قاعدے سمجھایا کرتا تھا اس محلے میں فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا تھا، سبط حسن کا گھر امام باڑے کے پچھواڑے میں تھا۔ اگر انو نہ ہوتی تو میں سڑک پار کر کے گلیوں گلیوں سبط حسن کے گھر چلا جاتا۔

اس سید گھرانے کا تفصیلی تعارف میں نے اس لیے یہاں کرایا ہے کہ اس رات اس محترم خاندان پر ہالیوڈ ٹوٹ گرا تھا اور وقت نے نمک کا حق ادا کرنے مجھے ادھر ادھر سے رگید کر وہاں پہنچا دیا تھا۔

آدھا گھنٹا بھی نہ ہوا تھا میں کیبن سے نکل کر خشک اور تیز ہواؤں سے بچنے کی خاطر کوہان کی طرح ابھری چٹان سے پشت لگا کر بیٹھ گیا تھا۔ پاؤں کے نیچے جاتی سڑک پھر سنسان اور خاموش ہو گئی تھی۔ گولیوں کی آواز بھی دم توڑ چکی تھی اور میں گزرے وقت کو سوچ رہا تھا، نہ آنے والے لمحات میری سوچ میں تھے بلکہ میری سوچ کی وادی میں انو چل قدمی کر رہی تھی۔ معاً نیچے سڑک پر ایک چیخ ابھری پھر گولی کا دھماکا ہوا۔ محلے کے آخری مکانوں کے پچھواڑے لگے بلبوں کی دھندلی دھندلی روشنی سڑک پر پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا ایک عورت پہلے سڑک پر دوڑتی دکھائی دی اس کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے وہ نیم برہنہ تھی۔ اس کے تعاقب میں دو فوجی تھے جو گولیوں کے ساتھ عورت کو رک جانے کی وارننگ دے رہے تھے۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر عورت کا رخ ایک دم کیبن کی جانب ہو گیا تھا شاید وہ اپنی پوری طاقت لگا کر جنگل میں خود کو محفوظ کرنے کی نیت سے چڑھائی چڑھ رہی تھی۔ عورت اور فوجیوں کے درمیان دس پندرہ قدموں سے زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ دوسرا فوجی کمزور یا بوڑھا تھا وہ اپنے ساتھی سے بیس پیچیس قدم پیچھے تھا چڑھائی کی وجہ سے فوجیوں کے لیے ہوائی فائرنگ مشکل ہو گئی تھی کیونکہ عورت ہرنی

کی طرح چوڑیاں لگاتی چڑھ رہی تھی۔ مجھے جو کرنا تھا میں نے سوچ لیا تھا اس لیے جب عورت تجھ سے پانچ چھ فٹ دور سے گزری تو میں اپنی جگہ چپ چاپ دیکھ رہا تھا۔ وہ گزر گئی تو میں آنے والے لمحے کے لیے چوکس ہو گیا تھا۔ آنے والے فوجی کو کمانڈو کی مہارت دکھانا آسان ہی تھا چڑھائی اور دوڑنے کی وجہ سے وہ ہانپتا ہوا جوں ہی میری جھپٹ کی زد میں آیا میں نے اسے ایسے ہی جھپٹا مارا تھا جیسے بل میں بیٹھا سانپ پھد کتے مینڈک پر مارا ہے اور اسے بل میں گھسیٹ لے جاتا ہے۔ میں نے ایک ہی جھٹکے میں اس کی گردن کی ہڈی کڑکا دی تھی اور اس کے پھڑکنے سے جو آواز پیدا ہوئی تھی وہ بھی میرے حق میں سود مند ہی تھی میں دبک گیا تھا اور وہ سامنے پھڑک رہا تھا وہ اپنے ساتھی کے لیے چارابن گیا تھا۔

”اوئے پردیپ کیا ہوا تمہیں؟“

چڑھی سانسوں کے درمیان وہ ایک گھٹنا زمین پر ٹیک کر اس پر جھکا اور پھر وہ اٹھا نہیں بلکہ میری ضرب نے اسے پیچھے اچھال دیا تھا۔ اس نے سنبھلنا چاہا تھا کہ پتھر اس کی کھوپڑی پر لگا وہ بے آواز اوندھا سالیٹ گیا تھا۔ میں فارغ ہو کر اس بد کی ہوئی ہرنی کی جانب متوجہ ہوا۔ میرا خیال تھا جس رفتار سے وہ دوڑ رہی تھی اسے اوپر جنگل میں ہونا چاہیے تھا۔ میرے لیے وہ اہم نہ تھی بس یہ یقین ضروری تھا کہ وہ محفوظ ہو چکی ہے۔

”ویل ڈن میرے بہادر ساتھی۔“ کیبن کی اوٹ سے نکل کر انو بولی تو میں چلتے چلتے ٹھک کر رک گیا۔ وہ نہ جانے کب باہر آئی تھی غالباً چیخ کی آواز اس نے بھی سن لی تھی۔ ”میں اسے ساتھ لائی ہوں تاکہ یقین کر لے کہ ابھی وادی پاسانوں سے محروم نہیں ہوئی۔“ انو کے ساتھ وہی عورت تھی۔ ”اگر میں اسے روک نہ لیتی تو یہ جنگلی درندوں کا شکار ہو جاتی۔“

”اسے اندر لے جاؤ۔“ میں نے چند قدم دور رک کر کہا۔ ”مجھے دیکھنا ہے کہیں ان کتوں کے ساتھی ان کی تلاش میں نہ آجائیں۔“

”نہیں جمانگیر۔“ انو اسے چھوڑ کر میرے قریب چلی آئی۔ ”بقول اس کے ”زندگیاں خطرے میں ہیں اگر بتول کے والدین کو طبی امداد فوری نہ ملی تو وہ مرجائیں گے۔“

”بتول حسن۔“ میرا رواں رواں جیسے چیخا تھا میں نے ایک ہاتھ سے انو کو ایک طرف کیا اور دوڑتا ہوا اس کے بانقابل جاکھڑا ہوا۔ ”کیا تم سبط حسن کی بہن بتول ہو؟“ میری آواز شدت دکھ سے جھرجھرائے لگی تھی۔ ”بولو بتول مجھے پہچانو میں۔ میں.....“

”جمانگیر بھائی۔“ وہ ہلک کر میرے ساتھ آن لگی۔ ”ہاں۔ ہاں م..... میں بتول ہوں، جمانگیر بھائی۔ شاہ جی اور اماں بی شدید زخمی ہیں اور مکان کو آگ لگی ہوئی ہے، میرے شاہ جی میری اماں بی کو بچا لیجئے بھائی۔“ وہ ہلکتی آواز میں بولی۔

”مجھے بتاؤ بتول وہاں اب کتنے فوجی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جب ہمارے محلے کی تلاشی شروع ہوئی تو ہمارے گھر دیوار پھاند کر چار فوجی داخل ہوئے تھے۔ ایک کو شاہ جی نے گولی ماری دوسرے پر میں نے چھری سے حملہ کیا تھا۔ دونوں جب گرے تو باقی دونوں شاہ جی اور اماں بی پر ٹوٹ پڑے۔ میں جب بھاگی تو میں نے شاہ جی اور اماں بی کو برآمدے میں گرتے دیکھا تھا۔ دونوں مجھے پکڑنے میرے تعاقب میں آئے تھے۔“

”تم انو باجی کے ساتھ کیبن میں جاؤ۔“ میں نے اسے دلاسا دیا۔ ”میں اُدھر جاؤں گا۔ تم فکر نہ کرنا میں طبی امداد کے لیے ہاسپٹل لے جاؤں گا۔ تم جانتی ہو دونوں مجھے کتنے عزیز ہیں۔“

”مجھے..... جمانگیر بھائی مجھے بھی ساتھ لے چلے۔“ وہ ہچکیوں میں بولی۔ ”میری ان کو ضرورت ہو گی، اگر مجھے یقین ہو تا کہ میں لڑتی ہوئی شہید ہو جاؤں گی تو میں ان کو چھوڑ کر کبھی نہ فرار ہوتی، یہاں یہ کتے مجھ جیسی لڑکیوں کو زندہ پکڑ کر لے جاتے ہیں۔“

”ہمارا جانا ٹھیک نہیں بتول۔“ انو نے اسے پھر کلاوے میں بھر لیا۔ ”جس خطرے کو پیش نظر رکھ کر تم فرار ہوئی ہو وہ اب بھی محلے میں موجود ہو گا جمانگیر ان کو بچانے یا شہید ہونے کی سعادت حاصل کرے گا، آؤ ہم سب کی سلامتی کے لیے اپنے اللہ سے فریاد کریں۔“

”انو۔“ میں نے کہا۔ ”ان مرداروں کی ایک رائفل میں لے جاؤں گا ایک تم لے لو۔ اگر میں واپس نہ آیا تو بتول میری بہن ہے یہ امانت ہے اس کی حفاظت کرنا پلیز۔“

”جاؤ جمانگیر۔“ انو واپس مڑتے ہوئے بولی۔ ”ہمیں اللہ کے سپرد کر دو۔“

میں نے جی تھری رائفل اٹھا کر چپک کی اور پھر انہوں نے ”اللہ حافظ“ کہا، بتول آتین سے آنسو صاف کرنے لگی تو میں نے انہوں سے کہا کہ وہ اپنی چادر دو حصوں میں تقسیم کر لے۔ سارے راستے تمام گلیاں اور بہت سے گھر میرے جانے پہچانے تھے لیکن بارونتی گلیوں میں حسرتوں کے قافلے سوئے ہوئے تھے۔ مکان شکستہ اور دیران تھے سارا محلہ دھواں دھواں تھا۔ دھوئیں کی زہریلی دھند میں چھپتا ہوا جب میں سبھ میں سبھ کی گلی میں داخل ہوا تو دیکھا چند مرد سبھ حسن کے گھر کے سامنے کھڑے تھے، شعلے اور اوپر اٹھتا دھواں دیکھ کر میری ٹانگوں سے جان نکلنے لگی تھی۔

”آپ لوگ آگ بجھانے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟“ قریب جا کر میں نے پوچھا۔
”بجھ بھی مٹی تو کیا ہو گا۔“ ایک بوڑھا گلوگیر لمبے میں بولا۔ ”سب کچھ تباہ ہو چکا ہے۔“

”شاہ صاحب اور ان کا خاندان.....“

”آگ اندر نہیں جانے دیتی۔“ ایک شخص نے بتایا۔ ”میرا خیال ہے وہ فرار ہو چکے ہیں اگر اندر ہیں تو کونسلے کی صورت میں ہوں گے۔“

”دیکھنا تو چاہیے۔“ میں نے کہا اور اچھل کر کپاونڈ وال پر چڑھ گیا، صحن میں فوجیوں کی دو لاشیں پڑی تھیں، آگ ابھی کمرے کے دروازوں اور کھڑکیوں تک آئی تھی، میں دوڑتا ہوا اونچے برآمدے میں گیا۔ ”اماں بی!“ میں نے دیکھا اماں اس حالت میں بیٹھی تھیں کہ شاہ جی کا سر ان کی آغوش میں تھا اور اماں بی با آواز بلند قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں، انہوں نے میری آواز کا جواب ہاتھ کے اشارے سے دیا تھا۔

”اماں بی میں آپ کا بیٹا جاگیر ہوں۔“ اماں بی نے پھر فرش پر تھکی دی اور تلاوت کا سلسلہ منقطع نہ ہونے دیا۔ ”کیا شاہ جی شہید ہو چکے ہیں۔“ میں نے شاہ جی کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ میری انگلیاں خون سے تر ہو گئی تھیں، شاہ جی کی نبض خاموش تھی۔ میں نے با آواز بلند انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ ”میں آپ کو لینے آیا ہوں اماں بی، چلے میں شاہ جی کا جسدِ خاکی اٹھاتا ہوں۔“

”نہیں بچے۔“ اماں بی نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ”ان کی روح اوپر پہنچا کر ابھی

زینے واپس آئیں گے، مجھے بھی تو شاہ جی کے پاس جانا ہے۔“
”نہیں اماں بی۔“ میں نے ان کا خون میں لتھڑا ہاتھ آنکھوں اور ہونٹوں سے لگایا۔

”آپ کو سبھ حسن، بتول اور میرے لیے زندہ رہنا ہو گا۔“

”تم کہاں تھے بچے۔ تمہیں کچھ خبر نہیں، میرا سبھ حسن تو ایک ماہ ہوا جنت کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔ بتول کو بھیڑیے اٹھا لے گئے ہیں۔ شاہ جی بھی چلے گئے مجھے کس کے لیے زندہ رہنا چاہیے۔ دیکھو مجھے یہاں گولی لگی ہے۔“ اماں بی نے دایاں شانہ دکھایا ان کی چادر اور لباس خون میں ڈوبا ہوا تھا۔

”میرے لیے اماں بی..... بتول کی خاطر۔“ میں نے ان کی چادر سے ان کا شانہ باندھتے ہوئے کہا۔ ”بتول کو میں نے بھیڑیوں سے چھین لیا ہے۔ وہ میرے گھر پر محفوظ ہے۔ چلے اماں بی۔ آپ جانتی ہیں خود کشی حرام ہے۔ شانے کا زخم اتنا مسلک نہیں ہوتا۔“

”لیکن..... لیکن یہ شہید.....“ اماں بی نے احتجاج کیا۔ ”میں نہیں بچے میں ان کو آگ کے لیے نہیں چھوڑ سکتی۔“

”اہل محلہ باہر گلی میں کھڑے ہیں، ہم شاہ جی شہید کو عقیدت و احترام کے ساتھ پر خاک کریں گے لیکن پہلے آپ کے زخم کا علاج ہو گا۔ چلے اماں بی۔“ میں نے ان کو اٹھایا اماں بی احتجاج کرنے لگی تھیں لیکن میں ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر ان کو گلی میں لے گیا تھا۔ ”میرے بزرگو! حضرت شاہ جی شہید ہو گئے ہیں۔ براہِ مہربانی کچھ لوگ اندر جا کر ان کی لاش باہر لے آئیں اور کچھ بزرگ میرے ساتھ ہاسپل تک چلیں، بی بی جی شدید زخمی ہیں۔“

میرے ساتھ تین بزرگ چل پڑے تھے باقی لوگ ڈیوڑھی کے دروازے کی جانب بڑھ گئے تھے۔ میں نے لاغر اور ہلکی پھلکی اماں بی کو بچی کی طرح ہاتھوں پر اٹھایا ہوا تھا۔ ”ٹھہرو بیٹے۔“ ایک بزرگ نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”بی بی صاحبہ کے لیے میں گھر سے چارپائی لے آتا ہوں۔“ ان کا گھر کہیں قریب تھا تین منٹ بعد اماں بی کو چارپائی پر لٹا کر اوپر ان کی چادر ڈال دی گئی تھی۔

گلیوں گلیوں تک ہم نے ہاسپل کا سفر کیا۔ حسن اتفاق تھا یا کوئی دوسری وجہ رہی

تھی گشت کرتے فوجیوں نے چارپائی نہ روکی تھی۔ وہاں گئے تو آپریشن تھپیر کے ساتھ فرش اور چارپائیوں پر بہت سے زخمیوں کو کراہتے دیکھا۔ ایک نرس اور ڈاکٹر نے فوراً اماں بی کا معائنہ کیا اور چارٹ پر کچھ لکھ کر ان کی چارپائی پر ایک پرچہ رکھ دیا۔ اماں بی کو پندرہواں نمبر الاٹ ہوا تھا۔

زخمیوں کے ساتھ زیادہ تر بوڑھے اور بوڑھی عورتیں تھیں۔

اماں بی کو جب توجہ مل گئی ان کو نمبر الاٹ ہو گیا تو میرا دھیان انو اور بتول کی جانب دوڑنے لگا۔ رات بیت رہی تھی ان کو کسی محفوظ جگہ رات کے پردے میں ہی پہنچا جاسکتا تھا، دن کی روشنی نہ جانے اپنے ساتھ کیا لے کر طلوع ہوتی۔

رائفل میں نے شاہ جی کی لاش کے ساتھ چھوڑ دی تھی اس لیے بالکل نہتا ہو گیا تھا۔ چونکہ میں اس سارے علاقے سے واقف تھا اس لیے محفوظ راستوں پر چلتا ہوا کیبن تک خیریت سے پہنچ گیا تھا۔ کیبن کے اندر دونوں باتوں میں مصروف تھیں۔ وہاں سے نکلنے کی تجویز پر انو نے رائے دی کہ ہمیں بتول کے جملے ہوئے گھر میں پناہ لینی چاہیے۔ اماں بی ہاسپل میں ہیں شاہ جی شہید ہو گئے ہیں اس طرح فوجیوں کی توجہ مکان پر نہیں جائے گی۔

رائے میں وزن اور معقولیت تھی اس لیے میں نے دونوں کو ساتھ لیا اور ان ہی خاموش اداس جگہوں میں داخل ہو گیا تھا۔ جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو اہل محلہ شاہ جی کی لاش وہاں سے نکال لے گئے تھے اور آگ سب کچھ چاٹ کر بجھ چکی تھی، بتول اور انو گرم راکھ اور انگاروں سے بچ بچ کر کوئی محفوظ جگہ تلاش کرنے لگی تھیں۔

”گودام بالکل محفوظ ہے، لوہے کے دروازے کی وجہ سے آگ سر ٹکرا کر واپس آگئی ہوگی۔“ انو نے واپس آکر بتایا۔ چونکہ چابیاں سامان کے ساتھ آگ کی نذر ہو چکی تھیں اس لیے میں نے تالا توڑ دیا تھا، گودام میں خوراک کا دافرا اشاک اور متروک چارپائیوں کا انبار تھا۔ دونوں نے مل کر کارآمد چارپائیاں بچھائیں اور میں نے بوریاں ایک طرف کر دی تھیں۔

”جماگیر باہر کتوں کی لاشیں ہیں۔“ انو نے نفرت سے کہا۔ ”میں نے ایک بیڑہ رم میں بڑے بڑے انگارے دیکھے ہیں میرے ساتھ آؤ۔ لاشوں کو وہاں پھینک دیں۔“

لاشیں انگاروں کے سپرد کر کے ہم گودام میں واپس گئے تو بتول گھٹنوں پر چہرہ رکھ رو رہی تھی۔ وہ کس قدر بے بس تھی اپنے عظیم باپ کی شہادت اور میت پر کھل کر رو بھی نہ سکتی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ شاہ جی کی میت کون کہاں لے گیا تھا۔ اسے دیکھ کر سارے الفاظ میرے حلق میں پھنس گئے تھے۔

”مت رو بتول۔“ انو نے اس کے قریب بیٹھ کر کہا۔ ”میں اتنی مذہبی نہیں ہوں اپنے مذہب کے بارے میں واجبی سا علم رکھتی ہوں لیکن اتنا جانتی ہوں شہیدوں کا ماتم نہیں کیا جاتا کیونکہ وہ مرتے نہیں وہ زندہ جاوید ہو جاتے ہیں۔ پھر ابھی نہ جانے کتنے اور امتحان ہوں گے۔ دل کو مضبوط کرو اور شہیدوں کے ایک ایک قطرہ خون کا انتقام لینے کی اپنے اندر جرأت پیدا کرو۔“

”آپ کو شاید نہیں معلوم جہانگیر بھائی۔“ بتول کھانس کر بولی۔ ”ان ظالموں نے میرے بھائی آپ کے دوست سبط حسن کو بھی اذیتیں دے دے کر شہید کر دیا ہے،‘ مسخ شدہ لاش وہ گلی میں پھینک گئے تھے۔“

”میں اللہ کے مہمان، عظیم، انسان اور اپنے پیارے دوست کو خراج عقیدت پیش کر چکا ہوں مجھے اماں بی نے بتا دیا تھا۔“

”آپ بغیر اطلاع کہاں چلے گئے تھے؟“ بتول نے شکوہ کیا۔ ”شاہ جی اور اماں بی آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔ کہتے تھے ایک بیٹا زندہ ہے نہ جانے کہاں ہے۔“

”میں ظالموں کا ہاتھ کاٹنے کا فن سیکھنے گیا تھا میری بہن۔“

میں کمر سیدھی کرنے لیٹا ہی تھا کہ انو نے زبان کا بم پھینکا دھماکے سے میری ذات بھٹک سے اڑ گئی تھی کرچی کرچی بکھر گئی تھی۔ میں تڑپ کر اٹھا تھا۔

”بی ایزی جہانگیر۔“ انو سرزنش کے انداز میں بولی۔ ”جن بکریوں کا محافظ نہیں ہوتا وہ کبھی بھیڑیے کے پیٹ میں اور کبھی کہیں کھو جایا کرتی ہیں۔ ہمیں پہلے مکمل معلومات حاصل کرنا ہوں گی ہو سکتا ہے دیکھنے والی آنکھوں کو دھوکا رہا ہو۔ زبیدہ وہاں بحیثیت قیدی بند ہو سکتی ہے۔ ویسے یہ لڑکا مدھوک ہے کون؟“

”ویری سوری جہانگیر بھائی۔“ بتول انگلیاں مروڑتے ہوئے بولی۔ ”جب میں نے سنا تھا مجھے بھی حیرت اور دکھ ہوا تھا۔ ہماری زبیدہ ایسی لڑکی نہ تھی۔“

”کر میں چلوں گی۔“

”کیا آپ لیلیٰ ہیں؟“

”جی ہاں لیلیٰ آصف۔“

”مس لیلیٰ مجھے بتول کی ایک دوست زبیدہ کو بھی اطلاع دینی ہے۔ بتول نے بتایا تھا کہ آپ مدھوک صاحب کا گھر جانتی ہیں۔“

”سوری۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ ”میں نے اسے مدھوک کے ساتھ ایک شام مدھوک کی بہن کے گھر دیکھا تھا۔ ٹھہریے میں سیتا دیوی سے ٹیلی فون پر مدھوک کا ایڈریس پوچھ لیتی ہوں۔“

وہ واپس چلی گئی، دو منٹ بعد آکر اس نے ایک چٹ میری جانب بڑھائی میں نے چٹ پر لکھا ایڈریس پڑھا اور شکریہ ادا کر کے لیلیٰ کے اصرار کو نظر انداز کرتا وہاں سے نکل گیا تھا۔ میں خالی ہاتھ تھا لیکن مجھے اپنے ہاتھوں کی طاقت اور مہارت پر پورا اعتماد تھا، میں زبیدہ کی نازک گردن اور ہاتھ پاؤں ہاتھوں سے توڑ سکتا تھا۔ ڈل جھیل کی مغربی ٹیکریوں کے سلسلے کی ایک بیٹھوی ٹیکری پر ڈبا نما گھر کی کال بیل بجائی۔ پہلے کتابھونکا اور پھر کواڑوں کے پیچھے کوئی آیا تھا۔

”کون ہے.....؟“ وہ آواز..... وہ آواز سن کر میرے بدن کے ہر مسام نے پینا اگنا شروع کر دیا تھا، کواڑوں کے پیچھے مجھ سے دو فٹ کے فاصلے پر میری ماں جاگی اور ذلیل عورت زبیدہ تھی۔

دھک اور احساسِ ذلت نے مجھے لحظہ بھر کے لیے مفلوج کر دیا تھا۔ زبیدہ نے دوبارہ قدرے کرخت آواز میں پوچھا تو میں نے دانت کچکچائے لیکن ذلت کے چنے لوہے کے تھے، جڑوں کی ہڈیاں تک کڑکڑانے لگی تھیں۔

”میں۔ میں مدھوک باپو سے ملنے آیا ہوں۔“ میں نے ہچکولے کھاتی آواز میں جواب دیا۔ دوسری طرف بالکل سکوت طاری تھا۔ یقیناً زبیدہ نے میری آواز پہچان لی تھی اگر میں اس کی آواز پہچان سکتا تھا تو وہ کیسے اپنے بھائی کی آواز بھول سکتی تھی۔ ”کیا مدھوک موجود ہے۔ اس کے لیے ایک ضروری پیغام ہے۔“

میری آواز بند کواڑوں سے ٹکرا کر واپس آئی تو میں نے کواڑ پر پاؤں مارا، مجھے بہر

”یہ کب کی بات ہے؟“ میں نے سفاک آواز سے پوچھا۔ ”وہ کافر کا بچہ کہاں رہتا ہے؟“

”تقریباً ایک ماہ قبل لیلیٰ نے مجھے بتایا تھا وہ مدھوک کے بھانجے کی ٹیوٹر ہے اس نے زبیدہ کو وہاں دیکھا تھا وہ مدھوک کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھی۔“

”کیا تم لیلیٰ کا گھر جانتی ہو؟“

”ہاں وہ سکرٹریٹ کی سرکاری آفیسرز کالونی میں رہتی ہے۔“

”اس کے باپ کا نام؟“

”سردار آصف الدولہ غالباً سیکشن آفیسر ہے۔“

”اگر۔“ میں نے دکھ کا گولہ حلق سے اتار کر کہا۔ ”اگر یہ اطلاع درست ہوئی تو میں اس تنگ قوم کو اذیت ناک موت دوں گا، ایسی موت کہ کوئی دوسری زبیدہ کسی مدھوک کا ذامن تھانے سے قبل ہزار بار سوچے گی۔“

وہ دونوں سو گئی تھیں مگر میرے اندر جو آگ بتول نے بھڑکادی تھی میں تمام رات صحن میں ٹھنڈی ہوا میں ٹھلٹا رہا تھا۔

صبح ابھی لوگ ناشتے کی تیاری کر رہے تھے کہ میں سبط حسن کی ہنڈا پر کالونی جا پہنچا تھا۔ کالونی میں ہندو، سکھ اور مسلمان ملے جلے رہائش پذیر تھے، ایک گوالے نے میری مشکل حل کر دی تھی۔ قدرت کی سہانی میرے ساتھ تھی آصف صاحب صبح کی سیر پر گئے ہوئے تھے ان کی ملازمہ نے دروازہ کھول کر بتایا تھا۔ میں نے اس کے شانے کے اوپر سے چاند چہرے پر ستارہ جیسی آنکھوں کو اپنی طرف دیکھتے پایا تھا۔

”مجھے بتول نے بھیجا ہے۔ ان کے والد کو رات شہید کر دیا گیا ہے۔ میں مس لیلیٰ کے لیے بتول کا پیغام لایا ہوں۔“

”اوہ..... شاہ جی شہید ہو گئے اوہ میرے خدا۔“ وہ لڑکی ملازمہ کو ہٹاتی سامنے آ گئی تھی۔ ”خالہ آپ ڈرائنگ روم کھولیں، پلیز دوسرے دروازے پر آئیں، مجھے بے حد افسوس ہوا ہے۔“

ملازمہ نے دروازہ کھولا تو میں اندر جا کر صوفے پر بیٹھ گیا، وہ چادر درست کرتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور نقرتی آواز میں بولی۔ ”ابا جی بس آتے ہی ہوں گے اجازت لے

طور اندر جاتا تھا۔ دروازہ اندر سے بند نہ تھا یا زبیدہ نے کٹڈی اتار دی تھی، کواڑ پُر زور احتجاج کرتے ہوئے وا ہو گئے تو میں بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ صحن اتنا وسیع نہ تھا۔ انگلی پر زنانہ اور مردانہ کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ مشرقی کونے میں ہینڈ پمپ تھا جس سے قطرہ قطرہ پانی بالٹی میں ٹپک رہا تھا۔ بائیں ہاتھ پر برآمدے میں تین دروازے تھے پہلا دروازہ نیم وا تھا دوسرے کے کواڑوں میں جھری تھی وہ بھی بند نہ تھا البتہ تیسرے پر قفل پڑا ہوا تھا۔ برآمدے میں تین بید کی کرسیوں کے درمیان بید کی تپائی تھی جس پر تین چھوٹی پیالیاں، چائے دانی اور پلیٹ میں آدھا پراٹھا پڑا ہوا تھا۔ یعنی وہاں تین افراد رہتے تھے۔ مدھوک زبیدہ اور تیسرا کون تھا۔

”باہر آؤ زبیدہ۔“ میں نے برآمدے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھ کر اسے آواز دی۔

”میں تم سے صرف ایک سوال پوچھوں گا۔“

دھڑ سے درمیان والا دروازہ کھول کر ایک پُر وقار اور قد آور نوجوانوں جیسا ادھیڑ عمر شخص باہر نکل آیا، اس کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ تھی جیسے وہ کسی عزیز ہستی کا استقبال کرنے باہر آیا تھا، اس کی پیشانی پر پاکستانی ایک روپے کے سکے جتنا گول تلک بالکل تازہ تازہ دکھائی دے رہا تھا۔

”اوپر چلے آؤ جمائگیر۔“ اس کی مسکراہٹ اور بھی روشن ہو گئی تھی۔

”اوہ۔“ میری ناک سے گرم غراہٹ ابھری۔ ”تو زبیدہ نے اسے میرا نام بتا دیا

”ہے۔“

”میں دیکھ رہا ہوں خالی ہاتھ ہو۔“ وہ بالکل قریب آ کر نرم و شیریں آواز میں بولا۔

”ہماری روایت ہے ہم بیٹی اور بہن کے گھر خالی ہاتھ نہیں جایا کرتے۔“

اس کا رویہ ایسا موثر تھا کہ میرا تاؤ ٹوٹنے لگا تھا۔ ”زبیدہ کہاں ہے؟“

”یہ میرا گھر ہے زبیدہ میری بیٹی ہے لیکن جب تک تم اپنا لوجہ بھائیوں جیسا نہیں کرو گے میں نہیں بتاؤں گا وہ کہاں ہے۔ میرا خیال ہے تمہیں آرام اور پانی کی ضرورت ہے۔ میرے ساتھ آؤ اگر اندر نہیں جانا چاہتے تو برآمدے میں بیٹھ جاؤ۔ میں پانی لاتا ہوں۔“

”ٹھہرو۔“ میں نے اچھل کر ایک سیڑھی کا فاصلہ طے کیا اور اس کے گریبان کی

جانب ہاتھ بڑھایا۔ اس نے حیرت انگیز پھرتی اور مہارت کا مظاہرہ کر کے مجھے صحن میں دھکیل دیا تھا۔ میرے بڑھتے ہاتھ کو اس نے روکا اور مجھے دھکا دیا تھا۔

”کیا بے خبری نے تمہیں اندھا اور بہرا بنا دیا ہے۔“ وہ پھنکارنے لگا۔ ”میرے سفید بالوں کو دیکھا اور میری باتوں کو نہ سمجھا اور گریبان پر ہاتھ ڈال دیا تم نے۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ زبیدہ میری بیٹی ہے؟“

”وہ آپ کی بیٹی ہو سکتی ہے لیکن میری بہن نہیں۔“

”کیا تمہاری ولدیت ایک نہیں؟“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جب کوئی مرتد ہو جاتا ہے تو سارے رشتے منقطع

ہو جاتے ہیں۔“

”یقین کرو جمائگیر۔“ وہ بولا۔ ”میں کسی مرتد کو بیٹی نہیں کہہ سکتا۔ ادھر دیکھو۔“

اس نے پیشانی ہتھیلی سے صاف کر دی۔ ”اس نشان کو پہچانتے ہو، کیا کسی کافر کی پیشانی پر مجدوں کا یہ نشان ہو سکتا ہے۔“ میری آنکھیں حیرت سے پھٹ گئی تھیں۔ تلک کے نیچے واقعی وہ نشانی چھپی ہوئی تھی جو کسی عبادت گزار کی پیشانی کو ملا کرتی ہے۔ ”یہ وقت کا رنگ ہے۔“ بزرگ نے ہتھیلی پر سیندور کا دنگ دکھایا۔ ”جس طرح دشمن کی گولی سے محفوظ رہنے کے لیے سپاہی کو آڑ کے پیچھے جانا پڑتا ہے، میری بات اگر تمہاری سمجھ میں آ گئی ہے تو آؤ اندر چلتے ہیں۔“

میرے اندر کا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا، ان کی باتیں ہی ایسی تھیں۔ میں نے سینے میں مائل بہ طوفان سانسوں کو نارمل کیا اور ان کے ساتھ اندر چلا گیا۔ ایک بیڈ تھا اور ایک بستر فرش پر بچھا ہوا تھا۔ فرشی بستر کے قریب زنانہ چپل تھی ایک سیدھی اور ”سری اوندھی۔“ دیوار کے ساتھ ایک اجرک اور ایک گلابی رنگ کا دوپٹا لٹک رہا تھا۔

”بیٹھو میرے نیچے۔“ انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ بستر میری بیٹی زبیدہ کا ہے۔ پلنگ ایک ہی تھا اس نے اس پر میرے لیے بستر لگا دیا تھا۔“

”مدھوک کون ہے؟“

”اللہ کا ایک سپاہی، جہاد کا ایک کردار اور زبیدہ کی طرح میرا بیٹا۔“ وہ بتانے لگا۔

”جہاد کی طرح میں نے خود کو تلک سے چھپا رکھا ہے اسی طرح وہ مدھوک کے روپ میں

یہاں رہتا ہے۔

”لیکن اس کی بہن ہندو ہے۔“

”اس لیے کہ وہ اسے اپنا بھائی مہموک ہی سمجھتی ہے۔“

”کیا اصل مہموک.....“

”ہاں جتانگیر بیٹے اصل مہموک اور اس کا باپ صحن میں دفن ہیں۔“

”اوہ میرے رب۔“ یقین نے میری آنکھیں نمناک کر دی تھیں۔ ”مجھے کیا بتایا گیا

تھا لیکن ظاہر کے پیچھے کیا ہے۔ اچھا ہوا زبیدہ فوراً میرے سامنے نہیں آئی۔ ورنہ آپ بیٹی

سے اور میں اپنی بہن سے محروم ہو چکا ہوتا۔ اسے بلائیے اٹکل۔“

”جلد بازی اچھی نہیں ہوتی جتانگیر۔“ انہوں نے دیوار پر ہاتھ مارا تو فرشی بستر اوپر

اٹھنے لگا میں آنکھیں پھاڑے جادو کے کھیل کو دیکھ رہا تھا پھر بستر ایک طرف اچھال کر زبیدہ

گول ہول سے اچھل کر اوپر آئی۔ میں نے لپک کر اسے بانہوں میں لے لیا تھا۔ میں نے

چہرہ اس کے کھلے بالوں میں چھپا لیا تھا۔ وہ روتی رہی اور میں اسے کے بالوں کو بھگوتا رہا

تھا۔

جب اندر کا دکھ آنسوؤں میں بہ گیا تو میں نے دیکھا بیڑہ خالی تھا۔ وہ مہربان فحش

ہمیں چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا تھا۔

”بھائی جان!“ زبیدہ سرخ ناک مسل کر پھر بلک کر بولی۔ ”ہمارے اباجی اور اماں

دونوں.....“

”مجھے سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔“ میں نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہہ

”شاید تمہیں معلوم نہ ہو اباجی آزاد کشمیر پہنچ چکے ہیں۔“

”آپ کو کس نے بتایا؟“

”میں ان سے مل کر آ رہا ہوں۔“

”آپ پاکستان گئے تھے؟“ زبیدہ نے سوالیہ نگاہوں سے پوچھا تب میں نے اسے ٹپا

کماری کو حذف کر کے ساری روداد سنا دی۔ اسی دوران زبیدہ کا منہ بولا باپ پانی اور

چائے رکھ گیا تھا۔ زبیدہ نے کوئی تبصرہ کیا نہ کوئی سوال پوچھا تھا۔ وہ بالکل خاموش رہی

تھی۔

”ہاں، اب کچھ باتیں ہو جائیں۔“ میرا میزبان بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

”زبیدہ کیا تم نے بھائی کو اپنے بارے میں بتا دیا ہے؟“

”نہیں اباجی۔“ زبیدہ نگاہیں جھکا کر ادب سے بولی۔ ”صرف ان کی باتیں سنی

ہیں۔ ہمارے اباجی بخیرت آزاد کشمیر پہنچ گئے ہیں، جتانگیر بھائی میری تلاش میں آئے

ہیں۔“

”تم نے کیا فیصلہ کیا؟“ اس نے بدستور نرم مگر سنجیدہ آواز میں پوچھا۔ ”بھائی کے

ساتھ جانا چاہتی ہو؟“

”جانے کی ابھی کوئی بات نہیں ہوگی اباجی۔“ زبیدہ نے جواب دیا۔ ”آپ میرے

مربی اور محسن ہیں اور بھائی بھی مجھے عزیز ہیں آپ دونوں جو فیصلہ کریں گے وہی بہتر ہو

گا۔“

”میرا خیال ہے ہمیں پوری چویشن جتانگیر کے سامنے رکھ کر فیصلے کا حق اسے دے

دینا چاہیے۔ میں تم بہن بھائی کے درمیان اپنے کسی فیصلے کی دیوار نہیں حاصل کرنا چاہتا۔

جتانگیر احمد! میرا اصل نام غلام علی نون ہے۔ پیدائشی کشمیری ہوں مگر زندگی کا بڑا حصہ

سیاحت اور بزنس میں گزار چکا ہوں۔ موجودہ حالات کے پیش نظر میں آگرہ سے یہاں اپنا

آبائی مکان اور چند دکانیں فروخت کرنے دو ماہ قبل آیا تھا۔ یہاں آکر پتا چلا دکانوں پر فوج

قابل ہے اور مکان کریک ڈاؤن کے دوران جلا دیا گیا ہے۔ دکھ اور نفرت نے مجھے توڑ دیا

تھا، اپنی قوم کی مظلومیت اور بھارتی فوج کی سفاکیت دیکھ کر میں نے سوچا غلام علی بہت

گھوم پھر لیا تم بہت کما چکے ہو زندگی کے سارے رنگ اور ذائقے حاصل کر لیے ہیں۔

ایک رنگ اور ذائقہ دوسروں کے لیے جینے کا بھی ہوتا ہے، بس یہ سوچا اور کسی مردِ کامل

کی تلاش شروع کر دی جس کی انگلی پکڑ کر میں اللہ کے راستے پر لگ جاتا۔ ایک شام میں

ہوٹل کی بالکونی میں کھڑا برف باری کا منظر دیکھ رہا تھا کہ میں نے ایک نوجوان کو دیکھا وہ

گلی سے لڑکھڑاتا ہوا نمودار ہوا تھا، اس کے قدموں کے نشانات سرخ ہوتے جا رہے تھے،

میں نے اسے آواز دی اور کہا کہ بیک ڈور کی طرف آؤ۔ وہ بمشکل دروازے تک پہنچا تھا

پھر میں نے اسے اٹھالیا اور اپنے کمرے میں لے گیا۔ وہ مجاہدین کی ایک فعال جماعت

البرق کا ڈپٹی کمانڈر سرفراز تھا جس نے ایک فوجی کیمپ پر دستی بم پھینکے تھے اور جوابی

”آپ کی کہانی میں زبیدہ کب داخل ہوئی انکل؟“

اپنی کہانی زبیدہ اپنی زبان سے سنائے گی تمہیں۔“

”میں اس دن پشپا، مریم اور نرگس کے ساتھ ایڈ مشن فارم لینے گئی تھی۔“ زبیدہ نے اپنی داستان کا آغاز کیا۔ ”ہمیں پرنسپل نے مشورہ دیا تھا کہ جنوں کے حالات قدرے پرسکون ہیں۔ ہمارا ایک سال ضائع ہو چکا تھا کالج میں فوجی کیمپ قائم تھا لہذا ہم جنوں میں ایڈ مشن لینا چاہتی تھیں۔ واپسی پر ہمیں بس سے اتار لیا گیا پھر کچھ مسلمانوں نے احتجاج کیا اور ہمیں دوسری بس میں بٹھا دیا گیا۔ جب ہم بس اسٹاپ پر اتریں تو دیکھا ایک کیپٹن جیپ میں وہاں موجود تھا۔ ہم پہلے پشپا کے گھر گئے وہاں سے پشپا کے پتانے اپنی کار میں مجھے مریم اور نرگس کو اپنے اپنے گھر ڈراپ کیا، فوجی جیپ مسلسل تعاقب میں رہی تھی لیکن وہ لوگ نزدیک نہ آئے تھے پھر اسی شام وہی کیپٹن چند فوجیوں کے ساتھ ہمارے گھر میں داخل ہوا۔ اس وقت میں ڈرائنگ روم میں تھی میں نے اسے دیکھا وہ اباجی کو دھکے دے رہا تھا تب میں بیک ڈور سے نکل کر بھاگنے لگی، تقریباً چالیس پچاس قدم پیچھے فوجی ہوائی فائرنگ کر رہے تھے۔ ایک گلی سے میں گزر رہی تھی کہ کسی مرد نے بالائی منزل کی کھڑکی سے چیخ کر کہا۔ ”اندر آ جاؤ۔“ میں بھاگتے بھاگتے تھک چکی تھی بلا ارادہ میں دروازہ کھول کر اندر چلی گئی تھی، اندر چھ مجاہدین تھے۔ جب فوجی آگے نکل گئے تو مجھے نہ خانے میں لے جایا گیا۔ وہاں تین لڑکیاں لیٹی ہوئی تھیں نینوں زخمی تھیں، وہاں سے سرفراز مجھے یہاں لے آیا تب سے میں یہاں ہوں اور مجھے گھر کی چار دیواری باپ کی شفقت اور ایک محافظ کی پناہ مل گئی ہے۔

”ٹھیک ہے جان برادر۔“ میں نے کہا۔ ”اگر تم خود کو یہاں محفوظ اور خوش سمجھتی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں بلکہ اچھا ہے میں تمہاری طرف سے مطمئن ہو کر اپنا فرض ادا کروں گا۔“

”اگر کوئی مجبوری نہ ہو تو یہاں رہو۔“ غلام علی بولے۔ ”ہماری طاقت میں اضافے کا باعث بنو، یہاں ہمیں موجودہ حیثیت میں ہائی آفیشلز نے تسلیم کر لیا ہے۔ مدھوک کا بڑا بھائی اشوک بی ایس ایف کا ڈپٹی ڈائریکٹر ہے۔ اس نے مدھوک کو سول ڈیفنس میں گریڈ سترہ پر لگوا دیا ہے۔ وہ دن کو سروس کرتا ہے اور رات کے وقت ہم قومی

کارروائی کے نتیجے میں زخمی ہو گیا تھا، بی ایس ایف کے درجنوں کتے خون کے نشان پر چلے جب ہوٹل تک پہنچے تو میں سرفراز کو اٹھا کر شدید برفانی طوفان میں ہوٹل سے نکل گیا تھا ہمیں محفوظ ٹھکانے کی تلاش تھی۔ اچانک میری یاد میں ایک شخص سیٹھ منی رام ابھرا۔ رام پور میں اس کی فرم دیوالیا ہو گئی تھی اور وہاں کی جائیداد اونے پونے میں فروخت کر کے کشمیر بھاگ آیا تھا۔ اس کے بقیہ مفادات کی حفاظت میرے ذمے تھی اسی سلسلے میں منی رام سے خط و کتابت رہی تھی۔ ”غلام علی نون سانس لینے کے لیے رکا تھا۔“ جب میں گرتا پڑتا منی کے گھر پہنچا تو سرفراز نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ میں نے دوستی اور انسانیت کے نام پر اس سے درخواست کی کہ وہ کسی مسلمان ڈاکٹر کو بلائے اور زخمی کو لباس اور حرارت کے لیے کچھ پہننے کے لیے دے۔“

”پرنکھوں کا کہنا ہے مورکھ متر سے دور رہو۔“ منی میری بات کے جواب میں بولا۔ ”پھر ناگ کسی کا متر نہیں ہوتا۔ میں تمہاری رکشاکر سکتا ہوں کہ منش ہی منش کے درد کا دارو ہوتا ہے پرنو اس ناگ کی سمائتا نہیں کروں گا“ وجہ تم جاننے ہو اگر میں نے ایسا کیا اور پکڑ لیا گیا تو یہ زمین بھی میرے پاؤں کے نیچے سے کھینچ لی جائے گی۔ اس دہشت گرد کو فوج کے حوالے کرنے کی آگیا دو گے تو تمہیں.....“ معاً دھکا ہوا جب میری بند ہو جانے والی آنکھیں کھلیں تو منی میرے پاؤں میں پڑا تڑپ رہا تھا اور سرفراز کے ہاتھ میں پکڑے ریو اور سے دھواں نکل رہا تھا۔ ابھی ہم لاش کو ٹھکانے بھی نہ لگا سکے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی، میں نے جھریوں سے دیکھا باہر منی کا چھوٹا بیٹا مدھوک کھڑا تھا میں نے سرفراز کو بتایا کہ مقتول کا بیٹا ہے۔ سرفراز لڑکھڑاتا ہوا خود گیا اور جب مدھوک اندر آیا تو سرفراز نے اس کی کھوپڑی میں بھی گولی اتار دی تھی۔ میں نے گٹر کا ڈمکن اٹھایا اور دونوں لاشیں گٹر کے حوالے کر دی تھیں۔ چونکہ ہمیں اس محفوظ پناہ کی ضرورت تھی اس لیے سرفراز نے میرے ذریعے میک اپ کا سامان منگوایا اور رات جب ہم سوئے تو میں منی رام اور سرفراز مدھوک کا روپ دھار چکا تھا۔“

”کیا آپ میک اپ میں ہیں؟“ میں نے بغور ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں شروع میں عارضی تھا لیکن اب ہم نے ایک ماہر سرجن سے مستقل نوعیت کا میک اپ کروا لیا ہے۔“

خبر تھا، آزادی کی نعمت کا منکر تھا۔ نہیں، ایسی کوئی بات نہ تھی بلکہ ظلم و جبر نے میری سوچ خاصی بدل ڈالی تھی۔ دوسری وجہ شاید یہ بھی رہی تھی کہ میری واپسی کے تمام راستے بند تھے اگر مجھے یقین ہوتا کہ قتل راج اور میری سابقہ بیوی شیلہ کماری مجھے فراموش کر چکے ہوں گے تو شاید زبیدہ کی بازیابی کے بعد اندر کا خود غرض نوجوان پولیس آفیسر بیدار ہو جاتا اور میں اپنے ہیڈ کوارٹر کو جوائنٹنگ رپورٹ دے دیتا۔

یہ فیصلہ بھی اس صورت میں کرتا اگر انیلا جہاں بیگم المعروف انو میرے ساتھ ادھر نہ آئی ہوتی ان دو مجبوریوں کی زنجیروں نے مجھے جکڑا ہوا تھا۔ میرے سامنے دو راستے تھے ایک خود کو ڈپارٹمنٹ کے سامنے کھڑا کر دوں اور دوسرا آزادی کی جنگ لڑنے والوں کی صف میں شامل ہو جاؤں۔

پہلے راستے کا اختتام قید تنہائی یا ذلت آمیز موت تھا۔ ڈپارٹمنٹ اگر میری سابقہ خدمات اور ایڈوانس کورس کو مد نظر رکھ کر معاف کر بھی دیتا تو بدنام زمانہ ایجنسی ”را“ کا بد مزاج اور زخم خوردہ قتل راج اور ناگن جیسی خطرناک اور زہریلی شیلہ کماری مجھے سکون کا سانس لینے کی کبھی مہلت نہ دیتے۔ ایک ہی راستہ تھا۔ جہاد کا راستہ جس پر آنے والی موت بھی قابلِ فخر تھی لہذا میں نے دوسرے راستے پر چلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ذلت کی زندگی سے شہادتِ لاکھ درجے بہتر تھی۔

غلام علی نون نے مجھے رضا مند پاتے ہی ٹیلی فون سیٹ بیڈ پر منگوایا اور نمبر ڈائل کیا۔ ”ہاں بیٹے ایک ضروری کام ہے سرکاری گاڑی خود ڈرائیور کرتے گھر آؤ۔ نہیں نہیں“ نرملہ بالکل خیریت سے ہے جموں سے اس کا بھائی پردیپ آیا ہے۔ اس کے ساتھ نرملہ اور مجھے ایک جگہ جانا ہے۔ ہاں سرکاری گاڑی پر، جلدی چل پڑو۔“

”گڈ۔“ زبیدہ کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ ”سرفراز سرکاری گاڑی میں ہوں گے تو کسی کو شک نہیں ہو گا، سول ڈیفنس والے عموماً متاثرہ گھروں کا دورہ کرتے ہیں، ہم بھابی اور بتول کو نکال لائیں گے۔“

پندرہ منٹ بعد ہارن کی آواز پر زبیدہ نے جا کر دروازہ کھولا۔ اس کے ساتھ سول ڈیفنس کی یونیفارم اور اشارے سجائے اندر آنے والے نوجوان کو دیکھ کر دل خوش ہو گیا تھا۔ دونوں کو شاید یہ شان چلتے دیکھ کر میں نے اسی لمحے فیصلہ کر لیا تھا زبیدہ کو سرفراز سے

سروس کرنے نکل جاتے ہیں۔ البرق کی مقامی فورس میں کشمیر کی بیٹیاں بھی ہیں، زبیدہ سوسائٹی میں مسز ہوک ہے۔ اشوک کی بیوی ایک سوشل ورکر ہے اس کے ساتھ زبیدہ بھی باہر جاتی ہے اور ہمارے راستے صاف کرتی ہے، زبیدہ کو تنظیم میں ماسٹر کی کہا جاتا ہے، کیونکہ مسز ہوک کے روپ میں ہر گھر اور ادارے کا دروازہ اس پر فوراً کھل جاتا ہے، معلومات سرفراز تک پہنچاتی ہے اور سرفراز معلومات کی روشنی میں کامیاب پلاننگ کرتا ہے۔“

”پلیز جانا گھر بھائی۔“ زبیدہ ٹھنک کر بولی۔ ”آپ میری بھابی اور بتول کو یہاں لے آئیں۔“

”تین اجنبی افراد کا اضافہ اہل محلہ کو مشکوک بھی کر سکتا ہے۔“

”نہیں۔“ غلام علی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کیا انڈیا سے یہاں کے رہنے والوں کے عزیز اقارب نہیں آتے رہتے، ہم کہہ دیں گے جموں سے نرملہ کے بھائی نہیں آئی ہیں، شاید اس کی ضرورت نہ پڑے یہاں اب نفسا نفسی کا رواج ہے۔ ہندو مسلمان سب خائف ہیں اور دبکے رہتے ہیں پھر آئے دن کریک ڈاؤن اور کرفیو، کسی کو کسی کا ہوش نہیں ہے۔“

”لیکن اس متاثرہ گھر سے ان کو نکالنا بھی ایک مسئلہ ہے۔“ میں نے گویا رضا مندی دیتے ہوئے ایک رکاوٹ کی جانب اشارہ کیا تھا ”وہ مسلمانوں کی آبادی ہے اس لیے اس پر نگران آنکھوں کا پہرا ہو گا۔“

”تم رضامند ہو جاؤ تو باقی انتظام میں کر لوں گا۔“

میں جس خاص مقصد کے لیے انڈیا سے طویل راستوں پر چلتا کشمیر میں داخل ہوا تھا وہ حسن اتفاق سے بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے حاصل ہو گیا تھا، جیسے منزل نے خود آگے بڑھ کر مسافر کا استقبال کیا تھا۔ سفر اور مقصد کی روح ایک جیسی ہوتی ہے، سفر کو منزل مل جائے تو مسافر پاؤں پیار کر بیٹھ جاتا ہے اور طالب مقصد جب مطلوبہ ہدف پورا کر لیتا ہے تو جوش و جذبے کے غباروں سے ہوا نکل جاتی ہے۔ کشمیری ہونے کے باوجود، ماں جیسی پیاری ہستی گنوانے کے بعد بھی میرے اندر وہ شوقِ جہاد پیدا نہ ہوا تھا جس کے تحت سرفروشی سعادت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے لیکن یہ بھی نہیں کہ میں اپنی قوم کے درد سے بالکل بے

بہتر شریک حیات نہیں مل سکتا۔

”السلام علیکم جمائیکر بھائی۔“ اندر آتے ہی سرفراز نے بانئیں پھیلائیں۔ ”زہبی آپ کی جتنی تعریفیں کیا کرتی تھی آپ بالکل ویسے ہی ہیں۔“ سرفراز نے تین بار گلے ملنے کی رسم پوری کر کے چھوڑا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”کب ڈیوٹی جوائن کی ہے، زہبی کے بارے میں کیسے پتا چلا آپ کو؟ ہم نے تو اسے پیپی میں محفوظ رکھا ہوا ہے۔“

”آپ کے سوالات کے جواب میں۔“ زہبیدہ بول پڑی۔ ”صرف اتنا بتائے دیتی ہوں بھائی جان نے ڈیوٹی جوائن نہیں کی اور نہ ہی کریں گے۔“

”اوہ..... شکریہ جمائیکر بھائی۔ جی اباجی آپ فرمائیں کہاں جانا ہے؟“

غلام علی نے اسے مختصراً حالات، خاندان کی مصیبت اور بتول کے بارے میں بتایا۔ ”آپ نہ جائیں میں اور زہبی ان کو لے آئیں گے۔“

”نہیں سرفراز۔“ میں نے کہا۔ ”تمہاری بھابی بھی عام خاتونِ خانہ نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق ”را“ سے رہا ہے۔ وہ تربیت یافتہ کمانڈو ہے وہ کسی اجنبی پر بھروسہ نہیں کرے گی۔“

”آپ تو ایک ساتھ بہت سی خوشیاں لائے ہیں۔“ سرفراز بولا۔ ”میرے گروپ کے لیڈرز ونگ میں بھابی ایک نئی روح پھونک دیں گی۔ ہمارے پاس اس وقت کالج گریڈ میں تاحجرہ کار مگر جذباتی لڑکیاں موجود ہیں۔ بھابی ان کو عسکری تربیت دیں گی۔“

”بیٹے۔“ غلام علی ہنس پڑے۔ ”اس کی عدم موجودگی میں اتنے بڑے بڑے فیصلے نہ کرو، جاؤ پہلے اسے لے آؤ پھر ہم اس سلسلے میں باقاعدہ میٹنگ کریں گے۔“

جیب کے آگے محکمے کا مونو گرام نصب تھا اس لیے سڑکوں پر گشت کرتے فوجیوں نے روکا نہ تھا۔ ایک بازار سے جب گزرنے تو آتے لوگوں نے ہاتھ اٹھا کر سرفراز کو سلام کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ سرفراز وہاں کی جانی پہچانی شخصیت تھی۔ زہبیدہ اس کے ساتھ سیکنڈ سیٹ پر تھی اور میں بچھلی نشست پر دبکا رہا تھا۔

صدیوں پرانے محلے کی اونچی نیچی گلیاں تنگ ہونے کی وجہ سے سرفراز نے جیب محلے کے بازار میں کھڑی کی تھی۔ ہڑتال کی وجہ سے بازار بند تھا البتہ کرفو جزوی طور پر اٹھا لیا گیا تھا اس لیے اکا دکا راہ گیر دکھائی دے رہے تھے سرکاری گاڑی دیکھ کر لوگ

کتراتے نکل جاتے تھے۔

گلی سنان تھی میں نے اندر جا کر آواز دی تو انو نے دروازہ کھول دیا۔ میں کچھ کچھ مزاج شناس تھا اس کی آنکھوں میں غصے کا غبار دیکھ کر میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اپنے پیچھے اشارہ کیا، سرفراز اور زہبیدہ برآمدے میں رک گئے تھے۔

”زہبیدہ آگے آؤ۔“ میں نے انو کی زبان مقفل رکھنے کی خاطر زہبیدہ کو آواز دے دی۔

”یہ تمہاری بھابی انو ہیں۔“ زہبیدہ لپک کر دروازے تک گئی تو انو نے اسے کلاوے میں لے لیا۔ ”باقی باتیں ادھر چل کر، ہمیں یہاں سے فوراً روانہ ہونا ہے۔“

ان کے پاس اٹھانے اور تیاری کے لیے کیا تھا۔ دوسرے منٹ ہم گلیوں سے ہوتے بازار میں اتر گئے تھے۔ ایک بند دکان کے برآمدے میں دو آرپی والے کھڑے تھے ان کو ڈراپ کرنے والی ڈاج رپورس میں بازار سے بڑی سڑک کی جانب آرہی تھی۔ ایک سپاہی جو ریک میں ٹائیک تھا ہماری جانب بڑھنے لگا تو سرفراز ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے بیٹھتے رک گیا تھا۔

”صاحب ادھر سے نکل جائیں ہمارا بڑا صاحب ادھر انسپکشن کرنے والا ہے ہم کو آرڈر ملا ہے محلے سے کوئی باہر نہ جائے۔“

”ہم اپنے گھر جا رہے ہیں۔“ سرفراز ناخوش گوار لہجے میں بولا۔ ”ادھر فیملی کے ساتھ مہمان تھے۔“

”ہم آرڈر کی بات کرتا ہے۔“ ٹائیک نے جواب دیا۔ ”آپ کو روکتا نہیں آپ بھی بڑے صاحب ہیں۔“

”نکل چلو کیوں وقت ضائع کر رہے ہو؟“ میں نے انگریزی میں کہا تو سرفراز آرام سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اس نے گاڑی کو اشارت کرنا چاہا مگر انجن ہچکیاں لے کر رک گیا۔

”اے حوالدار۔“ تیسری ناکام کوشش پر سرفراز نے ٹائیک کو اشارہ کیا۔ ”اپنے ساتھی کو بھی لے آؤ گاڑی اشارت نہیں ہو رہی۔“ چونکہ آگے چڑھائی تھی اس لیے رپورس گیر میں ڈال کر سرفراز نے فوجیوں سے دھکا لگوایا گاڑی اترائی میں جاتے ہی

اشارت ہو گئی تھی۔ گیسٹر بدل کر ابھی وہ اسٹیرنگ ٹرن کے لئے تھما ہی رہا تھا کہ ایک جیپ نے راستہ روک لیا۔ ڈرائیور کے ساتھ صوبیدار رینک کا سکھ بیٹھا ہوا تھا۔ راستہ بلاک تھا جیپ کے پیچھے ایک ڈاج ٹرک تھا جس سے مسلح سپاہی کودنے لگے تھے۔

”سرا“ سکھ صوبیدار قریب آکر بولا۔ ”آپ کو کرل صاحب سلام بولتے ہیں۔“
”گھبرانا نہیں۔“ سرفراز ہینڈ بریک لگاتے ہوئے زیر لب بولا اور اتر کر صوبیدار کے ساتھ جیپ کی جانب چل پڑا۔

”کچی آنکھیں مرناسی کو کہتے ہیں۔“ انو بولی۔ ”اتنی آسانی کے ساتھ چوہے بھی نہیں مرنے۔“ جیپ سے ایک طویل قامت اور قوی الجبہ کرل مسکراتا ہوا اترتا تھا اس نے سرفراز سے پرجوش انداز میں ہاتھ ملایا اور باتیں ہاتھ سے شانے پر تھکیاں دی تھیں۔
”کرل اشوک۔“ زبیدہ نے بتایا۔ ”مدھوک کا بڑا بھائی ہے۔“

وہ باتیں کرتے قریب آنے لگے تو میرے اندر خطرے کا الارم بجنے لگا لیکن ہم مقابلے اور دفاع کی پوزیشن میں نہ تھے۔ ہماری حالت ان مسافروں جیسی تھی جن کی کشتی بھنور میں پھنس گئی ہو اور پتوار پانی میں گر چکے ہوں۔ ایسی حالت میں دعا اور غیبی مدد کی آس کے علاوہ مسافروں کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا۔

”پر دپ!“ قریب آکر سرفراز جھانک کر بولا۔ ”گڈ مارنگ سر۔“ زبیدہ نے ہاتھ جوڑ کر سلام انگریزی میں اسے دیا۔ ”یہ میرے بڑے بھائی کرل اشوک ہیں۔“ میں نے آگے جھک کر ”گڈ مارنگ سر۔“ کہہ کر ہاتھ ملایا۔ ”یہ شری متی کوشل نرملامیری بھالی اور وہ جو شرمارہی ہے نرملاکا چھوٹی بہن بلادیوی ہے بی ایس سی کی اسٹوڈنٹ۔“

”ویل کم ٹو سری نگر۔“ کرل ران پر بید مارنے لگا۔ ”مجھے خوشی ہوئی آپ لوگ مدھوک سے اتنی محبت کرتے ہیں۔ مدھوک اگر دس منٹ رک جاؤ تو میں تمہارے ساتھ گھر چلوں گا بہت دن ہوئے پتا جی سے ملے۔“

”میں ان کو گھر ڈراپ کر کے آفس جاؤں گا۔“ سرفراز نے جواب دیا۔ ”آپ فارغ ہو کر تشریف لے آئیے گا بلکہ میری خواہش ہے رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔“

”نہیں پیارے۔“ کرل بولا۔ ”ایسا کریں گے چھٹی والے دن تم سب میرے گھر

چلے آنا۔“
اس نے بید سے ہم سب کو بائی بائی کیا اور صوبیدار کے ساتھ چڑھائی چڑھنے لگا۔
”دیکھیں نے بہ آواز بلند اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا تھا جس نے اپنے فضل و کرم سے آئی بلا ٹال دی تھی۔“

”مجھے تمہارے وجود سے بے غیرتی کی بو آنے لگی ہے۔“ انو نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”کیا تم نے زبیدہ کے انتخاب کو تسلیم کر لیا ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”کچھ دیر کے لیے زبان اور ناک بند کر لو۔“
”بھالی!“ زبیدہ پلٹ کر بولی۔ ”آپ بے حد پیاری ہیں، میں نے جاناگیر بھائی کے لیے ایسی ہی لڑکی کے خواب دیکھے تھے۔“

”شکریہ میری پیاری۔“ انو سپاٹ اور سٹاپ ٹاٹر لہجے میں بولی۔ ”مجھے بھی تمہارا انتخاب پسند آیا ہے۔ غالباً تمہارے بھائی نے بھی ایسے ہی شخص کے خواب دیکھے ہوں گے۔“

اس کی باتوں کی کات صرف میں نے محسوس کی تھی۔ کتنی نفرت تھی اس کی آواز۔ میں نے اس کا زہریلا انداز اس لیے برداشت کیا تھا کہ وہ بے خبر تھی جب میں خود بے خبری کے عالم میں مدھوک کے گھر گیا تھا تو زبیدہ کے لیے میرا رواں رواں نفرت اگل رہا تھا۔ ایسے شخص کو بے غیرت کہنے میں وہ حق بجانب تھی جو اس کے نزدیک بہن کے ہندو خاوند کو نہ صرف تسلیم کر چکا تھا بلکہ سب کو اس کے گھر لے جا رہا تھا۔

”جاناگیر بھالی!“ سرفراز عقب نما آئینے میں دیکھ کر مسکراتا ہوا بولا۔ ”میری خوبصورت بھالی کی خوبصورت غلط فہمی دور کر دیں۔ زبیدہ میرے پاس مقدس امانت ہے۔“

”یہ عورتیں ہمیشہ غلط فہمیوں کا شکار ہوتی رہتی ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”شاید یہ غلط فہمی کے پانی میں ہی خوش رہتی ہوں گی۔“
”تو کیا.....“

”ہاں بھالی۔“ زبیدہ شرماہی بولی۔ ”سرفراز ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“
”انو! میں نے کہا تھا ناں کہ فی الحال اپنی زبان اور ناک بند رکھو۔“

”سوری آل آف یو۔“ انو بولی۔ ”لیکن ہمیں اطلاع ہی ایسی ملی تھی۔“
 ”اطلاع دینے والے نے جو دیکھی وہی بتایا۔“ سرفراز نے ہنس کر کہا۔ ”اسی لیے
 دانا کہہ گئے ہیں جو کچھ آنکھیں دیکھتی ہیں ضروری نہیں کہ وہی کچھ وہاں ہو۔“
 باتوں باتوں میں سفر ختم ہو گیا۔ سرفراز گاڑی پارک کرنے کے لیے جگہ دیکھ رہا تھا
 کہ زبیدہ نے انو اور بتول کو لیا اور اندر چلی گئی تھیں۔

”سرفراز!“ لڑکیوں کے جاتے ہی میں بول پڑا۔ ”یہ کرئل اشوک مجھے پکا غیث
 دکھائی دیا ہے۔ تم نے اس کی آنکھوں میں ناچتی چمک نہیں دیکھی ہو گی۔ وہ ہوس ناک
 نگاہوں سے بتول کو دیکھ رہا تھا۔ یہ لڑکی سید زادی ہے اور میری پناہ میں ہے۔“
 کس کس آنکھ میں رقص کرتی شیطانیت دیکھوں۔“ سرفراز درد بھرے انداز میں
 بولا۔ ”میرے دوست کشمیری مسلمانوں کے لیے ہر فوجی کی آنکھ میں شیطان رہتا ہے، ہو
 سکتا ہے اتنی مروت ہو اس میں کہ مدھوک کے عزیزوں پر ہاتھ نہ ڈالے۔“

”کوئی اور محفوظ ٹھکانا نہیں تمہارے پاس؟“
 ”ٹھکانے بہت ہی جھانگیر۔“ اس نے انجن بند کیا اور گمری سانس لے کر سیٹ سے
 اتر گیا۔ ”لیکن وہاں میرے ساتھی رہتے ہیں۔ ہاں ایک جگہ ایسی ہے جہاں وین گرڈ
 رکھا گیا ہے لیکن دن کے وقت وہاں تک بتول جیسی لڑکی کے ساتھ جانا گویا بھیڑیوں کو پیچھے
 لگانے کے مترادف ہو گا“ دن خیریت سے گزر جائے تو ہم تینوں کو ادھر پہنچا دیں گے۔“
 ”سنو سرفراز!“ میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے روک دیا۔ مدھوک
 کے پڑوسیوں سے تم لوگوں کے تعلقات کیسے ہیں؟“
 ”وہ کیوں؟“

”اکاموڈیشن پر اہم میرے دوست۔“ میں نے کہا۔ ”تم کہہ سکتے ہو کمرے سرد ہو
 رہے ہیں ایک رات کے لیے مہمانوں کو.....“
 ”گڈ.....“ سرفراز سر ہلانے لگا۔ ”اچھا آئیڈیا ہے، اندر چل کر زبیدہ سے بات
 کرتے ہیں وہی ادھر ادھر جاتی ہے۔“
 زبیدہ مہمانوں کو اپنے بیڈ روم میں لے گئی تھی۔ غلام علی نون دعا سلام سے فارغ
 ہو کر واپس جا رہے تھے۔ سرفراز کو دیکھ کر رک گئے اور بولے۔

”اب کھانا کھا کر جانا بیٹے۔“

”ایک مسئلہ ہے۔“ سرفراز نے کہا۔ ”کرئل اشوک سے ملاقات ہو گئی تھی، ہمیں
 اس سے خطرہ محسوس ہو رہا ہے، سید زادی کو بچانا ضروری ہے۔“
 ”یہ تو واقعی بری خبر ہے۔“ غلام علی کے چہرے پر پریشانی ابھر آئی تھی۔ ”ان
 سوروں سے کچھ بعید نہیں، پھر کیا کریں۔“

”ماسٹر بھگت رام کی پتی سے بات کر دیکھیں زبیدہ سے اس کی بیٹی ملتی رہتی ہے
 زبیدہ کمرے مرمت کروانے کا بہانہ جا کر کمرے بس رات تک۔“
 ”کیا اس نے آنے کی بات کی ہے؟“
 ”جی ہاں وہ تو ابھی ساتھ آ رہا تھا۔“ سرفراز نے بتایا۔ ”لیکن میں نے اسے رات
 کے کھانے کی دعوت دی ہے۔“

”چلو سوچتے ہیں۔“ غلام علی سوچتے ہوئے چل پڑے۔ ”فوری خطرے کی بات
 نہیں ہے، رات تک کوئی نہ کوئی ٹھکانا تلاش کر لیا جائے گا۔“
 میں اور سرفراز تیسرے کمرے میں جا بیٹھے وہ کمرہ غالباً سابقہ ہندو خاندان کی
 عبادت کا کمرہ تھا جیسے ضرورتاً برقرار رکھا گیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پتھر اور دھات کی
 مورتیاں قطار میں کھڑی تھیں، بڑے بت کے گلے میں موتیاں کا ہار پڑا ہوا تھا اور تھالی میں
 لوبان سلگانے کا انتظام تھا۔ کمرہ لوبان کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

ہم دونوں چٹائی پر بیٹھ گئے تھے، سرفراز نے کچھ مورتیوں سے متعلق کہا تھا لیکن
 میرا دھیان بتول اور کرئل اشوک کے درمیان کھڑا تھا۔ بتول مجھے ماضی اور حال کے کئی
 حوالوں سے بے حد عزیز تھی، میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اس کے بال کی طرف میلی آنکھ
 سے دیکھے وہ میری پناہ میں تھی اس کی حفاظت میرا فرض تھا۔

میں نے سرفراز کے استفسار پر اسے اپنی آپ بیتی سنا دی کیونکہ مجھے کوئی نہ کوئی ایسا
 دوست چاہیے تھا جس پر مکمل بھروسہ کیا جاسکے اور اس کے شانے سے شانہ ملایا جاسکے۔
 گو میں سرفراز کی عادات سے ناواقف تھا لیکن اس کی ظاہری آن بان نے مجھے متاثر کیا
 تھا۔

”شیلہ کماری کا نعم البدل تو بے مثال ہے۔“ سرفراز نے تکلفی سے

عورت بڑی فتنم مزاج قرار دی گئی ہے بالخصوص دل اور خاوند کے معاملے میں بڑی حساس اور خطرناک ہوتی ہے۔ اگر وہ مظفر آباد تک آسکتی ہے تو اسے یہاں آنے سے کون روکے گا۔

”اچھا ہے آجائے بولڈ اور کھری عورت ہے ایسے دشمن سے دو دو ہاتھ کھیلنے میں برا مزہ آتا ہے۔“

”کہیں دل کے کسی گوشے میں وہ ابھی موجود تو نہیں؟“ سرفراز نے جھک کر پوچھا۔

”جھوٹ نہیں بولوں گا سرفراز۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس عورت کو کھو کر مجھے خوشی نہیں ہوئی پھر وہ میری پہلی محبت ہے۔“

”اس کا مطلب ہے آپ بھائی کو دھوکا دے رہے ہیں؟“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں نے اسے بھی یہی جواب دیا تھا۔“

کال ٹیل بجی تو ساتھ میرا دل بھی بجنے لگا تھا۔ چھٹی جس بند کمرے کی قیدی ملی کی طرح دل کی دیواریں نوچنے لگی تھی۔ ”سنو سرفراز اگر کرل ہوا تو اسے ادھر ہی لے آئے۔“

سرفراز دروازے تک گیا اور پھر رک گیا۔ ”بزرگ محترم دروازہ کھولنے جارہے ہیں۔“

کرل نے جھک کر چرن چھونے کا بس اشارہ کیا تھا۔ ویسے میں حیران تھا کرل ایک تجربہ کار اور تربیت یافتہ شخص تھا وہ کیسے اجنبیوں کو باپ اور بھائی سمجھ رہا تھا۔ کیا سرفراز اور غلام علی نون دونوں ہی کرل سے بھی بڑھ کر اداکاری میں پرفیکٹ تھے ’تد‘ آواز، چال اور کتنی حرکات و سکنات ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں، دو باتیں تھیں کرل ملی چوہے کے کھیل سے لطف اندوز ہو رہا تھا اسے کسی خاص وقت کا انتظار تھا! سرفراز اور غلام علی بے داغ اداکاری کر رہے تھے۔ جو شک مجھے تھا وہی غلام علی کے اندر بھی تھا یہی وجہ تھی کہ وہ کرل کو اپنے بیڈ روم میں لے جانے کی بجائے سیدھا ہمارے پاس لے آیا تھا اور فوراً وہاں سے واپس چلا گیا تھا۔ وجہ یہی رہی ہوگی کہ کم سے کم کرل کی نگاہوں میں رہنا چاہتا ہو گا۔

”سوری مدھو ڈیر۔“ کرل اندر آتے ہی معذرتی انداز میں بولا۔ ”میں ڈنر تمہارے ساتھ نہ کر سکوں گا، شاید اس وقت بھی نہ آتا لیکن آنا پڑا، تمہیں شاید معلوم نہ ہو کہ کل رات میرے چار جوان مار دیے گئے ہیں۔ دو لاشیں محلے سے تھوڑی دور پڑی مل گئی ہیں لیکن دو لاشوں کا کوئی سراغ نہیں مل رہا جب کہ ہمارے سورسز بتاتے ہیں کہ چاروں کو سجاد شاہ کی حویلی میں داخل ہوتے دیکھا گیا تھا۔ میں اسی سلسلے میں ادھر گیا تو مجھے بتایا گیا کہ تم وہاں سے سجاد شاہ کی بیٹی ساتھ لائے ہو۔“ کرل اشوک سرفراز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بول رہا تھا۔ ”ازاٹ ٹرو مائی برادر؟“

”اگر میرا جواب ہواٹ از ٹرو تو؟“ سرفراز مضبوط آواز میں بولا۔ ”سنئے بھائی اگر وہ لڑکی مال غنیمت ہے تو میں اسے پہلے حاصل کر چکا ہوں اگر وہ مظلوم ہے تو اب وہ کرل اشوک کے بھائی مدھوک کی پناہ میں ہے۔“

”وہ نہ تو مال غنیمت ہے اور نہ ہی مظلوم ہے مدھو۔“ کرل اشوک بھی اچھا کھلاڑی تھا، ضرورت کے مطابق بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کا فن جانتا تھا۔ ”بلکہ وہ قاتل ہے وہ بی ایس ایف کی مجرمہ ہے۔ ہاں اگر جرم اس سے سرزد نہیں ہوا ہم جرم ثابت نہ کر سکے تو میرا وعدہ ہے اسے دوبارہ تمہارے حوالے کر دیا جائے گا۔“

”دوبارہ!“ سرفراز نے قہقہہ لگایا۔ ”کس لیے مزہم پٹی کے لیے یا لاش دیکھنے کے لیے، اشوک بھائی یہاں کوئی غیر نہیں اس لیے آپ کو بتا رہا ہوں دادی کے کشمیری اور باضمیر غیر ملکی عوام بی ایس ایف اور دیگر آرم فورسز کو خونخوار بھیریوں کا غول کہتے ہیں۔ کیا سجاد شاہ کی بیٹی سالم سلامت وہاں سے نکلے گی؟“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ کرل پہلی بار تلخی سے بولا۔

”مجھے جو کہنا تھا کہ چکا ہوں۔“ سرفراز نے بے پروائی اور ناراض سی آواز میں جواب دیا۔ ”اس پر دونوں صورتوں میں میرا حق ہے اور میں اپنے حق سے دستبردار نہیں ہوں گا۔“

”مانڈ یو مدھوک!“ کرل کرخت لہجے میں بولا۔ ”تم جانتے ہو تم کیا اور کس کے ساتھ بک رہے ہو؟“

”جی ہاں۔“ سرفراز کمال حوصلے کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ ”سچ بول رہا ہوں اور اس

آفسر کے ساتھ جس کے کان بچ سننے کی صلاحیت سے محروم کر دیے گئے ہیں۔“

”سٹ اپ یو فوٹس مین۔“ کرنل کے حلق سے دھاڑا بھری اور بید والا ہاتھ اوپر اٹھا تو میں بلا ارادہ تڑپ کر درمیان میں چلا گیا تھا بید تڑاخ سے میرے دائیں شانے پر لگا تھا۔ ”کرنل سر۔“ عقب سے ان کی آواز ابھری تو کرنل نے ایک دم گردن گھمائی۔ ”ان کو چھوڑیے۔ مجھ سے معاملہ طے کیجئے۔ یہ دونوں جذباتی نوجوان ہیں ایک لمبچہ لڑکی کا دفاع کر رہے ہیں۔“

”تھینک یو مسز پروپ۔“ کرنل پلٹ کر بولا۔ ”میرے بھائی کو سمجھاؤ۔ میرا راستہ نہ روکے۔“

”آپ کے ساتھ کتنی فورس ہے سر؟“

”فورس!“ کرنل ہنس پڑا۔ ”میں اپنے گھر آیا ہوں بس ایک ڈرائیور اور ایک سینئر جے سی او ہے کیوں؟“

”آپ میرے ساتھ چلیں سر۔“ انو نے کہا۔ ”میں دیکھتی ہوں کون احقر آپ کا راستہ روکے گا؟“

کرنل نے طنزیہ اور کامران نگاہوں سے سرفراز کی جانب دیکھا اور پھر دبی آواز میں بولا۔

”بی ایزی مائی ڈیئر تمہیں ابھی میری ضرورت ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں تمہیں ڈائریکٹر کی کرسی مل جائے اور وہاں جانے سے قبل میں پتہ جی سے متعلق تم سے بات کروں گا۔“

اگر انو آنکھ سے اشارہ نہ کرتی تو میں قدم بڑھاتے سرفراز کا ہاتھ تھام کر اسے چپ رہنے کا اشارہ نہ کرتا۔ چونکہ مجھے ان کی صلاحیتوں پر بھروسہ تھا اس لیے میں نے کرنل کا راستہ نہ روکا تھا۔

”یہ بھابی کیا کرنا چاہتی ہے؟“ سرفراز سرسراہٹ آواز میں بولا۔

”وہ جو ہم کر گزرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔“

”اوہ۔ نہیں۔“ سرفراز چونک کر بولا۔ ”اس کی مدد کرو“ اسے روکو۔ وہ نہیں جانتی کرنل جوڈو کرائے کا ماسٹر ہے۔“

”انو بھی بلیک بیلٹ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”شاید وہ کوئی دوسرا حربہ آزمانا چاہ رہی ہوگی۔“

”سرفراز بھائی!“ ایک منٹ بعد انو نے آکر دہکتی آواز سے کہا۔ ”آپ باہر جائیں اور جے سی او کو اندر لے آئیں کسے گا کرنل صاحب بلا رہے ہیں۔“

”ٹھہرو انو۔“ میں نے لپک کر واپس جاتی انو کا راستہ روک لیا۔ ”کیا..... کیا تم نے.....“

ابھی میرا پراجیکٹ نامکمل ہے۔“ اس نے غراتی آواز میں جواب دیا۔ ”میں کوئی شے نامکمل حالت میں بتانے اور دکھانے کی عادی نہیں ہوں۔“

سرفراز چکراتا ہوا سوچتا ہوا باہر گیا اور صوبیدار کو ساتھ لے آیا تھا۔

”صاحب!“ انو بولی۔ ”کرنل صاحب ادھر ہیں۔“ اس نے ایک طرف ہٹ کر مارچ کرتے سکھ صوبیدار کو اندر جانے کا راستہ دیا اور خود بھی اس کی پشت پر گلی اندر چلی گئی تھی، میں اور سرفراز برآمدے میں کھڑے دونوں کو اندر داخل ہوتے دیکھ رہے تھے، انو کا ہاتھ اٹھا اور ہم نے صوبیدار کو اچھل کر منہ کے بل گرتے دیکھا تو ابھی وہ ماہی بے آب کی مانند پھڑک رہا تھا کہ زبیدہ نمودار ہوئی اور اسے گھسیٹ لے گئی۔ ”ادمانی گاڈ۔“ سرفراز آنکھیں موند کر بڑبڑایا، اسی وقت انو نے پلٹ کر ہماری جانب دیکھا۔ میں اس کی آنکھوں میں اترتی درندگی دیکھ کر لرز سا گیا تھا۔

”ڈرائیور کو بھی.....“ انو کے حلق سے پھنکارا ابھری۔

ڈرائیور بڑے مودب انداز میں سرفراز کے ساتھ ساتھ چلتا جب برآمدے میں آیا تو میں نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا اور رسمی خیریت پوچھی۔

”بھئی تمہارے کرنل صاحب اپنے ماتحتوں سے بڑی محبت کرتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اندر چلے جاؤ کچھ کھاپی لو۔“

”مم..... میں باہر ہی ٹھیک ہوں سر!“ ٹائیک ڈرائیور بولا۔ ”مجھے باہر.....“

”ارے بھائی نہیں۔“ سرفراز نے اس کی پشت پر تھپکی دی۔ ”تمہیں کرنل صاحب نے اندر بلایا ہے، ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا۔ چلو شاباش۔“

ڈرائیور سکڑتا ہوا جوں ہی دروازے میں داخل ہوا دوسرے قدم پر میں نے انو

کے ہاتھ کا پھن چکنا دیکھا، ڈرائیور کی گردن کو ڈس کر پیچھے ہٹ گیا تو ڈرائیور کئے ہوئے درخت کی مانند پہلو کے بل گرا تھا۔ انو دایاں ہاتھ دبا تی اور جھکتی ہوئی باہر نکل آئی اس کی خوب صورت آنکھوں کا سرخی نے ستیاناس مار دیا تھا۔ اس کا چہرہ بھی جیسے بدل گیا تھا یا میری نگاہوں کو دھوکا ہوا تھا۔

”تم میں سے کوئی ایک۔“ وہ سپاٹ اور سرد آواز میں بولی۔ ”تینوں لاشیں ٹھکانے لگانے ابھی جائے گا، صوبیدار یا ٹائیک کی یونیفارم پہن لو۔“

”خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں بھابی۔“ سرفراز مودبانہ لہجے میں بولا۔ ”کڑیں پہلے بھی لاشیں گل سڑ رہی ہیں۔“

”نہیں۔“ انو نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”سرکاری گاڑی کو بھی ٹھکانے لگانا ضروری ہے۔“

”خالی گاڑی اتنی خطرناک نہیں ہو گی انو.....“ میں نے گویا سرفراز کی تجویز کی تائید کر دی تھی۔ ”لیکن لاشوں کے ساتھ پکڑا جانا خطرناک ہو گا۔“

”اوکے میجسٹریٹ از اتھارٹی۔“ انو بتدریج نارمل ہوتی جا رہی تھی۔ ”اگر تم دونوں کی یہی رائے ہے تو جلدی سے لاشوں کو گٹر کے حوالے کرو اور گاڑی یہاں سے دور چھوڑ آؤ۔“

واقعیت کے لحاظ سے ہم دونوں برابر تھے۔ ہم وادی کے چپے چپے سے واقف تھے اگر انو ہی خود کسی ایک کو نامزد کر دیتی تو بہتر ہوتا وہ ہماری صوابدید پر معاملہ چھوڑ کر اندر چلی گئی تھی۔ آواز سے پتا چلا کہ بغلی دروازے سے لڑکیاں غلام علی نون والے کمرے میں منتقل ہو چکی ہیں۔ غالباً زبیدہ اور بتول کو انو نے لاشوں سے دور رکھنے کی خاطر منتقل کا فیصلہ صادر کیا ہو گا۔ سرفراز کچھ بتائے بغیر باہر نکل گیا تھا پھر میں نے گاڑی اشارت ہونے کی آواز سنی، دروازے میں جا کر دیکھا سرفراز کرمل کی جیب ریورس میں لے جا رہا تھا۔

جس طرح اس نے خود بخود گاڑی ہٹانے کی ڈسے داری قبول کر لی تھی اسی طرح مجھ پر لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا فرض آن پڑا تھا، زبیدہ نے مجھے گٹر دکھایا، ہک میں ہاتھ ڈال کر جوں ہی میں نے وزنی ڈسکن اٹھایا تو بدبو کا طمانچہ لگا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا تھا زبیدہ دوڑ کر اندر گئی اور چادر لے آئی میں نے چادر سے ناک اور منہ اچھی طرح

دھانپ لیا تھا۔ لاش لانے کے لیے ایک قدم ہی اٹھایا تھا کہ انو کو دیکھا وہ چادر میں لپٹی لاش کندھے پر اٹھائے آ رہی تھی، وہ باری باری چادر میں لپیٹ کر تینوں لاشیں لائی تھیں میں اور زبیدہ لاش گٹر میں لڑھکا کر چادر اسے واپس کر دیتے تھے۔

”ویل ڈان اینلا جہاں نیگم۔“ ڈسکن فٹ کر کے میں ہاتھ چادر سے صاف کر کے بولا۔ ”تم نے ایک سید زادی کی حرمت اور زندگی کے لیے جو کچھ کیا ہے اس کا اجر یقیناً تمہیں دنیا اور آخرت میں ملے گا۔“

”اندر جاؤ وہ رو رہی ہے اسے سارا دو۔“ انو نے چادر زبیدہ کی جانب اچھال دی۔ ”ویسے خطرہ ابھی ملا نہیں۔ ہمیں ایک اور معرکے کے لیے خود کو تیار کرنا ہو گا۔ کرمل کے ماتحت جانتے ہوں گے کہ ان کا کرمل اپنے گھر گیا تھا۔ تلاشی اور انکوائری ادھر کا رخ ضرور کرے گی۔“

”زبیدہ ایک بات تو بتاؤ۔“ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے کے دوران میں نے پوچھا۔ ”کیا کرمل اشوک انکل غلام علی سے پہلی بار آج ملا تھا؟“

”جی ہاں۔“ زبیدہ نے جواب دیا تو میرے شک کی تصدیق ہو گئی۔ ”جب ہم نے اس گھر پر قبضہ کیا تھا تو ان دونوں کرمل پونچھ سکیڑ میں تھا۔“

”تو پھر موت ہی اسے یہاں لائی تھی۔“ میں نے ان کو بتایا۔ ”کرمل نے پہچان لیا تھا کہ اس کے پتا کے روپ میں کوئی اور ہے، محض بتول کو حاصل کرنے کی خاطر اس نے یہ معاملہ کمرے وقت تک اٹھا رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اگر وہ بتول کی بات نہ کرتا تو یقیناً انکل کو پہچانتے ہی گرفتار کر لیتا اس صورت میں بھی ہمیں وہی کچھ کرنا پڑتا۔“

”ہاں مجھے بھی شک گزرا تھا۔“ دروازے میں کھڑے انکل غلام علی بولے۔ ”پہلی نظر میں ہی اسے میں نے چوکنٹے دیکھا تھا۔ یہی وجہ رہی تھی کہ میں اسے اس کمرے میں لے گیا تھا۔“ انکل نے ہمارے لیے راستہ چھوڑا پھر ہمارے پیچھے پیچھے اندر آئے۔ ”میں نے کئی بار سرفراز سے ذکر کیا تھا کہ میں اچھا اداکار نہیں ہوں پھر میرا قد لمبا ہے، وہ ٹھگنا اور فریبہ بدن تھا۔“

خونی کھیل کے بعد کسی کا بھی جی کھانے پر مائل نہ رہا تھا۔ بالخصوص بتول کا رنگ خوف سے ہلدی ہو رہا تھا۔ وہ گھر میں سات پردوں کے اندر رہنے والی سید زادی تھی، اس

نے کب انسانوں کو یوں مرتے دیکھا ہو گا۔ سرفراز واپس نہ آیا تھا فکر مند تو ہم بھی تھے لیکن زبیدہ بے حد پریشان تھی۔ میری وجہ سے اپنے دکھ کا کھل کر اظہار بھی نہ کر سکتی تھی لیکن آنکھوں کی نمی کو وہ کہاں لے جاتی اور چہرے پر پھیلا ہوا پریشانی کا دھواں کیسے چھپاتی۔

”ہمیں کسی بھی ناگمانی آزمائش کے لیے خود کو تیار رکھنا چاہیے۔“ انو نے حسب فطرت سب کو اپنی کمانڈ میں لے لیا تھا۔ مجھے تو اس کی قاتلانہ کارروائی بھی رہ رہ کر کچوکے دے رہی تھی۔ کرتل اشوک ہمارے مقابلے پر تھا وہ ہم سے بتول مانگ رہا تھا اور ہم بزدل تھے نہ اتنے بے غیرت کہ اس کی بات مان لیتے۔ وہ خود بخود درمیان میں چلی آئی تھی اور پھر ہمیں بولنے اور سوچنے کا اس نے موقع ہی نہ دیا تھا منٹوں میں اپنی برتری کا جھنڈا المارے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

”جب تم ہو تو کسی دوسرے کو تیاری کا تردد نہیں کرنا پڑے گا۔“ میرے اندر کا پھوڑا بالآخر پھٹ گیا تھا۔ ”کوئی آزمائش آگئی تو تم بہ آسانی منٹ سکتی ہو۔“

اس نے دانتوں پر دانت جما کر گھور کر میری جانب دیکھا لیکن عورت نادان نہ تھی کہ مشغول ہو جاتی وہ میری کڑوی باتوں کو نگل کر خاموش رہی تھی کیونکہ اسے دوسروں کی موجودگی اور اپنی پوزیشن کا احساس تھا۔

”جما تگر بھائی!“ زبیدہ کے ضبط کے سارے دھاگے جب ٹوٹ گئے تو وہ بھرائی آواز میں بولی۔ ”سرفراز کو کوئی حادثہ پیش نہ آگیا ہو آپ جائیں پتا کریں۔“

”بے وقوفی نہیں زبیدہ۔“ انگل غلام علی نے سرزلش کی۔ ”کیا وہ بچہ ہے جسے گھروالوں نے سبزی کے لیے بھیجا تھا؟ وہ ایک مجاہد ہے اپنی حفاظت خود کرنے والا، پھر ہم اسے کہاں تلاش کریں جا کر؟“

زبیدہ نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا تھا۔ اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ٹیلی فون سیٹ میرے قریب تھا میں نے انگل کی جانب دیکھا انہوں نے گردن ہلا کر مجھے کال سننے کی اجازت دے دی۔

”ہیلو.....!“ میں نے ریسیور اٹھا کر کہا۔ ”میں مدھوک بول رہا ہوں فرام آفس۔“ سرفراز کی آواز نے جیسے میری روح

سرشار کر دی تھی کیونکہ زبیدہ کے دکھ کی تپش میری روح تک اتر رہی تھی۔ ”میں کھانا کھا چکا ہوں، آپ لوگ میرا انتظار نہ کریں۔ ڈرائیور کو آفس کی گاڑی لانے روانہ کر دیا ہے۔“

”آپ کب آفس سے چھٹی کریں گے بھائی.....؟“ میں نے زبیدہ کی جانب مسکراتی نگاہوں سے دیکھا تو اس نے فوراً ”آنکھیں جھکا لی تھیں۔“ ”آپ کی وجہ سے سب بھوکے بیٹھے ہیں۔“

”مجھے احساس تھا پردیپ۔“ سرفراز نے جواب دیا۔ ”لیکن ایک مجبوری تھی، ہر کیف میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔“

”اور کوئی بات؟“

”نہیں کچھ نہیں۔ اودہاں میں نرملا کو بتانا بھول گیا تھا اندر جو گلا سڑا فروٹ پڑا ہے اسے باہر پھینک دے۔“

”نرملا میری بہن ہے اور میری ماتا جی نے اسے گھرداری کی تربیت اچھی طرح دی تھی، اس نے سارا فروٹ باہر پھینک دیا ہے۔“

”پھر اس تک میرا شکریہ پہنچا دو۔“ سرفراز نے قہقہہ لگایا۔ ”او کے پردیپ۔“

”او کے بائے۔“ میں نے کہا۔

پھر سلسلہ خاموش ہو گیا تھا۔ میں نے ریسیور رکھ کر بتایا کہ سرفراز بخیریت آفس پہنچ چکا ہے اور گاڑی لینے اس کا ڈرائیور آ رہا ہے، اس نے کھانا کھا لینے کا کوڈورڈ استعمال کیا تھا مطلب یہی تھا کہ اس نے گاڑی کسی جگہ چھوڑ دی تھی۔

”پیارے بچو!“ انگل پیار سے بولے۔ ”اب کچھ کھاؤ۔ کامیابی پر تو لوگ جشن منایا کرتے ہیں۔“

زبیدہ اور بتول نے مل کر کھانا تیار کیا۔ اس وقفے میں چاہیے تو یہ تھا کہ انوکسی بہانے مجھے لے کر الگ ہو جاتی اور مستقبل کا لائحہ عمل تیار کرتی لیکن میری باتوں نے اس کا موڈ آف کر دیا تھا۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا جب میں اس کی چٹیا کھینچ کر اسے عورت ہونے کا احساس دلاتا تو وہ ناراض ہو جایا کرتی تھی۔

اس نے کبیل لیا اور انگل کے بیڈ پر لیٹ گئی تھی، میں دانت پیس کر خاموش رہا تھا

میرے پاس اسے اٹھانے اور دوسرے کمرے میں لے جانے کا کوئی بہانہ نہ تھا اور انکل غلام علی نے پرانا انبار پر حسنا شروع کر دیا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر کچھ آرام کرنے کا مشورہ انکل نے دیا تو مجھے ایک جواز مل گیا تھا۔ انو انکل کے بیڈ پر تھی اس نے پلیٹ اور روٹیاں بیڈ پر منگوالی تھیں۔

”انو، تم دوسرے کمرے میں چلو یہاں انکل کو آرام کرنے دو۔“

انوں نے ہونٹ بھیج کر اپنی مسکراہٹ دہائی اس سے قبل کہ وہ مجھے جلانے کے لیے کچھ بولتی دستک کی آواز نے ہم سب کو لختہ بھر کے لیے پتھر دیا۔

”شاید سرفراز کا ڈرائیور آیا ہے۔“ انکل بولے اور جوتے پہن کر کرسی سے اٹھ کر باہر نکل گئے۔

”ادھر۔“ زبیدہ نے دوڑ کر تہ خانے کا ڈھکنا کھول دیا۔ ”یہ تہ خانہ ہے کرنل کی آمد پر اسے استعمال کرنا بے معنی تھا کیونکہ یہ تہ خانہ اس کے باپ نے بنوایا تھا۔ اب کم از کم بھابی اور بتول اندر چھپ سکتی ہیں۔“

انوں اور بتول دونوں تہ خانے کے دہانے پر کودنے کے لیے تیار ہو گئی تھیں۔

”عجیب بات ہے۔“ میں نے شاکي لبجے میں کہا مجھے خود معلوم نہ تھا کہ میں کس سے شکوہ کر رہا ہوں۔ ”طوفان تھم تھم کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے، برق نے ہمیں ہی اپنی زد میں لے رکھا ہے۔“

”یہ سب میری وجہ سے ہو رہا ہے۔“ انو بول پئی۔ ”مجھے خود سے نفی کر دو تم سب برق و طوفان سے محفوظ ہو جاؤ گے، طوفان ہمیشہ میری ایڑیوں کو ٹھوکریں مارتا ہے۔“

”ایسی بات نہ کرو بھابی۔“ زبیدہ گلوگیر آواز میں بولی۔ ”بھلا زندگی جیسی چیز کو کوئی چھوڑ سکتا ہے۔ دراصل وادی ہی طوفان کی زد میں ہے۔“

”خطرے کی کوئی بات نہیں۔“ انکل واپس آ کر بولے۔ ”تم لوگوں کا ساتھی گل احمد ہے۔“

”گل احمد!“ انو تہ خانے کے ہول سے ہٹتے ہوئے بڑبڑائی۔ ”جماگیر جا کر دیکھو اگر گل ہے تو اسے اندر لے آؤ۔ بتول اور زبیدہ اگر چاہیں تو دوسرے کمرے میں چلی جائیں گی۔“

”جو آپ کا محرم ہے اس سے میں بھی پردہ نہیں کروں گی۔“ بتول نے کہا۔

”میرے بھائی اور بھابی میرے لیے بہتر فیصلہ کرنے والے ہیں۔“

”نی الحال تم دونوں ادھر چلی جاؤ۔“ میں نے اپنا فیصلہ سنایا اور انکل کے ساتھ دروازے کی جانب بڑھ گیا تھا۔

میں نے بھری سے آنکھ لگائی۔ باہر گل احمد کھڑا تھا، دروازہ کھول کر میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنی طرف گھسیٹ لیا اور پھر دروازہ بند کر کے اسے گلے لگا لیا۔ وہ سابقہ لباس میں تھا۔ ”آؤ اندر آؤ۔“ میں اسے بازو کے حصار میں لیے چل پڑا۔ ”دوبارہ مل کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔“

”میں پہلے آ جاتا مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ آپ محفوظ پناہ گاہ میں ہیں۔“ وہ بتانے لگا۔ ”جب میں نے یہاں کرنل اور سکھ صوبیدار کو داخل ہوتے دیکھا تو میں بہت پریشان ہو گیا تھا۔“

”دعا کرو بھائی ایسے کرنل اور سکھ صوبیدار یہاں آتے رہیں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”اور واپسی کا راستہ بھول جائیں، خیر چھوڑو کل رات تم اس وقت کہاں تھے؟“

”ڈیپ فریزر میں۔“ گل نے جواب دیا۔

”کیا آن تھا؟“

”جی ہاں۔“ گل احمد بولا۔ ”دس منٹ میں بندہ جم تو نہیں سکتا۔“

”السلام علیکم۔“ انو نے سلام میں پہل کی۔ ”کہاں رہ گیا تھا میرا بھائی؟“

”آپ کے ارد گرد رہا ہوں، بہن جی۔“ گل احمد نے بتایا۔ ”میرا خیال تھا ہم سب کو ایک جگہ نہیں رہنا چاہیے، اب مجبور ہو کر آیا ہوں۔“

”پیٹ کا کیا حال ہے گل احمد؟“

”بالکل خالی ہے۔“

”بیٹھو میں دیکھتی ہوں۔“ انو کچن کی جانب چلی گئی تو میں نے انکل غلام علی سے گل احمد کا تفصیلی تعارف کرایا۔ اتنے میں انو ڈھائی روٹیاں اور ترکاری لے آئی اور گل احمد واقعی بھوکا تھا۔ کھانے پر ٹوٹ پڑا تھا۔ انو نے محسوس کر لیا کہ ایک جوان مرد کے لیے بھوئی ڈھائی چپاتیاں ناکافی ہوں گی۔ وہ دوڑتی ہوئی واپس کچن میں چلی گئی اور گرم گرم

ایک ایک چپاتی دے کر واپس چلی جاتی تھی۔

اس طرح ساڑھے آٹھ چپاتیاں منٹوں میں گل احمد کھا گیا تھا۔

”باہر کی کیا پوزیشن ہے؟“ جب انو برتن لے گئی تو میں نے پوچھا۔

”دبی دھوپ چھاؤں کا کھیل جاری ہے۔“ گل احمد نے بتایا۔ ”فوجی چلے جاتے ہیں

تو سکون ہو جاتا ہے، دراصل یہاں کے لوگ اب عادی ہو گئے ہیں۔“

”انسان کبھی ظلم کا عادی نہیں ہوتا بچو۔“ انکل غلام علی نے کہا۔ ”اگر ایسا ہوتا تو

آزادی کی تحریکیں آدمی آدمی صدی پر محیط نہ ہوتیں۔ ہاں یہ آگ کے شعلوں کے

درمیان پیدا ہونے والے بچے تپش اور تشدد سے ہماری طرح گھبراتے نہیں ہیں۔ شعلوں

میں راستہ بنانے کی جرات رکھتے ہیں۔“

گل احمد نے جمائی لی تو انو کو بولنے اور وہاں سے جانے کا جواز مل گیا تھا۔ ہم بھی

بھوکے تھے۔ گل احمد کی طرح اناج کا خمار ہم پر بھی بری طرح طاری تھا۔ میں تو جیسے آرام

بھی کر رہا تھا اور سوچ بھی رہا تھا۔

”پھر وقت طے نہ ملے۔“ وہ بولی۔ ”میرا خیال ہے جو وقت ہمارے پاس ہے اس

کو یوں ضائع نہ کریں سب لوگ کچھ وقت آرام کر لیں میں دیکھ رہی ہوں گل احمد بھائی پر

نیند نے بلم بول دیا ہے۔“

گل احمد اور انکل کو اسی کمرے میں چھوڑ کر ہم تیسرے کمرے میں چلے گئے۔

درمیان والے کمرے میں زبیدہ اور بتول تھیں۔

انو دروازہ بند کر کے پلٹی تو میں چٹائی پر لیٹ چکا تھا۔ وہ ہولے ہولے چلتی پاؤں

کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ چٹائی ایک تھی۔ فرش گرد آلود تھا، میں نے خود غرض نما

شرارت کی تھی کیونکہ اگر وہ پہلے لیٹ جاتی تو مجھے گندے فرش پر لیٹنا پڑتا۔

”تمہارے گھر میں مرغیاں ہوتی تھیں؟“

”ہاں مرغیاں آتی تھیں۔“ میں نے غنودگی میں جواب دیا۔ ”اور ہم کھالیا کرتے

تھے۔“

”اسی لیے تم میں زمرغ جیسی خوبی بھی نہیں ہے۔“ اس نے میری پنڈلیاں جوڑ کر

اوپر اٹھائیں اور دھم سے فرش پر دے ماریں۔ ”مرغا پہلے مرغی کو کھلاتا اور بیٹھنے کی جگہ

کرتا ہے۔“

تم اگر مرغی کی طرح کک کک کک کرو تو میں پاپلوس مرغا بن سکتا ہوں۔“

”نہیں۔“ انو نے میرے بازو پر پنجہ مارا۔ ”میں بلی کی طرح نوچ سکتی ہوں۔“

اس نے جھکا دے کر مجھے بٹھادیا اور پھر خالی جگہ پر بیٹھ گئی، میرے ساتھ ایک المیہ

ہے جب سونے کا وقت اور فرصت نہیں ہوتی تب نیند کا غبار ذہن پر چھانے لگتا ہے اور

بب میں ساری مصروفیات طاق پر رکھ کر سونے کے لیے لیٹتا ہوں تو تفکرات نیند کو دھکے

دے کر آنکھوں سے نکال دیتے ہیں۔

”اگر سونا چاہتی ہو تو میں گل احمد کی پانفتی جا کر لیٹ جاتا ہوں۔“

”نہیں۔“ انو نے اپنی ناک ہتھیلی سے مسلتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہم سونے جیسی

عاشی کے متممل نہیں ہو سکتے۔ خطرات وقت کے افق سے ابھر رہے ہیں۔ ہم نے دادی

میں قدم رکھتے ہی کتنے لوگ قتل کیے ہیں۔ کچھ رات کی تاریکی میں اور کچھ دن کی روشنی

میں۔ صوبیدار میجر گارڈ اور کرنل وغیرہ۔ جعلی عظمیٰ ناگن کی طرح ہماری تلاش میں ہو گی۔

وہ نیلی گواہ ہے گل احمد نے آکر عددی کسر پوری کر دی ہے۔ ان کو ایک عورت اور دو

مردوں کی تلاش ہو گی ہم کھلے اور اصلی چروں کے ساتھ ہیں۔ کرنل نے یقیناً کسی کو بتایا

ہو گا کہ وہ اپنے گھر جا رہا ہے۔ کسی نہ کسی کو ادھر آنا ہے۔“

”مجھے احساس ہے مگر اس حالت میں چھت اور چار دیواری کا آسرا تو ہے باہر ہر سو

آگ ہی آگ ہے۔“

”خدا کو حاضر ناظر جان کر میری بات کا جواب دینا جائیگر۔“ انو نے میرا دایاں ہاتھ

بیدھا کر کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ”کیا زبیدہ کی بازیابی کے بعد تمہارا مقصد پورا نہیں ہو

گیا؟“

”ہاں بڑا مقصد پورا ہو گیا ہے۔“ میں نے حقیقت کا اعتراف کر لیا تھا۔ ”میں جب

یہاں سے گیا تھا تب بھی دادی میں آزادی کی لہرس موجود تھیں مجھے بحیثیت مسلمان نہیں

بلکہ بحیثیت انسان آزادی اور آزادی کی جنگ لڑنے والوں سے ہمدردی تھی اور اب بھی

ہے۔ میرا گھربتاہ کر دیا گیا ہے۔ میری ماں کو شہید کر دیا گیا ہے اور بہن در بدر پھر رہی

ہے۔ میں نے اپنی ملازمت، روشن مستقبل اور سلامتی قربان کر دی ہے کیا میرے پاس

کوئی آپشن رہ گیا ہے۔“

”آپشن تو میرے پاس بھی نہیں رہا جاتگیر احمد۔“ انو نے دکتے لمبے میں کہا۔ ”ہاں ایک راستہ ہے۔ ہم دونوں پھر اپنے ماضی کی غلطیوں کی تجدید کر لیں تو.....“

”کیا تم اس آپشن پر دستخط کر سکتی ہو؟“

”ہاں لیکن آخری سانس سے ایک سانس پہلے۔“

”پھر ایسی راہ کی سوچ کا کیا مطلب؟“

”پھر کیا کروں؟“ وہ ایک دم دہک اٹھی۔ ”کیا میں ٹارچر سیل میں سسک سسک کر مرنے کے لیے تمہارے ساتھ آئی تھی؟“

”سنو انو۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔ ”یہ بات پہلے بھی تم بتا چکی ہو کہ کس لیے تم نے کرنل راج اور اپنے وطن کو چھوڑا ہے لیکن فیصلہ کرنے سے پہلے اور بعد وہاں کے حالات نے تمہیں اپنا فیصلہ بدلنے کا خاصا وقت دیا تھا۔ یہ درست ہے کہ جب کرنل کے گھر سے تم نے فرار کا فیصلہ کیا تھا تو تمہارے سامنے ایک مسلمان نوجوان تھا۔ تم نے کشمیر تک ساتھ نبھانے کا اس وقت ارادہ کیا تھا نہ وعدہ کیا تھا لیکن زمین پر پاؤں رکھنے کی جب تھوڑی ہی مسامت ملی تو میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا تھا یہ بھی کہ میری منزل کشمیر ہے وہ جگہ جہاں موت دن رات مسلمانوں کا شکار کرتی ہے۔ یہاں تک کہ ہم انگاروں پر چلتے یہاں آن پہنچے۔ اب اگر پچھتانے لگی ہو تو تمہیں زندگی کی نامعلوم سانسوں کے ساتھ بہ حفاظت ایڈیا پہنچا دوں گا۔“

”تمہیں پولیس انٹیلی جنس کے لیے کس اسحق نے سبکدوش کیا تھا؟“ وہ کڑوے انداز میں بولی۔ ”تم تو پرلے درجے کے ڈفر ہو۔“

”اگر تم مجھے مشتعل کرنا چاہتی ہو تو انرجی ضائع کر رہی ہو۔“ میں نے ٹھنڈے لمبے میں کہا۔ ”انٹیلی جنس کے پہلے سبق میں درج ہے کہ تمہیں خود کو ہر معاملے میں ٹھنڈا رکھنا چاہیے۔ جہاں تک تعلق ہے ٹارچر سیل کا تو میری کتاب کی پہلی سطر ہے کہ غلامی در غلامی سے بہتر وہ موت ہے جو مقابلے کی گولی سے آئے۔“

”بندہ خدا۔“ انو لہک کر بولی۔ ”میں بھی یہی کہہ رہی ہوں مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ میرا مطلب یہ ہرگز نہ تھا کہ میں یہاں آکر پچھتانے لگی ہوں۔ بخدا، نہیں ہاں شاید

تم میری وجہ سے خول میں بند ہو۔ میں چاہتی ہوں چوہے کی طرح بلوں میں دبکنے سے بہتر ہے شیر کی طرح دھاڑو اور شکار کرنے باہر نکلو۔ میں کسی بند مکان میں مرنا یا قیدی ہونا پسند نہیں کرتی۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے جواب میں کہا۔ ”سرفراز سے پروگرام ڈس کس کریں گے۔ اگر وہ اپنے گروپ میں شریک کرتا ہے تو بہتر ورنہ اب ہم چار ہیں ہم اپنا گروپ الگ کر لیں گے۔“

”کیا زبیدہ کو بھی.....؟“

”ہاں۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”میں اسے دوسروں کے سہارے نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ میری بہن ہے میری ذمہ داری ہے۔ اب ہم ایک ساتھ رہیں گے۔“

”اب کی تاہم نے غیرت مندوں والی بات۔“ اس نے میری کلائی پر تھپکی دی۔ ”یاد رکھنا جاتگیر مجھے بے غیرت اور بزدل مرد سے سخت نفرت ہے۔“

کال بیل کی آواز پر ہم دونوں چونک کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے تھے۔ کوئی جاہل تھا یا غصے میں تھا انگلی ہٹانا بھول گیا تھا۔

”بھابی۔“ زبیدہ نے ہانپتی ہوئی آئی۔ ”باہر بی ایس ایف کی پوری گارد کھڑی ہے۔“

”زبیدہ تم اپنی بھابی اور بتول کو لے کر تہ خانے میں چلی جاؤ۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔“ انو نے دو ٹوک انکار کر دیا۔ ”میں آپ کے ساتھ رہوں گی۔ زبیدہ تم اس لڑکی کے ساتھ اتر جاؤ۔“

”پاگل پن نہیں انو۔“ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھا دیا۔ ”تم جانتی ہو میں تم لڑکیوں کی وجہ سے خود کو کتابے بس سمجھنے لگا ہوں۔ جاؤ خدا نہ کرو۔“

”تم سب کو روپوش ہونا ہو گا۔“ انکل دوڑتے ہوئے آئے اور واپس چلے گئے۔

”ہاں جاتگیر انکل ٹھیک کہتے ہیں۔“ انو بولی۔ ”ان کو یہاں انکل اور بدھوک ملنے

چاہئیں ورنہ معاملہ مشکوک ہو جائے گا۔“

بات میری سمجھ میں بھی آگئی تھی۔

انکل دروازے پر جب بحث کر رہے تھے تو ہم چھوٹے سے تہ خانے میں ایسے بند ہو گئے تھے جیسے آلو بوری میں بند ہوں۔ زبیدہ بول دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑی تھیں۔ گل احمد میرے شانے کے ساتھ تھا اور انوکے پشت میرے سینے کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ خطرے کے باوجود انوکے گداز بدن کے لمس نے میرے اندر کیف و سرور کی ایک انوکھی لہر دوڑا دی تھی۔ میں نے اپنا چہرہ اس کے بالوں پر رکھ دیا تھا اور میرا رواں رواں دعا کر رہا تھا کہ یہ لمحہ طویل تر ہو جائے یا ہم یوں کھڑے کھڑے پتھر بن جائیں۔

خطرہ سروں پر ٹٹل رہا تھا فوجی بوٹوں کی دھمکنائی دے رہی تھی۔ فوجی اندر چل پھر رہے تھے غالباً خانہ تلاشی لے رہے تھے۔ اوروں کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا کہ ہر دھمکنے قطرے خون جلا رہی تھی لیکن میں نشے کی سی کیفیت میں ہر خوف و خطرے سے بے نیاز اپنی متاع حیات کو بانسوں میں لیے کھڑا تھا۔ میں انوکے جذبات سے بھی بے خبر تھا وہ مجبوری کے کڑوے گھونٹ پی رہی تھی۔ شرمندگی نے اسے دبا رکھا تھا یا وہ بھی میری طرح کیف و سرور کی مدہوشی میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ ہاں اس کی بیہوشی اکڑی رہنے والی گردن کا سر پکھل رہا تھا اس نے گردن ڈھیلی کر کے سر میرے سینے پر ڈال دیا تھا۔

”ہمارا راج!“ تہ خانے کی دراز سے آواز پٹکی۔ ”ہم آپ کی بہت عزت کرتا ہے۔ اس لیے کہ آپ کرنل صاحب کا فادر ہے، لیکن ہمارے اوپر بڑی ذمہ داری ہے۔ آپ کے بیٹے کی زندگی کا معاملہ ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو مہاراج دہشت گردوں کی مومنٹ کو واپس کرنے کی خاطر ہم نے پوری دادی ہیں اوپنی سسٹم راج کیا ہے۔ ہمارے اوپنی کی انفارمیشن کے مطابق کرنل صاحب یہاں آئے پھروں بائی دن دو فوجیوں کو اندر بلایا گیا لیکن وہ لوگ اس گھر سے نکلتے نہیں دیکھے گئے۔ ان کی گاڑی مدھوک کمار یہاں سے لے گئے۔ آپ بولو گے مہاراج یہ کیا ہے کرنل اندر آئے لیکن ان کی گاڑی مدھوک لے گیا کرنل اور اس کے ساتھی کہاں گئے؟“

”آفسر۔“ انکل کی آواز سنائی دی۔ ”اشوک کمار میرا بیٹا ہے۔ وہ مصروفیات کے باوجود میٹری قدم بوسی کرنے آتا ہے۔ آج بھی آیا تھا جب واپس جانے لگا تو چھوٹے بھائی کو صحن میں لے گیا چند منٹ وہ باتیں کرتے رہے تھے۔ میرے سامنے وہ باہر چلے گئے تھے۔“

”ہم آپ کو غلط نہیں بول سکتا مہاراج۔“ کسی نے کہا۔ ”آپ کو ہم سے کو آپریٹ

کرنا پڑے گا۔ ہمارے ساتھ چلیں مدھوک کمار کو بھی بلا لیں گے۔“

”چلیں اشوک کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“ انکل نے کہا اور پھر وہ ہمارے اوپر سے گزرتے باہر نکل گئے تھے۔

پانچ سات منٹ ہم لوگ اسی حالت میں کھڑے رہے تھے۔ ایک خطرہ تھا اگر آنے والا آفسر مکان کی نگرانی کے لیے کسی کو چھوڑ جاتا تو ہمارے لیے مصیبت کھڑی ہو سکتی تھی لیکن تک تہ خانے میں رہا بھی نہ جاسکتا تھا۔ رسک ناگزیر تھا۔ ماہرین کا دعویٰ ہے کہ انسانی ذہن سے سوچ کی لہریں نکل کر اسی فریکوئنسی والے ذہن سے جا ٹکراتی ہے۔ گل احمد کے ذہن کی فریکوئنسی وہی تھی۔ اس نے فوراً میری سوچوں کی لہروں کو قبول کر لیا تھا۔

”میں باہر جا رہا ہوں بھائی جی۔“ پھر اس سے قبل کہ اسے کوئی روکتا اس نے ڈھکن اٹھایا اور بازوؤں کے سہارے اوپر چلا گیا، چونکہ کلیر کا سگنل ابھی نہیں ملا تھا اسی لیے ہم سب اس طرح مہربہ لب کھڑے رہے تھے۔

”دروازے سے باہر دس پندرہ قدم کے فاصلے پر دو فوجی پھرا دے رہے ہیں۔“ گل احمد نے ڈھکن اٹھا کر اطلاع دی۔ ”اگر اجازت ہو تو ان کو اندر لے آؤں۔“

”نہیں۔“ انوکے بھائی نے میری بانسوں سے نکل گئی۔ ”ہم پہلے ہی بہت حماقتیں کر چکے ہیں۔ کیا آپ لوگوں نے سنا نہیں یہاں سے دور کسی جگہ ایک اوپنی بھی اس دروازے کی نگرانی کر رہا ہے۔ ہمیں ایک ایک کر کے ساتھ والے گھر کے ذریعے باہر نکلنا ہو گا۔“

”میں دیوار پھاند کر ساتھ والے گھر جاؤں گی۔“ زبیدہ نے کہا۔ ”بوڑھی ٹھاکرانی مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔ وہ اب تو رکاوٹ نہیں بنے گی مگر کل کسی انکوائری پر وہ گواہ بن جائے گی۔ اللہ مجھے معاف کر دیں گے وہ دلوں کے بھید جانتے ہیں میں ٹھاکرانی کو بے ہوش کر کے آپ لوگوں کو ادھر بلا لوں گی۔ ہم رات تک وہاں قیام کر سکتے ہیں۔ محلے کے لوگوں سے اس کے تعلقات کشیدہ ہیں کوئی نہیں آئے گا۔“

میں نے سہارا دے کر اسے باہر نکلنے میں مدد دی تھی۔

”جہاں تک بھائی کیا میں سرفراز کو فون پر خطرے سے آگاہ کر دوں۔“

”ہاں پہلے یہی کام کرو۔“ میں بھی باہر نکل کر بولا۔ ”ہم دونوں نگرانی کرتے ہیں۔“

ان دیکھی ٹھاکرانی سے مجھے ایک قسم کی عقیدت سی ہو گئی تھی جس نے محبت کی خاطر بہت کچھ قربان کر دیا تھا۔ ایسے لوگ بڑے ہی رحم دل اور وفادار ہوتے ہیں۔ عقیدت ہی تھی کہ میں نے بوڑھی ٹھاکرانی سے دوستی کا فیصلہ کر لیا تھا۔

رات آہستہ آہستہ اترتی ہوئی جب کمروں تک آگئی تو لڑکیاں ٹھاکرانی کے کچن میں چلی گئی تھیں۔ اطلاع دی گئی کہ کرپیلے، گھیا کدو اور پنے کی دال ہے۔ میں نے کرپیلے اور دال کس کرنے کی فرمائش کر دی تھی۔ مجھے معلوم تھا نواب زادی انوکھانے کی تو بہادر تھی لیکن پکانے کے معاملے میں بڑی ماٹھی تھی البتہ زبیدہ اور بتول دونوں امور خانہ داری میں ماہر تھیں۔

دونوں نے دال فرائی کر کے کرپلوں میں بھری تھی۔ میری پسندیدہ ڈش تھی۔ اس لیے انو گرم گرم توے کی چپاتیاں پھانچانے کے لیے کچن اور کمرے کے درمیان مثل کاک بنی رہی تھی۔

رات تقریباً دس بجے مشرق کی جانب سے دیوار پھاند کر سرفراز بھی آگیا تھا۔ ہم اسے بھولے نہ تھے لیکن اسے کسی نے بھی موضوع گفتگو نہ بنایا تھا۔ دوسروں کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا البتہ میں نے زبیدہ کی خاطر سرفراز کا ذکر نہیں کیا تھا۔

”اگر بروقت آپ لوگ مجھے اطلاع نہ کرتے تو آج انڈوں پر بیٹھی مرغی کی طرح بلے کا شکار ہو جاتا۔“ سرفراز بتانے لگا۔ ”ابھی ابھی میں ڈرائیور سے ملا ہوں اس کے مطابق ان لوگوں نے آفس کو گھیر لیا تھا۔“

”انکل سے متعلق کوئی خبر؟“ زبیدہ نے پوچھا۔

”ہاں۔“ سرفراز نے مخاطب سے نگاہ زبیدہ پر ڈال کر بتایا۔ ”انکل اس وقت ساتھ والے گھر میں موجود ہیں۔“

”ادہ کیا ان کو چھوڑ دیا ہے ان لوگوں نے؟“

”ہاں اور ٹیلی فون کنکشن ڈس کنیکٹ ہے تاکہ ہم ان سے رابطہ نہ قائم کیں۔“

”مجھے کھانا لے کر جانا چاہیے۔“ زبیدہ اٹھنے لگی تو سرفراز نے اضطراری حرکت کی۔ ”اس نے زبیدہ کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے اٹھنے سے روک دیا تھا۔“

زبیدہ نے سرفراز کا نمبر ڈائل کیا اور اسے ساری بات بتا دی۔ یہ بھی کہ ہم لوگ مشرقی جانب والے ٹھاکرانی کے گھر رات تک قیام کریں گے۔ ریسیور کریڈل پر رکھ کر وہ دوڑتی ہوئی گئی اور دیوار پر تربیت یافتہ فوجی کے انداز میں دایاں پاؤں مارتی ہوئی چشم زدن میں دیوار پھاند گئی تھی۔

میں حیران تھا بلی کی میاؤں اور مغرب کے بعد تنہا کسی کمرے میں جانے سے ڈرنے والی میری بہن کو وقت اور حالات نے کتنا بولڈ کر دیا تھا۔ اس نے نزاکت کو مد نظر رکھا ہو گا۔ دوسرے منٹ اس کا چہرہ دیوار کے افق سے ابھرا میں دبے پاؤں اس کے قریب چلا گیا۔

”ٹھاکرانی گھر میں موجود نہیں ہے۔ باہر تالا پڑا ہے۔ آپ سب کو جلدی لے آئیں۔“ ہم نے بھی ادھر سے ادھر شفٹ ہونے میں دو منٹ سے زیادہ وقت نہ لیا تھا۔ ٹھاکرانی کا وسیع و عریض مکان سامان کے حوالے سے بھرا ہوا گھر تھا۔

چھ کمرے تھے۔ ہم نے آخری کمرے کو صاف کر کے فرش ڈری بچھادی تھی۔ جن حالات سے ہم گزر چکے تھے۔ نیند اور تفریح کا صرف تصور ہی کیا جاسکتا تھا۔ اس لیے تینوں خواتین نے الگ اپنا گروپ بنا لیا تھا۔ انو سرگوشیوں میں بولنے کا ٹھکر پورا کرنے لگی تھی۔

”کیا ٹھاکرانی کا کوئی عزیز رشتہ دار ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں اس کا کم از کم سری نگر میں کوئی عزیز نہیں رہتا۔“ زبیدہ نے جواب دیا۔

”اس نے خود مجھے بتایا تھا کہ چالیس برس قبل وہ لوگ ہمالیہ کی ترائی کی ایک خانقاہ

سے نکل کر یہاں آباد ہوئے تھے۔ ٹھاکر پرس رام جس مندر میں تھا اس کے سامنے بدھ مت کی خانقاہ تھی۔ ٹھاکرانی وہاں تھی پھر ٹھاکر نے مندر چھوڑ دیا اور ٹھاکرانی خانقاہ سے نکل آئی تھی۔“

وہ میری بہن تھی اس لیے اس نے ٹھاکر ٹھاکرانی کے عشق کا حوالہ نہیں دیا تھا کہ دونوں نے دل کی عبادت کے لیے اپنے اپنے مذہب کی عبادت چھوڑ دی تھی۔ اسے شاید معلوم نہ تھا کہ محبت چیز ہی ایسی ہے جس سے ہو جائے آدمی سارے رشتے تمام عقائد اور منادات چھوڑ کر اس کا ہو کر رہ جاتا ہے۔

”وہاں جال بچھا ہوا ہے اور انکل کو بطور چارہ استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں بھی خطرہ ہے۔ ادھر والی گلی اور سامنے میدان میں سکیورٹی والے چوکس کھڑے ہیں۔ میں انتظام کر آیا ہوں اس وقت مجاہدین کے ایک خفیہ ہیڈ کوارٹر میں منتقل ہوتا ہے۔“

”کیا ہمارا ایک ساتھ جانا مناسب ہو گا؟“ انو نے سوال کیا۔

”عید گاہ تک کوئی خطرہ نہیں۔“ سرفراز نے بتایا۔ ”کسی غدار قوم کے بیٹے کی شادی ہے۔ ہندو مسلم خاندان شادی میں جا رہے ہیں۔ ہم جوڑا جوڑا عید گاہ کے پچھواڑے تک جائیں گے وہاں ہماری گاڑی کھڑی ہے۔“

”آپ نے کھانا نہیں کھایا ہو گا۔“ زبیدہ نے پیار سے پوچھا۔ ”لے آؤں۔“

”نہیں۔ وقت بہت کم ہے۔“ سرفراز نے کہا۔ ”چلئے اور آپ جمائیں جوڑے بنائیں گے۔“

”میں میں بھائی اور جمائیں بھائی اکٹھے چلیں گے۔“ زبیدہ نے ایک بھائی کا بھرم رکھ لیا تھا۔ میرے لیے یہ مشکل فیصلہ ہوتا ہے کہ زبیدہ کو سرفراز کے ساتھ لگا دیتا۔

”آپ.....!“ اس نے شاید پہلی بار گل احمد کی موجودگی محسوس کی تھی۔

”میرا بھائی گل احمد۔“ انو نے کہا۔

”اچھا اچھا غائبانہ تعارف تو تھا۔“ سرفراز نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ ”آپ بتول بہن کے ساتھ عید گاہ تک جائیں گے۔ راستہ تو آپ جانتے ہوں گے۔“

بتول نے دانتوں تلے ہونٹ دبا کر سر کو اثباتی جنبش دی اور چادر درست کرنے لگی۔ اگر مجبوری نہ ہوتی تو میں اس معصوم سید زادی کو ایک نامحرم کے ساتھ باہر جانے کی کبھی اجازت نہ دیتا۔

انو نے جھک کر زبیدہ کے کان میں کوئی بات کی تو دونوں قطار میں پڑے ٹرکوں کی جانب گئیں۔ کچھ ٹرک کھلے تھے اور کچھ مقفل تھے۔ انو نے ہیر پن سے ایک تالا کھولا اور اندر سے ایک ایک کپڑا اٹھاتی ہوئی زبیدہ کو دکھاتی اور الگ کرتی جاتی تھیں۔ پتا چلا کہ وہ رواج کے مطابق ٹرے میں شادی والے گھر کے لیے کپڑے لے جانا چاہتی تھیں۔ ایسا ایک ٹرے سجا کر بتول کے بھی حوالے کر دی گئی تھی۔

ہمارے درمیان اتنا فاصلہ تھا کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ سرفراز گل

احمد اور بتول کے گروپ آگے کے تھا۔ کچھ اور بھی لوگ ادھر جا رہے تھے۔ شادی والے گھر کے باہر بہت سے لڑکے دائرے میں کھڑے آتش بازی کا مظاہرہ کر رہے تھے کسی بڑے باپ کا بیٹا تھا اور نہ اتنی آزادی اور اس دھوم سے شادی نہ ہوتی۔

ہم بخیریت عید گاہ کے عقب میں جا پہنچے۔ جھانپوں میں سے تین آدمی نکلے سرفراز سے کچھ باتیں کر کے پھر جھانپوں میں داخل ہو گئے تھے پھر ایک فورڈ ٹرک ریورس میں آتا دکھائی دیا۔ ٹرک پر بھوسے کی گانٹھیں لوڑ تھیں۔ ہم سرفراز کی ہدایت پر فوراً گانٹھوں کے پیچھے چلے گئے تھے۔ اتنی جگہ نہ تھی نیچے ترپال بچھا ہوا تھا اوپر بھی ایک ترپال تھا۔ تقریباً آدھا گھنٹا ٹرک اونچی نیچی سڑک پر چلا ہوا جب راکو تو سرفراز نے آواز دی۔

میں نے پہلے خواتین کو نیچے اتارا پھر میں اور گل احمد نیچے کو گئے تھے۔ چاروں اطراف قد آور درختوں کا جنگل تھا۔ بلندی سے سری نگر کا سارا علاقہ پاؤں میں دکھائی دے رہا تھا۔

ایک فرلانگ دشوار چڑھائی کا سفر خواتین کے لئے مشکل ثابت ہوا تھا۔ جب میں نے انوکو سہارا دینا چاہا تو اس نے فراخ دلانہ انداز میں میری آفر مسترد کرتے ہوئے کہا کہ زبیدہ اور بتول کو سہارے کی زیادہ ضرورت ہے۔ زبیدہ نے اونچی ایڑی والے سینڈل اتار دیے تھے۔ اس لئے وہ قدم بجا بجا کر اوپر چڑھی تھی البتہ بتول کا ہاتھ میں نے تھام رکھا تھا۔ وہ ایک قدرتی تالاب تھا جیسے عموماً پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہوتے ہیں۔ برف ہٹا کر تالاب کو درختوں کے تنوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا، چھت پر بکریوں کا ریوڑ بیٹھا جنگلی میں مصروف تھا۔

جھانپوں کے اندر تالاب تک جانے کے لئے گول سوراخ بنایا گیا تھا جو باہر سے دکھائی نہ دیتا تھا۔ جوں ہی ہم داخل ہوئے ایک مشعل بردار نے السلام علیکم کہہ کر ہمارا استقبال کیا۔ پتھروں کو جوڑ کر میڑھاں بنائی گئی تھیں۔ پتھر ایک سائز کے نہ تھے۔ اس لئے احتیاط سے اترنا ضروری تھا، مشعل نہ ہوتی تو شاید ہم میں سے کوئی گر پڑتا۔ باہر کی فضا خاصی خشک تھی مگر اندر کا موسم خوشگوار تھا۔ سرفراز رہنمائی کر رہا تھا۔ ہمارا قافلہ جب تالاب کے پیٹ میں اترتا تو مشعل کی روشنی میں مجھے دائرے میں بیٹھے اور لیٹے بہت سے لوگ دکھائی دئے۔

ایک شخص سبز چادر اوڑھے جہاں بیٹھا ہوا تھا اس کے ارد گرد دس بارہ آدمی دو

زانو بیٹھے ہوئے تھے۔ سرفراز ہمیں ادھر ہی لے گیا۔

”السلام علیکم۔“ میں اور سرفراز بیک زبان بولے۔

”وعلیکم السلام پیارے بچو۔“ چادر پوش نے نرم آواز میں جواب دیا۔

”اوہ..... آپ۔“ جوں ہی چادر پوش کے چہرے پر مشعل کی روشنی پڑی، میں اچھل پڑا۔ میرے سامنے سید برکات علی شاہ بیٹھے ہوئے تھے۔ مرشد کامل، شعلہ حریت، اسلامیات کے پروفیسر اور خطیب مرکزی جامع مسجد، جن کی گرفتاری پر انعام کا کئی بار اعلان ہوا تھا اور جن کی گرفتاری سے معذرت پر مجھے بطور سزا لائن حاضر کر دیا گیا تھا۔ جن کے بارے میں افواہ پھیلی تھی کہ شاہ صاحب ایک مقابلے میں شہید ہو گئے ہیں اور فوج نے ان کی لاش دینے سے انکار کر دیا ہے۔ وہی شخص میرے سامنے تھا۔

”آگے آؤ جمائگیر احمد۔“ شاہ صاحب بولے۔ ”معاف کرنا چئیں، میں ایک ٹانگ سے محروم ہوں۔ مصنوعی ٹانگ ٹھیک ہو رہی ہے۔“

لوگوں نے ادھر ادھر ہٹ کر ہمیں راستہ دیا۔ میں والمانہ انداز میں جھک کر آگے بڑھا لیکن میرے دونوں ہاتھ شاہ صاحب نے پاؤں تک نہ جانے دیے تھے۔ میں گھٹنوں کے بل ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

”اس افواہ میں جھوٹ صرف اتنا تھا۔“ شاہ صاحب نے کہا۔ ”میں شہید ہونے کی سعادت حاصل نہ کر سکا تھا۔ میری ٹانگ الگ ہو گئی تھی۔ چودہ گولیاں نچلے دھڑ میں لگی تھیں مجھے میرے ساتھی برستی آگ سے نکال لے گئے تھے۔ حیران تو میں بھی ہوں جمائگیر احمد تم تو پولیس میں انسپکٹر تھے پھر یہاں.....“

”فرصت ملی تو اپنی کمائی عرض کروں گا حضرت جی۔“

”سنا ہے تمہارا گھر.....“

”جی ہاں حضور۔“ میں نے جواب دیا۔ ”گھر کے ساتھ ہی وہ جمائگیر احمد بھی جل گیا تھا۔“

”سرفراز ان بچوں کو اصل رشید کے حوالے کر آؤ۔“ شاہ صاحب نے ان پر اپنی سی نگاہ ڈالی اور پھر مجھ سے کہنے لگے۔ ”تم نے اچھا فیصلہ اور سیدھا راستہ اختیار کیا ہے۔ اس مظلوم و محکوم قوم کو تم جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے، تم پہلے زندگی سے پیار کرنے

والے تھے لیکن اب تمہیں آزادی اور شہادت کی موت سے پیار کرنا ہو گا۔ دیکھو بیٹے۔ موت، گولی تو درکنار ایٹم بم بھی وقت سے ایک سیکنڈ پہلے نہیں دے سکتا۔ میری طرف دیکھو میں پورے چار گھنٹے مارٹر گنوں، دستی بموں اور آگ بھڑکانے والے گولوں کے درمیان لڑتا رہا ہوں۔ موت کا وقت نہ تھا، زندہ رہا اور اب میں بھکاریوں کے روپ میں ہر روز شہادت کی تلاش میں نکل پڑتا ہوں۔ موت کو آتا تو ہے پھر کیوں نہ ہم موت آنے تک آزادی کے لئے لڑیں۔ تمہاری آمد سے پہلے جو پروگرام مرتب ہوا ہے اتفاق رائے سے تمہارا نام دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ تم انگریزی، اردو اور کشمیری تینوں زبانوں پر عبور رکھتے ہو۔ کچھ منظور نظر کشمیریوں کو بین الاقوامی مبصر ٹیم سے ملنے کی اجازت دی گئی ہے۔ میں نے میرا اعظ فاروق سے بات کر لی ہے، اس وفد میں تم بھی شریک ہو گے۔ میں نے اردو کی ایک جامع رپورٹ تحریر کی ہے۔ میں چاہتا ہوں آج رات تم اس مضمون کو انگریزی کے قالب میں ڈھال دو۔ میں نے بھارت سرکار کا اصلی چہرہ بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے اگر تم کسی جگہ رد و بدل کرنا چاہو تو کر لیتا۔ میں چاہتا ہوں انصاف کے داعی لوگ بھارت سرکار کا اصل روپ اور کشمیری قوم کی مظلومیت جان لیں۔ وفد زبانی بات کرے گا۔ تم موقع پا کر رپورٹ ٹیم کے حوالے کر دیتا۔“

”یہ میرے لئے بہت بڑا اعزاز ہے حضرت۔“ میں نے ادب سے کہا۔ ”لیکن مقامی حکام مجھے فوراً پہچان لیں گے۔ میں مغرور اور منحرف ملازم ہوں۔“

”اس کا انتظام بھی سوچ لیا گیا ہے۔“ شاہ صاحب نے ایک بوڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ ”عبداللہ خان ایک ماہر میک اپ کرنے والا ہے، اگر تم چاہو تو تمہیں فاروق عبداللہ کا چہرہ دے سکتا ہے، عبداللہ خان، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”یہ حضرت کی ذرہ نوازی ہے۔“ وہ سر جھکا کر بولا۔

”جمائگیر احمد صبح سات بجے روانہ ہو گا اسے مناسب خدوخال دے دیتا۔“

”بہتر حضرت۔“ عبداللہ نے جواب دیا۔ ”میرے پاس ابھی کچھ ماسک بالکل تیار ہیں۔“

قہوہ سرو کیا گیا۔ اس دوران انو، زبیدہ اور بتول کا تعارف بنات کشمیر گروپ سے کرایا گیا۔ تالاب مٹی کے چراغ جیسی تھی تنگ کھاڑی میں خواتین کی رہائش تھی۔ بیچ میں

سرکنڈوں کا ہتھ تانا ہوا تھا۔ مجھے ایک نو عمر لڑکے نے چند کانڈات دیے۔ رپورٹ کا عنوان تھا۔ ”پس نقاب“ شاہ صاحب نے خوبصورت اور جامع الفاظ میں حقائق رقم کیے تھے۔ سرفراز نے مجھے چٹوں سے گھرا ہوا چھوٹا سا کیبن دکھایا۔ خشک گھاس کے گدے پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ تکیہ پتھر کا تھا۔

”آپ کے ساتھ تینوں خواتین ہیں۔“ سرفراز نے دائیں ہاتھ پر تہی ہتی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے زیر لب بتایا۔

”یار! میرے لیے اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟ بھائیوں کے ساتھ رہ لیتا۔“
”آپ کو کام کرنا ہے۔“ سرفراز نے جواب دیا۔ ”یہ حضرت شاہ صاحب کا حجرہ ہے۔“

مجھے ایک بڑے ساز کی موم بتی، ماچس، پانی اور قلم کاغذ دے کر سرفراز واپس چلا گیا تھا۔ موم بتی روشن کر کے میں پتھر سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا اور رپورٹ پڑھنے لگا۔ ”معزز اراکین! وادی کشمیر کے مسلمانوں کی طرف سے میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ ہمارے لیے یہ کسی حد تک حوصلہ افزا بات ہے کہ عالمی ضمیر بیمار تو ہے مگر ابھی مردہ نہیں ہوا، آپ یقیناً اہل بصیرت لوگ ہیں، لیکن مجھے اس بات کا دکھ اور احساس ہے کہ آپ کے کانوں اور آنکھوں پر بھارت سرکار کے پیرے لگے ہوئے ہیں، اگر آپ کو وادی میں کھیلے جانے والے خونی ڈرامے کا اصل کھیل دیکھنے کی خواہش ہے تو پیرے سے نکل کر مظلوموں، زخمیوں، قیدیوں، بیواؤں، یتیموں اور خون آلودہ چار دیواریں کو دیکھنا چاہئے، جگہ ہوئے کھیتوں، اجڑی ہوئی آبادیوں کو دیکھئے اور بھارت کے ذمے داروں سے پوچھئے یہ سب کیا اور کیوں ہے؟

”جناب والا! میں حال کی لاش پر کھڑا ہوں اور آپ کو بھارت کا اصل چہرہ اور کشمیر کی سچی تصویر دکھانا چاہتا ہوں۔ سیکولر اسٹیٹ انڈیا کا دعویٰ ہے کہ کشمیر تاریخی طور پر اس کا انوٹ انگ ہے۔ جب کہ یہ محض جھوٹ کا کریمہ چہرہ ہے۔ سچ یہ ہے کہ کشمیر ہمیشہ ایک خود مختار ریاست کے طور پر جانا پہچانا جاتا تھا۔ تاریخی طور پر ہم کشمیر کو تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ غیر مسلم حکومت، مسلم حکومت اور پھر ڈوگرہ راج، لیکن ہر دور میں کشمیر ایک خود مختار ریاست رہی ہے۔ تقسیم برصغیر کے وقت بھی اسے خود مختار ریاست کا درجہ

حاصل تھا یہی وجہ ہے کہ دیگر ریاستوں کی طرح کشمیر کو بھی ہندوستان یا پاکستان کے ساتھ الحاق کا آپشن دیا گیا۔ یہی آپشن اس کی خود مختاری کی روشن دلیل ہے۔

(1) 1947ء میں مہاراجا کشمیر نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کیا تھا۔ آئینی اعتبار سے یہ غلط ہے کیونکہ مہاراجا ہری سنگھ عوام کا نمائندہ نہیں تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ ریاست کے عوام ڈوگرہ حکمران کے ظلم و ستم سے تنگ تھے اور مہاراجہ کے خلاف متحرک تھے جس کی وجہ سے ہری سنگھ کشمیر سے فرار ہو گیا تھا۔ ایک بھگوڑے حکمران کی کوئی آئینی حیثیت نہ تھی کہ وہ الحاق کی دستاویز پر دستخط کرتا۔ مزید برآں اس وقت کے عوام کی واحد نمائندہ جماعت آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس اپنے اجلاس میں الحاق پاکستان کی قرار داد منظور کر چکی تھی اور مہاراجا بھی پاکستان اور بھارت کے ساتھ کشمیر کی موجودہ پوزیشن برقرار رکھنے کا معاہدہ کر چکا تھا۔

(2) کشمیر کے بھارت سے الحاق کی یہ مذموم کوشش برصغیر کے متفقہ اصول کے منافی ہے جس کی رو سے تمام مسلم علاقوں کو پاکستان میں شامل ہونا تھا پھر یہ بھارت ہی تھا جس نے اس الحاق کو عارضی قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ کشمیر کی قسمت کا فیصلہ کشمیری عوام کریں گے۔ اب جب کشمیری عوام بھارت سے آزادی کا مطالبہ کر رہے ہیں تو بھارت آزادی کی بجائے ان کو آگ میں کیوں جھونک رہا ہے؟

(3) یو۔ این۔ او کی جملہ قراردادوں کا متن بھی یہ ہے کہ ریاست کی موجودہ صورت دائمی نہیں ہے بلکہ آزادانہ فضا میں رائے شماری کے ذریعے خود کشمیری عوام ہی اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔ پھر بھارت وہ مجوزہ فضا کیوں پیدا نہیں ہونے دیتا اور کشمیریوں کو رائے شماری کا حق کیوں نہیں دے رہا؟ یہ بات بھی ناقابل غور ہے کہ برطانوی محقق الشریکپ اور خود مہاراجا ہری سنگھ کے بیٹے نے ناقابل تردید دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ الحاق کی دستاویز جعلی ہے اور مہاراجا نے اس پر دستخط نہیں کیے تھے۔

(4) بھارت کا یہ دعویٰ بھی باطل ہے کہ کشمیر پر بھارتی آئین کا اطلاق ہوتا ہے دراصل بھارت نے جھوٹ پر جھوٹ کی تہ چڑھاتے ہوئے کشمیر کی حیثیت بدلنے کی خاطر اپنے دستور میں مرحلہ وار ترامیم کی ہیں۔ شروع میں اس کے دستور میں ایک شق تھی کہ

دفاع اور خارجہ اور کرنسی کے سوا تمام امور کشمیری حکومت کے پاس ہوں گے۔ یہ ایک طرح کی داخلی خود مختاری تھی جو بھارت کے کسی دوسرے صوبے کو نہ دی گئی تھی پھر بھارت نے اپنے ہی دستوری فیصلے پر سیاہی پھیرتے ہوئے ریاستی حکومت کے بہت سے اختیارات واپس لے لیے اور کشمیر کو بھارت میں ضم کر لیا۔ دوسری طرف دنیا اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ 1948ء میں بھارت خود مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ میں اٹھا چکا ہے اور تمام قراردادوں کو تسلیم بھی کر چکا ہے۔ لہذا کشمیر کو بھارتی صوبے کے طور پر کسی بھی پلیٹ فارم پر تسلیم نہیں کیا گیا۔

(5) بھارتی آئین کے ساتویں شیڈول لسٹ 3 میں واضح طور پر درج ہے کہ بھارتی یونین کشمیر میں بی ایس ایف، سی آر پی، آئی ٹی بی پی مسلح افواج اور نیشنل سکیورٹی گارڈ تعینات نہیں کر سکتی۔ حتیٰ کہ ریاستی حکومت کی درخواست پر بھی امن عامہ بحال کرنے کے لیے بھارتی فوج کشمیر میں داخل ہونے کی مجاز نہیں اس کے باوجود بھارت سے کوئی نہیں پوچھتا کہ اپنے ہی دستور کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کشمیر میں چھ لاکھ فوج کیوں تعینات کر دی ہے اور یہ درندے کشمیریوں کا خون کیوں چاٹ رہے ہیں؟

(6) بھارت کے دستور میں درج ہے کہ حکومت کسی بھی صوبے میں تین سال سے زیادہ عرصہ گورنر راج نافذ نہیں کر سکتی۔ بھارت کی ڈھٹائی دیکھئے! ایک طرف کشمیر کو بھارت کا صوبہ قرار دیا جاتا ہے اور دوسری طرف 1990ء سے مسلسل وہاں گورنر راج نافذ ہے اور دستور میں ترمیم تک کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ بھارت کا دعویٰ ہے کہ متعدد بار کشمیر میں انتخابات ہو چکے ہیں لہذا اب رائے شماری کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ اقوام متحدہ میں جس رائے شماری کا ذکر کیا گیا ہے، جسے بھارت بھی تسلیم کر چکا ہے۔ اس میں رائے شماری کا سارا عمل اقوام متحدہ کی نگرانی میں ہونا چاہئے تھا نہ کہ بددق کے سائے میں۔ پھر عام انتخابات جس طرح وہاں ہوئے پریس کے ذریعے اقوام عالم نے جان لیا تھا کہ تمام مخالف امیدواروں کے کانڈیٹ مسٹر کر کے ان کو جیلوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ بھارتی حکومت اپنے دعوے میں وزن پیدا کرنے کے لیے مرحوم شیخ عبداللہ کا حوالہ دیتی ہے کہ نیشنل کانفرنس نے ریاست کے بھارت کے ساتھ الحاق کی توثیق کر دی تھی۔ اس کشمیری لیڈر کی عوام میں قدر و منزلت کا یہ عالم ہے

کہ شیخ عبداللہ کی قبر پر فوجی پہرا لگا ہوا ہے اور ان کا بیٹا فاروق عبداللہ ریاست میں داخل نہیں ہو سکتا۔ خود ساختہ جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

”جناب والا اگر آپ تاریخ سے قطع نظر بھارت، پاکستان اور کشمیر کو جغرافیہ کے تناظر میں دیکھیں تو فیصلہ کرنا مشکل نہ ہو گا کہ کشمیر جغرافیائی لحاظ سے بھی پاکستان کا حصہ بنتا ہے۔ جموں و کشمیر کی ایک ہزار کلومیٹر سے زائد سرحدیں پاکستان سے ملتی ہیں جب کہ بھارت کا زمینی رابطہ صرف تین سو کلومیٹر ہے۔ وہ بھی اگر تقسیم کے وقت نا انصافی نہ کی جاتی تو ضلع گورداس پور پاکستان کے حصے میں آتا۔ یوں انڈیا سے زمینی تعلق بھی نہ رہتا“ پاکستان اور کشمیر کے درمیان صدیوں سے سڑکوں کا رابطہ قائم ہے۔ کشمیر سے نکلنے والے تمام دریاؤں کا رخ پاکستان کی جانب ہے۔ اس لئے ہم کہتے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ تمام راستے تمام رابطے اور تمام واسطے آزادی کی طرف جاتے ہیں۔“

میں ماضی کی ناہمواریاں پر دوڑ رہا تھا۔ حضرت برکات علی شاہ نے قلم کے نشتر سے بھارتی پروپیگنڈا کا چہرہ لہولہاں کر دیا تھا۔ میں نے قلم سنبھالا ہی تھا کہ میری سماعت نے بتول کی آواز ٹکرائی۔ میں نہیں جانتا انو، زبیدہ اور بتول میری قربت سے آگاہ تھیں، شاید نہ رہی ہوں گی کیونکہ بتول ایسی لڑکی نہ تھی کہ محض مجھے سنانے کے لیے ماضی کی وہ باتیں کرتی جن سے میں لاعلم تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ انو نے کیا سوال کیا تھا اور اسے جواب دینے پر کیسے آمادہ کر لیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”نہیں بابی!“ بتول نے جواب دیا تھا۔ ”اسے تو شاید آج بھی معلوم نہ ہو گا کہ میں اسے کتنا چاہتی رہی ہوں۔ میں اس وقت سے اسے پسند کرتی ہوں جب میری عمر تیرہ چودہ برس تھی۔ وہ ہر روز اسکول جاتے ہوئے ہمارے گھر آتا تھا اور سبط بھائی کو لے جایا کرتا تھا۔ وہ مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ میں کھڑکی سے اسے دیکھا کرتی تھی پھر ایک شام میں نے بڑے بے ڈھنگے پن سے اظہارِ محبت کیا تو وہ ہنستا ہی چلا گیا تھا۔ کیا وہ اب بھی محبت کے معاملے میں اسی طرح بے پروا اور بے حس ہے بابی؟“

”ہاں نہیں بتول۔“ انو نے اسے جواب دیا۔ ”ہماری اس سلسلے میں کبھی بات نہیں ہوئی۔“

”بات نہیں ہوئی۔“ یہ زبیدہ کی حیران سی آواز تھی۔ ”یعنی جمائیکر بھائی آپ

اچھی لگتی تھی لیکن میرے سامنے ایک حقیقت تھی۔ وہ سید زادی تھی ہمارے ہاں سید زادی کے درمیان صرف عقیدت اور احترام کا رشتہ پائیدار ہوتا ہے پھر وہ میرے دوست کی بہن تھی اس گھر میں مجھے عزت اور ماں کا پیار ملتا تھا۔ میں اتنے سارے رشتوں کو دل کے ایک رشتے پر کیسے قربان کر سکتا تھا؟

بتول کی باتیں مجھے بہت پیچھے لے گئیں اور میں اس گھر کے صحن میں پھرتے پھرتے سو گیا۔ موم بتی رات بھر روتے روتے دم توڑ گئی تھی۔ تھکاوٹ بھی نہ تھی بس پُر سکون جگہ ملی تھی نیند نے آیا تھا۔ چار بجے سب کو نماز فجر کے لیے جگایا گیا تھا۔ سرفراز نے پھر رہنمائی کے فرائض سنبھال لیے تھے۔ وضو کے لیے تالاب تک اوپر سے پانی کی ٹالی لائی گئی تھی۔ سرفراز نے بتایا تھا کہ خواتین نماز سے فارغ ہو کر ناشتیاں کریں گی۔

ناشتے کے بعد عبداللہ نے چند فوٹو دیے اور پوچھا کہ کون سا چہرہ بنایا جائے؟
”یہ کون لوگ ہیں بزرگ محترم؟“ میں نے باری باری فوٹو دیکھ کر پوچھا۔

ان میں میر جعفر اور صادق کی روحیں تھیں۔ ”عبداللہ خان نے نفرت سے بتایا۔
”نقداری کے صلے میں حکومت نے ان کو استاد اور مراعات دی تھیں اور مجاہدین نے اپنی اپنی ہندوق کی گولی پر ان کے نام لکھ لیے تھے۔ حکومت کا خیال ہے یہ لوگ مجاہدین کے خوف سے ڈر کر وادی سے فرار ہو گئے ہیں۔ یہ عبدالعلی ہے۔ خاصا بااثر شخص تھا۔ میرا خیال ہے یہی چہرہ بہتر رہے گا تمہاری جسامت بھی ویسی ہی ہے۔“

”کیا مجھے مسلمانوں کا نمائندہ وفد قبول کر لے گا؟“

”ہاں۔“ عبداللہ خان نے سامان کو ترتیب دیتے ہوئے جواب دیا۔ ”حضرت صاحب نے بات کر لی ہے جب ان کا حوالہ دو گے تو کسی کو اعتراض نہ ہو گا۔“
”نام بھی.....“

”ہاں، تمہارا نام عبدالعلی ہو گا کیونکہ وہ جنم واصل ہو چکا ہے اور اس کے گھر والے دہلی چلے گئے ہیں۔“

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا ایک محفوظ آڑ مل رہی تھی۔ ویسے بھی روپوشی کی زندگی میرے لیے قاتل برداشت نہ تھی۔ پردہ دار عورت کی طرح میں چار دیواری میں مقید نہیں رہنا چاہتا تھا۔ آنے کا مقصد جو بھی تھا جب اوکھلی میں سردے دیا تھا تو چھپ

سے.....“
”دراصل۔“ انو نے گہری سانس لی تو میں مسکرا اٹھا۔ انو لڑکیوں کو بے وقوف بنا رہی تھی۔ ”ہماری شادی کمرشل بنیادوں پر ہوئی تھی اس لئے محبت کی ریسرسل ہوئی تھی نہ ڈراما کھیلا گیا تھا۔“ لفظ بھر کے لیے سکوت طاری رہا، جب کسی طرف سے کوئی سوال نہ ہوا تو بات کو آگے بڑھاتے ہوئے انو بولی۔ ”میں محبت کے معاملے میں بڑی بد نصیب ہوں۔ بہن ہے نہ بھائی، باپ دیکھا نہیں۔ ماں نے ساتوں آسمانوں کے تارے مجھے دیے لیکن میں پیاسی کی پیاسی رہی۔ وہ محبت جو روح کو سیراب کرتی ہے۔ پیاس بجھاتی ہے اور بندے کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے، کسی نے بھی نہ دی۔“

”کیا آپ نے بھی کسی سے وہ محبت نہیں کی باجی؟“ زبیدہ نے پوچھا۔
”بھئی کہہ چکی ہوں احساس محرومی نے مجھے سل پتھر کر دیا تھا۔ ہاں، ایک شخص کو دیکھا تو محسوس ہوا شاید میں اس کو چاہنے لگی ہوں۔“

”پھر..... پھر کیا ہوا۔ وہ آپ کو نہیں ملا؟“ بتول نے ہکلا کر پوچھا۔
”ملا کیسے نہ۔“ انو نے بھڑک کر جواب دیا۔ ”رسی تڑانے کی کوشش تو بہت کی اس نے پھر میں نے اس کی ناک میں نکیل ڈال دی۔“
”لیکن آپ نے شادی تو بھائی جان.....“

”آپس کی بات ہے، کسی کو بتانا نہیں، وہ تمہارا بھائی ہی ہے۔“ انو نے کہا اور زبیدہ نے قہقہہ اچھال دیا۔ ”ویسے بتول کے لیے نکیل نکال سکتی ہوں۔“

”اوہ، نہیں باجی۔“ بتول کی تڑپتی آواز ابھری۔ ”آپ نے یہ بات کر کے مجھے دکھ دیا ہے۔ وہ بچپن کی ایک معصوم سی خواہش تھی۔ وہ تو اب میرا بھائی ہے، سبط بھائی کی شہادت کے بعد مجھے بھائی کے پیار کی بھی تو ضرورت ہے۔“

”ارے! مے تم تو رونے لگی ہو۔“ انو کی آواز سنائی دی تو میرا منہ بھی کڑوا ہو گیا۔

جب بھی میں کسی دکھ کو کچلتا ہوں تو میرے منہ کا ذائقہ کڑوا ہو جاتا ہے۔ بتول نے غلط کہا تھا کہ میں اس کے دلی جذبات سے بے خبر تھا۔ نہیں، مجھ اس کی بھوری آنکھوں میں ڈھلکتے پیار کا رنگ دکھائی دیتا رہتا تھا، مجھے بھی وہ صاف شفاف شیشے جیسی لڑکی

کچھ دوڑ رہی تھیں اور کچھ کو دوسری عورتوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ اسی جھگڑ کے دوران میں مسجد میں داخل ہو گیا۔

مسجد میں موجود کشمیری اکابرین حجرے میں کھڑے تھے۔ فائرنگ پر تہمرہ ہو رہا تھا۔ اکثریت کی رائے تھی کہ نام نہاد حکومت نے وفد کو روکنے کے لیے جواز بنا لیا ہے۔ اب امن و امان کا حوالہ دے کر وفد کو گرفتار کر لیا جائے گا۔

”اگر ایسا خطرہ ہے۔“ ایک بارلش نوجوان بولا۔ ”تو چوہے دان میں گرفتار ہونے سے بہتر ہے کہ کھلی جگہ ہمارا راستہ روکا جائے۔ عوام اور غیر ملکی مہمانوں کو اس سازش سے آگاہ کیا جاسکے ورنہ کسی کو خبر بھی نہ ہوگی اور ہمیں ٹارچر سیلوں میں ٹھونس دیا جائے گا۔“

”میں صدائے احتجاج بلند کرتا ہوں۔“ ایک بزرگ اوپر جانے والی سیڑھوں پر چڑھ کر بولے۔ ”میں دیکھ رہا ہوں کالی بھیڑیں بھی ہمارے وفد میں شامل ہیں۔ عبدالعلی۔“ اس نے میری جانب اشارہ کیا۔ ”بدبخت! کب تک اپنے بھائیوں کا گوشت کھاتے رہو گے۔“

”میرے بزرگو! میرے بھائیو!“ میں نے بلند آواز سے کنا شروع کیا۔ ”بے شک میں بھٹک گیا تھا لیکن ایک مردِ حق سید برکات علی شاہ نے میرا ہاتھ تھام کر میری سمت درست کر دی ہے۔ کیا مجھ سے توبہ اور کفارہ ادا کرنے کا حق آپ لوگ چھین لینا چاہتے ہیں۔ اس وفد کے لیڈر جانتے ہیں مجھے یہاں کس نے بھیجا ہے۔“

”ہاں بھائیو!“ ایک نورانی چہرے والا شخص ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”میں عبدالعلی کی ضمانت دیتا ہوں کہ اسے بھیجنے والے کی نیت پر شک نہیں کیا جاسکتا۔ عبدالعلی کیا حضرت صاحب نے تمہیں کچھ دیا ہے؟“

”جی ہاں جناب۔“ میں نے واسکٹ کی جیب سے ملفوف لفافہ نکال کر دکھایا۔ ”مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں خود یہ لفافہ مبصرین کے سربراہ کے حوالے کروں۔“

”اللہ کا نام لے کر چلی پڑو۔“ وفد کے سربراہ نے رواں گی کا اعلان کیا۔ ”سنو۔ کوئی شخص مشتعل نہیں ہو گا۔ حکومت اور فوج یہی چاہتی ہے کہ ہم مشتعل ہو کر ان کو گرفتاری کا جواز فراہم کر دیں۔ ہمیں ہر صورت صبر و تحمل کے ساتھ منزل تک پہنچنا

چھپ کر جینے میں کوئی مزہ نہ تھا۔ انوکھی بھی یہی خواہش تھی کہ کچھ کر کے مرنا چاہیے۔ عبداللہ نے تقریباً ایک گھنٹے بعد مجھے آئینہ دیا تھا۔ میں اپنی صورت دیکھ کر عبداللہ خان کی مہارت کا لوہا مان گیا تھا۔ وہ یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا تھا کہ اس نے مجھے اصل عبدالعلی بنا دیا تھا مگر فوٹو اور میرے چہرے میں ننانوے فی صد مشابہت تھی۔

جب معاینے اور بریفنگ کے لیے مجھے شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا تو انہوں نے تنقیدی نگاہوں سے مجھے گھما پھرا کر جائزہ لیا۔ عبداللہ خان ساتھ تھا۔ شاہ صاحب کی ہدایات پر وہ فائنل ٹک دیتا رہا۔ ساتھ ساتھ شاہ صاحب کچھ عبدالعلی سے متعلق معلومات بہم پہنچاتے رہے اور کچھ مبصرین سے زبانی بات چیت کے پوائنٹس بتاتے رہے۔ انہوں نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ گورنر کشمیری مسلمانوں کے روپ میں احتجاجی جلوس بھی بھیج سکتا ہے جو وفد اور مبصرین کے درمیان رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کرے گا۔ یہ ان کا ذاتی اندازہ تھا یا باہر سے آنے والی معلومات تھیں۔

مجھے منزل کا نشان بتا کر شہر کے قریب ڈراپ کر دیا گیا۔ وفد کو مولوی عبدالرشید کی مسجد سے روانہ ہونا تھا۔ مسجد اور وہاں کا چپہ چپہ میرے لیے گھری گلی جیسا تھا لہذا میں گلیوں، سڑکوں اور پھر گلیوں میں سفر کرتا ہوا جب مسجد کے سامنے پہنچا تو دیکھا تیس چالیس نقاب پوش خواتین کا جلوس مسجد کے سامنے سینہ کو بی کر رہا تھا۔ کتے اور بیٹرز پر ان کے مطالبات درج تھے۔

”غیر ملکیو! واپس جاؤ۔ ہم کسی کو دخل اندازی کی اجازت نہیں دیں گے۔ کشمیری صرف امن و سکون کے ساتھ جینا چاہتے ہیں۔“ ایسے ہی نعرے بھی گونج رہے تھے۔ حضرت شاہ صاحب کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا خواتین میں شاید چند غدار گھرانوں سے تعلق رکھنے والی ہوں گی باقی کرائے کی ہندو خواتین تھیں۔ وہ وفد اور مبصرین کے درمیان آن کھڑی ہوئی تھیں۔

ابھی میں آگے بڑھنے یا رک کر وفد کا انتظار کرنے کا فیصلہ بھی نہ کر سکا تھا کہ ایک ٹرک خواتین کے عقب میں رکا اور ایک دم فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں دوڑ کر درخت کی آڑ میں چلا گیا تھا۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ٹرک گرداڑا ہوا واپس چلا گیا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا مجھے کوئی لاش دکھائی نہ دی البتہ بہت سی خواتین زخمی تھیں اور

ہے۔“

”جناب۔“ ایک فوجی نے دروازے میں آکر آواز دی۔ ”وند کے لیے ڈی سی صاحب نے گاڑی بھیجی ہے۔“

”ہاں“ میں نے ملاقات کے دوران گاڑی کی درخواست کی تھی۔ ”سربراہ نے بتایا۔“

”چلے اب کم از کم سول انتظامیہ کی حمایت ہمیں حاصل ہو چکی ہے۔“

مسجد کے سامنے جہاں کچھ دیر پہلے خواتین جمع تھیں وہاں ویگن اور دو فوجی ٹرک کھڑے تھے۔ ٹرکوں پر فوجی مارٹر گنوں کے ساتھ چوکے تھے۔ دس رکنی وند کو ویگن میں بٹھایا گیا۔ ایک فوجی گاڑی آگے اور ایک پیچھے ہو گئی تھی۔ ڈرائیور کے ساتھ سادہ لباس والا بیٹھا تھا یقیناً انٹیلی جنس کا آدمی تھا اس لیے سب کے ہونٹوں پر چپ کی مرلگ گئی تھی۔ ویسے آنکھوں آنکھوں میں ایک خدشے کا اظہار ہو رہا تھا کہ یہ لوگ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں؟ پھر جب ویگن نے راستہ تبدیل کیا تو وند کے سربراہ نے چپ کی مہر توڑتے ہوئے احتجاجی انداز میں پوچھا۔

”ہمیں جس ہوٹل کا نام بتایا گیا ہے اس کا یہ راستہ تو نہیں۔“

”ہاں۔“ سادہ لباس والے نے پلٹ جواب دیا۔ ”آپ بریفنگ کے لیے پہلے ڈی سی صاحب سے ملاقات کریں گے۔“

حکم حاکم مرگِ مفاجات کے تحت سب کو راضی ہونا پڑا تھا۔ ملاقات پر پتا چلا کہ موصوف مسلمان نام کے لیکن ملازم بڑے کام کے ہیں۔ ہر حکومت اور غاصب کو ایسے وفادار مل جاتے ہیں۔ برصغیر کی تاریخ کا کوئی باب ایسے وفاداروں سے خالی نہیں ہے۔ سراج الدولہ، ٹیپو سلطان اور آخری تاج دار بہادر شاہ ظفر کی شکست کے اسباب میں ایسے ہی لوگ شامل تھے۔

”دیکھیے۔“ ڈی سی بڑی نرم اور چالو سانہ آواز میں بولا۔ ”ہر گھر میں کوئی نہ کوئی تنازعہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی گہرے دوستوں کے درمیان بھی غلط فہمی کی چنگاری سلگ اٹھتی ہے۔ وادی کی صورت حال بھی ہمارے اپنے گھر کا معاملہ ہے۔ ہمارے درمیان پاکستان نے غلط فہمی کا بیج بو دیا ہے۔ یہ سب عارضی ہے۔ آپ سب ماشاء اللہ عاقل اور تجربہ کار ہیں۔ کیا ہم اپنے گھر کے راز دوسروں کو بتاتے ہیں۔ یہ لوگ تماشا دیکھنے آئے ہیں۔ لوگوں

کے دیکھنے سے آگ نہیں بجھا کرتی۔ لہذا میرا مخلصانہ مشورہ ہے اپنے گھر کی بات اپنے تک ہی محدود رکھئے گا۔ سوچئے اب کسی مہاراجا کی حکومت نہیں ہماری اپنی حکومت ہے۔ جس طرح پاکستان میں کشمیریوں نے اپنی الگ حکومت تشکیل دے رکھی ہے۔ کیا وہ حکومت پاکستان سے مالی امداد نہیں لیتی۔ جو کچھ دیتا ہے وہ کچھ لینے کا بھی حق رکھتا ہے۔ ہمیں اگر انڈین گورنمنٹ کی سپورٹ حاصل تھی تو بدلے میں ہمیں اپنی وفاداری اسے دینا چاہیے تھی۔ جو ہم نہیں دے رہے، بس یہی ہمارے درمیان ایک تنازعہ ہے اور یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جسے ہم مل بیٹھ کر طے نہ کر لیں۔“

”یہی تنازعہ نہیں ہے جناب۔“ ہمارے سربراہ بول پڑے۔ ”تنازعہ آزادی کا ہے۔ ہم سپورٹ نہیں بلکہ ووٹ کا حق مانگتے ہیں۔ ہمیں مالی امداد نہیں بلکہ مکمل آزادی چاہیے، جس طرح خود بھارت سرکار آزاد اور خود مختار ہے۔ کیا بھارت سرکار روس یا امریکا سے کوئی تعلق اور معاہدہ کرتے وقت ہم سے یا کسی دوسری حکومت سے اجازت لیتی ہے؟ بس ویسی ہی آزادی کا حق ہمیں ملنا چاہیے۔“

”میں آپ کی بات تسلیم کرتا ہوں۔“ ڈی سی نے کڑے تیور دیکھ کر کروٹ بدلی۔ ”لیکن آزادی کے سیاسی ماحول اور عمل کو تو سازگار بنائیں۔ اسرائیل اور فلسطین کی مثال سامنے رکھیں۔ ان لوگوں نے جب تک بغاوت اور جنگ و جدل کا راستہ اپنائے رکھا نقصان اٹھاتے رہے پھر جب سیاسی عمل کے تحت اپنا رویہ لچک دار بنایا تو ان کو کچھ نہ کچھ دے دیا گیا ہے۔ ہمیں بھی دوستی اور امن کی فضا میں مرحلہ وار آزادی کی جانب سفر کرنا چاہیے۔ میں کچھ بیدار مغز لوگوں کو وند میں دیکھ رہا ہوں۔“ ڈی سی نے مسکرا کر میری جانب دیکھا۔ ”اگر آپ حلیفہ وعدہ کریں کہ بمصرین کو بڑھا چڑھا کر صورت حال نہیں بنائیں گے تو میں اجازت دے دوں گا۔ بصورت دیگر.....“

”سنئے جناب!“ ایک صاحب چیخ کر بولے۔ ”ہمیں سیکیورٹی فورسز کمان اور گورنر کی طرف سے اجازت دی جا چکی ہے۔ ہم کوئی وعدہ نہیں کریں گے۔ ہم کوئی بات نہیں کریں گے بلکہ ایک درخواست پیش کریں گے کہ بمصرین کو ساحل پر بیٹھ کر تماشا نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ اس آگ کے سمندر میں اتر کر دیکھیں۔ اس آگ میں کشمیری مسلمانوں کا کیا کچھ جل چکا ہے اور کیا جلایا جا رہا ہے۔ اگر آپ کی آنکھوں پر اس عمدے کی پٹی

بندھی ہوئی ہے تو ہم دوسروں کو بھی اپنے جے ہوئے گھر، لٹے ہوئے دامن اور مارچرز سیلوں میں گلتے سڑتے کشمیری نہ دکھائیں۔ ہم ان کو گھسیٹ کر باہر لانا چاہتے ہیں۔“

”مسٹر عبدالعلی۔“ ڈی سی نے دراز کھولتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ ”یہ آرڈر پڑھ کر ان احمقوں کو سنائیں۔“

”نہیں، یہ غدار ہمارا سربراہ نہیں ہے۔“ ایک نوجوان نے اٹھ کر ڈی سی کے ہاتھ سے لفافہ جھپٹنا چاہا تھا لیکن ڈی سی نے ہاتھ پیچھے کر لیا تھا۔ ساتھ ہی اس نے کال بیل بجا کر پولیس گارڈ کو اندر بلا دیا۔

”اگر کوئی اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش کرے تو میرا حکم ہے اسے گولی مار دی جائے۔“ گارڈ نے فوراً رائفلوں کا رخ ہماری طرف کر دیا تھا۔ ”ہاں مسٹر عبدالعلی۔ میں نہیں پوچھوں گا تم کہاں تھے اور اب ان احمقوں کے درمیان کیوں ہو۔ تم ایک اچھے قانون دان اور سیاست دان ہو۔ یہ آرڈر پڑھ کر ان کو بتاؤ، ڈی سی وہی کرتا ہے جو اسے اوپر سے کہا جاتا ہے۔“

اس نے لفافہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے لفافے کے اندر ٹائپ شدہ خط نکال کر پڑھا۔

”آرمی جنرل ہیڈ کوارٹر، رور گورنمنٹ آف انڈیا نے فیصلہ کیا ہے کہ کسی کشمیری مسلمان اور وفد کو غیر ملکیوں سے ملنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اگر کوئی وفد سکیورٹی فورس کے نمائندہ آفیسر اور ڈپٹی کمشنر کی نگرانی میں ملنا پسند کرے تو اس بات کا یقین کرایا جائے کہ مبصرین سے کوئی ایسی بات نہ کی جائے جس سے بھارت بین الاقوامی طور پر بدنام ہو جائے۔“

میں نے خط سنا کر وفد کے سربراہ کی جانب دیکھا۔ وہ دانتوں پر دانت جمائے کچھ سوچ رہا تھا۔

”سر۔“ میں نے لفافہ واپس کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے وفد کے سربراہ سے تنہائی میں چند باتیں کرنے کی اجازت دی جائے۔“

”ہاں، ان کو بتاؤ ضد کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا۔“

چونکہ وہاں پولیس کا پہرا تھا اس لیے کوئی بھی نہ بولا تھا میں نے سربراہ کو اشارہ

کیا اور ڈی سی کے ریٹائرنگ روم میں چلا گیا تھا۔

”میری نیت پر شک نہ کیجئے گا۔ میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں میں آپ کا خیر خواہ ہوں، اگر ہم نہ مانے تو یہ لوگ ہمیں حراست میں لے لیں گے۔ میں تجویز دوں گا کہ مجھے اور آپ کو فوجی آفیسر اور ڈی سی کی نگرانی میں ملنے دیا جائے۔ میرے ساتھ ایک جامع رپورٹ ہے۔ میں کسی نہ کسی طرح مبصرین تک پہنچا دوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ گہری سانس لے کر بولے۔ ”کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔“ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور مسکراتا ہوا باہر نکل آیا تھا۔

☆-----☆-----☆

ملازمت کا لعتی پنا جب محلے سے اتار پھینکا تو ایک واضح تبدیلی محسوس نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کے اثرات رگ و پے میں سرایت کر گئے تھے۔ عموماً ایکس ملازمین کے ساتھ مالی تبدیلی ہوتی ہے مگر میرے اندر اتنی اکھاڑ پچھاڑ ہوئی تھی کہ ذات کا سارا نظام متاثر ہوا تھا۔ ایک تبدیلی سوچ میں بھی آئی تھی۔ میری سوچ میں جنگل میں رہنے والے درندے کی خورج گئی تھی۔ درندہ جو مارتا بھی ہے اور خود کو دشمن سے بچاتا بھی ہے۔ کچھ سیاست کے جراثیم بھی داخل ہوئے تھے۔ ایک کامیاب سیاست دان حال کے آئینے میں مستقبل بنی بھی کر سکتا تھا۔

میں نے بھی اسی آئینے میں آنے والے لمحات کا عکس دیکھ لیا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وفد کو روکنے کے لیے سول اور فوجی انتظامیہ آخری حد تک جانے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ مجھے بھیجنے والے دور تھے۔ میری فوری مدد کرنے سے قاصر تھے۔ جو کچھ کرنا تھا مجھے خود ہی اپنا دفاع کرنا تھا۔ میں نے ایک چٹ اٹھائی اور معذرت کرتا ہوا ہاتھ روم میں چلا گیا۔ ہاتھ روم کے ساتھ پی اے کا کمرہ تھا، اگر میں اپنی اصلی صورت میں ہوتا تو پی اے اکرم مجھے پہچان لیتا وہ میرا گہرا نہ سہی مگر دوست تھا۔ میرے گہرے دوستوں کا وہ گہرا دوست تھا، ہم کئی بار مل چکے تھے۔ مجھے اکرم کے بارے میں یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، غلام اور آزاد کچھ بھی نہ تھا۔ وہ صرف ابن الوقت اور پیسے کا بندہ تھا۔ میں ہاتھ خشک کرتا ہوا ہاتھ روم سے نکل کر پی اے کے آفس میں داخل ہوا۔ اس نے ریسیور کان سے لگایا ہوا تھا۔ اس کی نگاہیں انھیں۔ میں نے شناسائی کی مسکراہٹ دیکھ لی۔

میں میک اپ میں یقیناً سرکاری سطح پر معروف شخص تھا۔

”جنرل آن دی لائن سر۔“ اس نے اپنے ہاس کو اطلاع دی۔ پھر ٹیلی فون سیٹ کی تاب چھوڑ کر میرے لیے نیم استادہ ہوتا ہوا بولا۔ ”آپ کو دوبارہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔“ میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ ”بیٹھے۔“ اس نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”آپ یقیناً انڈیا کی طرف گئے ہوں گے۔ سیاسی موسم کیسا ہے ادھر؟“ میں نے اس کے قلم دان سے پنسل نکال کر ڈی سی کے نام پیغام تحریر کیا اور اکرم کے سامنے چٹ پر رکھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

”اگر صاحب اجازت دیں تو میں کشمیریوں کی نمائندگی کر سکتا ہوں۔“

”گڈ۔“ تحریر پڑھ کر اکرم نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”آپ کو وقت سے فائدہ اٹھانا خوب آتا ہے۔ میں صاحب سے بات کروں گا۔ آپ کی ملاقات یقیناً گورنمنٹ کے کاز کو تقویت دے گی۔“

اس نے چٹ لی اور اندر چلا گیا۔ ابھی اکرم کا ہٹایا ہوا پردہ ہلکورے لے رہا تھا کہ ایک نوجوان چوکڑی بھرنے کے انداز میں اندر داخل ہوا۔

”مولوی صاحب نے کہا ہے آپ واپس نکل آئیں۔ حالات بدل چکے ہیں۔ میری گاڑی باہر کھڑی ہے۔ جلدی کریں۔“

”مولوی صاحب تک میرا پیغام پہنچا دو“ میں اپنا مشن مکمل کر کے آؤں گا۔ میں نے حالات کو اپنی مٹھی میں بند کر رکھا ہے۔ تم واپس چلے جاؤ۔“

”وند کو حراست میں لے لیا گیا ہے۔“ اس نے بے قرار لہجے میں بتایا۔

”میں جانتا ہوں۔“ میرا جواب تھا۔ ”تم دیکھ رہے ہو۔ میں آزاد ہوں۔“

اس نے گہری سانس لی اور کندھے اچکاتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ ایک منٹ بعد اکرم مسکراتا ہوا آفس میں آیا اور گزرتے ہوئے میرے شانے پر تھپکی دے کر بولا۔

”یو آر کئی مین عبدالعلی“ صاحب نے تمہاری تجویز کو آرمی ہیڈ کوارٹر تک بڑھایا ہے وہ جنرل سے بات کر رہے تھے۔ ابھی آرمی والے تمہیں منزل تک پہنچانے آئیں گے۔“

”میں کشمیریوں کا سچا ہی خواہ ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن احقر لوگ مجھے غدار

کہتے ہیں۔ کیا ملک میں امن و امان چاہنا غدار ہے۔ آخر ہمارے باپ دادا انگریزوں کی حکومت میں بھی خوش رہے تھے پھر ہم انڈین گورنمنٹ کو کیوں تسلیم نہیں کرتے۔ خون خرابے میں قوم کی بھلائی نہیں ہے۔“

”یہی تو میں کہتا ہوں۔“ اکرم بول پڑا۔ ”لیکن کچھ شریسنند دہشت گردی میں ہی اپنا مفاد سمجھتے ہیں۔ کسی نے میرے دروازے پر چاک سے لکھا ہے، ”بھارتی کتے وادی چھوڑ دو۔“

”میں بھی ان دہشت گرد نوجوانوں سے گھبرا کر بھاگ گیا تھا۔“

”میں نے آپ کے لیے سفارش کی ہے۔“ اکرم نے بتایا ”اگر کوئی خطرہ محسوس کریں تو مجھے بتائیے گا۔“

سرخ بلب روشن ہوا تو اکرم نے انٹرکام کا بٹن دبا کر ریسیور اٹھا لیا۔ ”یس سر..... اوکے سر.....“ اس نے میری جانب دیکھا۔ ”آئیے۔“

ڈی سی آفس میں انتظامیہ جھاڑو پھیر کر جا چکی تھی تمام کرسیاں خالی تھیں۔ ڈی سی کسی بڑے سے ٹیلی فون پر باتیں کر رہا تھا۔ اس نے ہاتھ سے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا میں ”شکریہ“ کہہ کر بیٹھ گیا۔

”نہیں سر، نہیں۔“ آزمایا ہوا مرہ ہے۔ آپ بالکل چٹانہ کریں میں اپنی ذمہ داری پر رسک لے رہا ہوں۔“ ریسیور رکھ کر ڈی سی نے میری تحریر کردہ چٹ اٹھائی اور عینک اتار کر چند کھپائی آنکھوں کو نشوونما سے صاف کیا اور پھر بولنے لگا۔ ”عبدالعلی! چیف

سیکرٹری اور ایریا کمانڈر تمہاری وفاداری اور آفر پر بے حد خوش ہیں اور تمہیں ہر قسم کا تحفظ فراہم کرنے کی پیشکش کر چکے ہیں۔ دیکھو میرے دوست جس کے ہاتھ میں لاٹھی

ہوتی ہے وہی بھینسوں کا مالک ہوتا ہے، اگر شورش اور نفرت سے آزادی حاصل ہو سکتی تو

برصغیر پر انگریز اتنی مدت حکومت نہ کرتے۔ حکومت بہر طور طاقت ور کا ہی حق ہے۔ اسی لیے ہم جیسے لوگوں نے طاقت کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس وقت جن لوگوں نے

آخری مغل تاجدار کا ساتھ دیا تھا آج ان کی نسلیں بھی ذلت آمیز زندگی بسر کر رہی ہیں اور جن دور اندیش لوگوں نے آنے والے وقت کو پہچان لیا تھا آج انڈیا اور پاکستان میں

سیاہ و سفید کی مالک ان ہی لوگوں کی نسل ہے۔ میں فوری مراعات کے لیے تمہاری

جاؤں گا، اگر مجھے انتظامیہ نے اجازت اور سہولت دی تو ان لوگوں کو وادی میں گھماؤں گا۔ ان سے ایسے لوگ ملیں گے جو دہشت گردی کی مخالفت کریں گے اور عالمی برادری سے دہشت گردی ختم کروانے کی اپیل کریں گے۔“

”میرا خیال ہے حکومت تمہاری دوسری تجویز سے اتفاق نہیں کرے گی۔“ ڈی سی نے سر کو نفی میں ہلایا۔ ”تم جانتے ہو میں بھی اس تلخ حقیقت سے انکار نہیں کروں گا کہ کشمیری قوم آزادی کی جنگ لڑ رہی ہے، اگر غیر ملکی مہمانوں کو باہر لے جایا گیا تو ہم ان کی آنکھوں پر پٹی نہیں باندھیں گے، ان کی سماعتوں پر کوئی پھرا نہیں ہو گا تو وہ جلتے ہوئے گھروں کو دیکھ سکیں گے اور فریاد کنال لوگوں کو سن لیں گے۔ نہیں عبدالعلی۔ یہ حماقت نہ کرنا بس ان کو کسی طرح باور کراؤ کہ وادی میں پاکستانی دہشت گرد گھسے ہوئے ہیں۔“

”بہتر سر۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں اپنی سی کوشش کروں گا، لیکن آپ کو جہانگیر والا معاملہ یاد رکھنا ہو گا، اس طرح میرا معاشی مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور مجھے کھل کر کام کرنے کی سہولت بھی ہو گی۔“

”میں آج ہی بات کر لوں گا۔“ ڈی سی بولا۔ ”تم راجلے پر ہی رہنا۔“

شیطان کے ذرائع اور شیطانت کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہ تھی لیکن مجھے یہ امید نہ تھی کہ سبزی خور بنیا ذہن اس قدر بیدار ہو گا۔ بھارتی فوجیوں کے قصے کہانیاں سنا کرتا تھا اور میری رائے دوسروں سے مطابقت رکھتی تھی کہ بھارت کی اعلیٰ فوجی قیادت میں عیاش اور بد قماشوں کی شرح زیادہ ہے لیکن اس دن جس سیاسی شعور کا ثبوت اعلیٰ فوجی قیادت نے دیا تھا مجھے اپنی رائے بدلتی پڑی تھی۔

سادہ لباس میں بہترین بولنے والے فوجیوں کا ایک نمائندہ وفد ترتیب دیا گیا تھا۔ ڈبل ڈول اور چروں کی ملامت اور سرخی سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ سارے لوگ آفسر تھے۔ البتہ مجھے وفد کی سربراہی ملی تھی شاید میری سفارش ڈی سی نے کی ہو گی یا کئی دوسری وجہ رہی ہو گی۔

تعارف ہی نہیں بلکہ تعارفی پریڈ اس وقت تک جاری رکھی گئی تھی جب تک فرداً فرداً میں نے ہر ایک کو مخاطب نہ کر لیا تھا۔ دس افراد میں صرف دو ہندو اور ایک سکھ نال تھا باقی اگر ہندو تھے تو نام مسلمانوں کے لے کر آئے تھے۔ وہ متوازن وفد وادی کی

سفارش کروں گا۔ حکومت تمہیں وفاداری کے صلے میں بہت کچھ دے گی، اگر چاہو گے تو تمہیں دو چار ایجنسیاں الاٹ کر دوں گا۔ میں نے کل ہی چند مسلمانوں سے سینٹ کی ایجنسیاں واپس لی ہیں۔“

”آپ کے جذبات کا شکریہ ادا نہ کرنا میرے نزدیک پرلے درجے کی احسان فراموشی ہو گی۔“ میں نے مضبوط اور ممنون آواز میں بولنا شروع کیا۔ ”لیکن میں کسی لوجھ لالچ کی خاطر حکومت کا ساتھ نہیں دے رہا۔ اگر آپ نے احسان کرنا ہے تو حکام تک میری آواز پہنچا دیں کہ میں صرف اور صرف وادی میں لگی ہوئی آگ بجھانا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے میری قوم بھارت سرکار کی سرپرستی میں ترقی کرے، سکون سے رہے۔ ایک بات اور عرض کر دوں سر، کہ دہشت گردوں سے مجھے کوئی بچا سکتا ہے تو وہ صرف میری اپنی ذات ہے۔ میں چاہتا ہوں میں ایک ایسے مفرور پولیس آفیسر کا میک اپ کر لوں جو میری ذاتی اطلاع کے مطابق پاکستان فرار ہو گیا ہے۔“

”اوہ۔“ ڈی سی چونک پڑا۔ ”تم یقیناً انسپکٹر جہانگیر کی بات کر رہے ہو۔“

”بس سر۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”میں پرسوں انڈیا سے آیا ہوں۔ جہانگیر سے میری ملاقات بالکل اتفاقیہ ایک ہوٹل میں ہوئی تھی۔ ہم پہلے ہی ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ وہاں جب وہ ملا تو اس کے ساتھ ایک خاتون بھی تھی مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ منحرف ہو چکا ہے، پھر ”را“ کے ذرائع سے معلوم ہوا کہ جہانگیر ”را“ کی ایک اہم آفسر انو کے ساتھ پاکستان چلا گیا ہے۔ وہ ادھر آنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا، اگر مجھے بالکل خفیہ طور پر اس کا میک اپ دے دیا جائے اور واپس سروس میں لے لیا جائے تو میں پولیس کی یونیفارم میں حکومت کی بہتر خدمت کر سکتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ ڈی سی نے کہا۔ ”میں ڈپٹی جنرل سے اس معاملے پر بات کروں گا۔ اب ہمیں مطلب کی باتوں کی طرف آنا چاہیے۔“

”مجھ پر اعتماد کیا جانا چاہیے سر۔“ میں نے باوثوق لہجے میں کہا۔ ”میں ایک فری لانسر صحافی کی حیثیت میں ان سے ملاقات کروں گا اور ان کو یقین دلاؤں گا کہ ایک مفاد پرست سیاسی ٹولہ پاکستان سے بھاری معاوضہ لے کر دہشت گردی میں مصروف ہے۔ میں ان سے دوسری ملاقات کے لیے بھی وقت لوں گا اور اپنے ساتھ نوجوان نسل کا وفد لے

نمائندگی کرنے گیا تھا۔

ایک منی بس جب ایک قلعہ نما عمارت کے سامنے جا کر رکی تو میں نے اس عمارت کو فوراً پہچان لیا تھا۔ وہ خفیہ پولیس اور بی ایس ایف کے مشترکہ انٹیروگیشن سینٹر کی عمارت تھی جسے غیر ملکی مبصرین کے لیے خالی کروایا گیا تھا۔

ہمیں ایک انسپکٹر نے استقبال ہال میں روک لیا تھا۔ اس نے بتایا کہ مقامی اخبارات کے کئی ایڈیٹر بھی آئے ہوئے ہیں۔ قوے کی ایک ایک پیالی تین خوش رو لڑکیوں نے سامنے رکھی تھی۔

جب ایڈیٹرز ہال سے گزرے تو میں یہ دیکھ کر دانت پیس کر رہ گیا کہ یہاں بھی ہندو ذہنیت نے عیاری سے کام لیا تھا۔ ان میں ایک بھی شخص مسلمان نہ تھا۔ یقیناً مسلم ایڈیٹرز کی جگہ ہندوؤں نے لی تھی۔

اجازت ملی تو میں ساتھیوں سے ”ابھی آیا“ کہہ کر جانی پہچانی راہ داری سے گزرتا ریکریشن ہال میں داخل ہوا۔ وہ سب کانفرنس ٹیبل پر بیٹھے کچھ لکھنے اور کچھ پینے میں مصروف تھے۔ میں اپنی چال اور کامیابی پر خوش تھا لیکن حکومتی ترجمان سے مل کر سارا جوش اور خوشی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی۔ انگریزی اور فرنچ کے دو ترجمان تھے۔ ایک سادہ لباس میں فوجی آفیسر تھا جو لا تعلق سادہ اور بیٹھا ہوا تھا۔

”آپ لوگ آرام کریں۔“ میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”میں کشمیری زبان کو بھی اگر شمار کروں تو سات زبانوں کا ماہر ہوں۔“

”پھر بھی ہماری موجودگی ضروری ہے بلکہ مجبوری ہے۔“ ایک نوجوان نے جواب دیا۔

”بہتر ہو گا آپ اپنے بڑوں سے پوچھ لیں۔“ میں نے لہجے کو نرم ہی رکھا تھا۔ ”بہتر ہو گا ڈی سی صاحب سے رابطہ قائم کریں۔ مجھے اوپر سے یہی ہدایت ملی ہے کہ مبصرین کو آزادی تقریر و تحریر کا یقین دلایا جائے۔“

دونوں نے الگ جا کر مشورہ کیا اور پھر مجھے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ میں نے آرمی آفیسر کو کرسی سے اٹھتے دیکھا مگر اس کی مداخلت سے پہلے اندر داخل ہو گیا تھا۔ ساتوں سے فرداً فرداً ہاتھ ملایا اور اپنا تعارف کروایا تھا۔ وہ مشرقی سمت ایک قطار

میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ کراہی نہیں بلکہ پوری عمارت ”بمبڈ“ ہو گی اور دور کئی کان اور آنکھیں اس کے اندر باہر کا حال جان رہی ہوں گی۔ میں نے استقبال ہال میں ہی ایک چٹ پر لکھ لیا تھا۔

”کشمیری قوم کا اصل وفد حراست میں لے کر ایک جعلی وفد ترتیب دیا گیا ہے جو زہیت یافتہ سیوری فورس سے تعلق رکھتا ہے۔ لہذا جو کچھ زبان سے کہا جائے گا سب جھوٹ ہو گا اگر آپ لوگ انسانیت سے مخلص ہیں تو یہ حصار توڑ کر باہر نکل جائیں“ میرے پاس مکمل رپورٹ ہے۔“

میں نے اس شخص کے ہاتھ میں چٹ دے دی تھی جس کے سامنے ایک خنثی تھی جس پر اسے وفد کا سربراہ ظاہر کیا گیا تھا مصافحہ کرتے وقت ہی میں نے چٹ دی تھی اور اس نے بھی کمال ہوشیاری سے فوراً ہاتھ نیچے کر لیا تھا۔

جب میں دوسروں سے ہاتھ ملاتا تھا تو اس نے چہرہ جھکا کر تحریر پڑھ لی تھی۔ ”مسٹر عبدالعلی! چیز میں نے پوچھا۔ ”کیا آپ تنہا آئے ہیں؟“ ”نہیں جناب۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میرے ساتھ کشمیر کا ایک وفد ہے جس میں تین بڑی قوموں کے نمائندے شامل ہیں۔“

”سب کو بلا لیجئے۔“ اس نے کہا۔ ”ہمیں بلیچ کے لیے گورنر ہاؤس جانا ہے۔“ میں جب وفد کے ساتھ ان کے سامنے بیٹھا تو ایک مقامی شخص نے ہمارے درمیان مانگ رکھ دیا۔

”کشمیری دوستو! مسٹر جان کک نے آگے جھک کر بولنا شروع کیا۔ ”ہم لوگ اس تنازعے کی اصل وجہ معلوم کرنے آئے ہیں۔ آپ لوگ انگریز دور سے اب تک مشروط طور پر آزاد رہے ہیں۔ پھر اب اس بے چینی اور تحریک یا وجوہات ہیں؟“

”تنازعہ کوئی نہیں ہے جناب۔“ میں نے اپنے وفد کی طرف سے جواب دیا۔ ”آپ نے جس مشروط آزادی کا حوالہ دیا ہے دراصل وہ ہمیں انگریزی حکومت کے بعد بھارتی حکومت کے قیام سے نصیب ہوئی ہے۔ جب کشمیر پر ڈوگرہ حکمران قابض تھے تو ہم کشمیری مسلمانوں کی حالت بھارت کے شورروں سے بھی بدتر تھی۔ مسلمان اپنی مذہبی رسومات ادا کرنے کے مجاز نہ تھے۔ اگر ہم گائے ذبح کر دیتے تو اس جرم کی سزا ہمیں

راست نکال دیا تھا ورنہ سب کی موجودگی میں میرے لیے رپورٹ پیش کرنے میں خاصی دشواری پیش آتی۔

مجھے سائڈ روم دے دیا گیا، کیرے کی آنکھ کو دھوکا دینے کے لیے میں نے ایک ورق سیاہ کیا اور ہاتھ روم میں جا کر رپورٹ کا لفاظ نکال کر بغل میں دبایا اور ہاتھ جھٹکتا ہوا سائڈ روم سے ہال میں چلا گیا۔ چیئرمین نے شکریہ کہہ کر لفاظ اپنے بیگ میں رکھ لیا تھا۔ مبصرین کا وفد اور ہم ایک ساتھ ہی عمارت سے نکلے تھے۔ ان کو لچ کے لیے جانا تھا۔ باہر کچھ رپورٹر کھڑے تھے۔ ان کو محافظوں نے روک رکھا تھا۔ انہوں نے دور سے ہی کچھ سوالات اچھالے اور فوٹو لیے تھے، میرے ذہن میں جو منصوبہ تھا اس کے لیے وہ فوٹو کار آمد تھے۔

ڈی سی نے بڑے ہی والمانہ انداز میں میرا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لے کر شانہ نہپ تھپایا تھا اس کا مطلب تھا میرا اندازہ غلط نہ تھا۔ وہاں کی رپورٹ جہاں کہیں ریکارڈ ہوئی تھی اس کی نقل ڈی سی تک پہنچادی گئی تھی۔ ”عبدالعلی۔ تم نے پھر اپنی جگہ بنالی ہے اور اپنا قد بڑھا لیا ہے۔ تم نے مختصر مگر جامع گفتگو سے مہمانوں کو متاثر کیا ہے، کمشنر صاحب اور ایریا کمائڈر نے تمہاری بڑی تعریف کی ہے۔ میں نے تمہاری تجویز بھی منظور کرالی ہے۔ آج شام چھ بجے تمہیں پولیس ہیڈ کوارٹر میں پیش ہونا ہے۔“ ڈی سی نے انٹرکام پر پی اے سے کہا کہ عبدالعلی کے لیے تعارفی خط تیار کرے۔

جب میں ڈی سی آفس سے باہر نکلا تو میری وہ حیات پوری طرح بیدار تھیں جسے نزہت نے مزید فعال بنا دیا تھا۔ ایک نیلی پیکارڈ کا ڈرائیور بڑی الجھن میں تھا کیونکہ میں پیدل تھا اور اسے میرا تعاقب کار میں کرنا تھا۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ اس کا تعلق کس سے تھا؟ اسے سکیورٹی والوں نے میری نگرانی کے لیے مقرر کیا تھا یا عبدالعلی کے لیے کسی مجاہد کمانڈر نے بلیک وارنٹ جاری کیے تھے۔

نڈار کو وہ لوگ جینے کی سہولت نہیں دیتے تھے۔ میں دن کی روشنی میں بھی ٹھہرے میں تھا، وہ جو بھی کوئی تھا میرے تعاقب میں پیدل چل پڑا تھا۔

سارے راستے ویران اور مخدوش تھے۔ مجھے اصل روپ میں جاننے والے نہ آئے کس زندان میں بند تھے اور عبدالعلی کے نام سے واقف سرکاری مشینری دفاتروں

موت کی شکل میں ملتی تھی، اگر کسی ہندو کے ہاتھوں مسلمان قتل ہو جاتا تو مہاراجا قاتل کو معمولی جرمانہ کر کے آزاد کر دیتا جب کہ اسی جرم کی سزا مسلمانوں کو موت کی شکل میں دی جاتی تھی۔ آزادی کا اصل مفہوم تو ہم نے بھارت سرکار سے سیکھا ہے۔ ہم نے یہاں اپنی حکومتیں بنائیں۔ ہم مذہبی طور پر بھی بالکل آزاد ہیں۔ اصل وجہ صرف اور صرف انڈیا پاکستان کی سیاست ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی سلامتی اور امن کو برباد کرنے کے لئے سیاسی چالیں چلتے ہیں۔ انڈیا پر الزام ہے کہ وہ پاکستان کے ایک صوبے میں عدم استحکام پیدا کرنے میں مصروف ہے۔ جواب میں پہلے پاکستان نے خالصہ تحریک کو ہوا دی۔ جب حکومت نے اس پر قابو پایا تو کچھ مفاد پرست یہاں مل گئے اور بہت سے دہشت گرد ادھر سے داخل کیے گئے۔ اب جو کچھ یہاں ہو رہا ہے اس میں کشمیری قوم شامل نہیں ہے۔ اس وفد میں مسلمان، ہندو اور سکھ شامل ہیں۔ ہم سب وادی میں امن چاہتے ہیں۔ آپ کے توسط سے ہم عالمی برادری سے اپیل کرتے ہیں۔ ہمیں سیاست کی آگ سے بچایا جائے۔“

”آپ لوگ مل کر بیرونی دہشت گردوں کا مقابلہ کیوں نہیں کرتے؟“ ایک مبصر نے سوال کیا۔

”گوئی کا مقابلہ پھر اور لاٹھی سے نہیں ہو سکتا جناب۔“ میں نے جواب میں کہا۔ ”جب حکومت نے اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے ہماری مدد شروع کی تو پاکستان نے واویلا مچا دیا کہ سکیورٹی فورسز آزادی مانگنے والوں کو پھل رہی ہیں۔ ہم احتجاجاً باہر نکلتے ہیں تو ہمارے درمیان دہشت گرد بھی کھس آتے ہیں اور امن و امان قائم کرنے والے اداروں پر گولیاں چلاتے ہیں۔ جوابی کارروائی ہوتی ہے تو احتجاج کرنے والے نشانہ بن جاتے ہیں۔ بس اسی شور شرابے کو جواز بنا کر پاکستان سیاسی فائدے حاصل کرنا چاہتا ہے۔“

”آپ وفد کے سربراہ ہیں؟“ چیئرمین نے مجھے مخاطب کیا۔ ”میں آپ کو آدھا گھنٹا دے رہا ہوں۔ جب تک آپ کے ساتھی چائے پیتے ہیں آپ ایک رپورٹ لکھیں۔ ہم واپس جا کر آپ کی رپورٹ پریس کو دے دیں گے۔“

اس نے میری درخواست منظور کر کے میرے لیے اصل رپورٹ دینے کا بہترین

پر نکل آئے تھے۔ شہر کی آبادی لحظہ بہ لحظہ دور ہوتی جا رہی تھی۔ ایک جگہ سکیورٹی گارڈ نے روکنا چاہا تھا مگر سوار نے اسے نہ جانے کیسا کارڈ دکھایا تھا کہ گارڈ نے ہیرل اٹھادیا تھا۔ تب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ واقعی مجھے حکومتی مشینری نے تحفظ دینے کا اپنا وعدہ پورا کیا ہے، میں بالکل مطمئن ہو گیا کہ مجھے بہر طور اب ان ہی لوگوں کے درمیان جانا تھا اور میں واپس جانے کی حماقت نہ کر سکتا تھا کیونکہ میری نگرانی ہو رہی تھی۔

پختہ سڑک سے ایک کلومیٹر مشرق کی جانب پہاڑی نالے کے کنارے کنارے خانہ بدوش کی بستی دور تک دکھائی دے رہی تھی۔ موٹر سائیکل کچے راستے پر اچھلی کودتی ایک جھگی کے سامنے جا کر رک گئی تھی۔ اس نے ہارن بجایا تو جھگی کا پردہ ہٹا کر ایک خانہ بدوش لڑکی باہر آگئی۔ وہ ننگے پیر تھی۔

”سرکاری مہمان لایا ہوں۔“ میرے ہم سفر نے گوجری زبان میں کہا۔ ”ان کو کچھ وقت یہاں رہنا ہے، استاد کو میرا سلام بول دیتا۔“

”بسم اللہ بسم اللہ۔“ لڑکی بولی۔

میں نے اتر کر اپنے ہم سفر سے ہاتھ ملایا اور لڑکی نے پردہ اوپر اٹھادیا۔ میں جھک کر اندر داخل ہوا تو اندر کا منظر دیکھ کر بھونچکا سا ہو کر رہ گیا تھا۔ اندر دائرے میں چھ نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ خود کار ہتھیاروں پر میری نگاہیں جمی ہوئی تھیں کہ لڑکی نے میری پشت پر زوردار لات ماری اور میں لڑکھڑاتا ہوا دائرے کے اندر جا گرا۔

”ہم سرکاری کتوں کا ایسے ہی استقبال کیا کرتے ہیں۔“ میں نے لیٹے لیٹے جب چہرہ اٹھایا تو کسی طرف سے مردانہ آواز سنائی دی پھر ایک نوجوان نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور جھٹکا دے کر مجھے بٹھا دیا۔ ”ہمارے پاس اتنا وقت ہے کہ تمہیں تمہارے جرائم کی فہرست سنائی جائے، تمہیں صفائی اور گواہی کے لیے وقت نہیں دیا جاسکتا کیونکہ تم پاگل کتے ہو۔ انسانیت کے لیے خطرناک، ابو خالد، اس درندے اور بھارتی غلام پر فرد جرم عائد کرو۔“

ایک نوجوان نے ایک میلا سا کاغذ کھول کر سامنے رکھ لیا اور مجھے دو آدمی دھکیل کر جھگی کی دیوار تک لے گئے۔

”19 مارچ،‘ مہمند گاؤں کے جن تین مکانوں کو گن پاؤڈر چھڑک کر نذرِ آتش کیا

میں مصروف کار تھی اور میں ایک انجانے دشمن یا دوست کے رحم و کرم پر سڑکوں اور گلیوں کی خاک چھان رہا تھا۔

بسوں کے اڑے پر خوب چل پھل تھا۔ وہاں مسافر، پولیس والے اور فوجی ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ مجھے کسی ایسی ہی جگہ کی تلاش تھی جہاں دشمن وار کرنے سے پہلے کئی بار سوچے اور دوست دست گیر بن سکے۔ میں کورے منکے سے پانی پی کر واپس پلٹا ہی تھا کہ ایک بھکارن سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا۔

”بتول کی ماں مر گئی تھی۔ تمہاری دوست ہاپٹل میں ہیں۔“ بھکارن بڑبڑاتی ہوئی منکے پر جھک گئی تھی۔

میں نے شیروانی کی جیب سے رومال نکال کر ہاتھ منہ صاف کیے اسی وقت ایک نیا رکشا لیڈیز ویٹنگ روم کے سامنے آکر رکا اندر سے تین لڑکیاں اتریں۔ تینوں ہندو تھیں۔ جوں ہی کرایہ دے کر وہ ویٹنگ روم میں داخل ہوئیں، میں لپک کر رکشے میں بیٹھ گیا۔

”تم لیٹر بکس والے موٹر پر میرا انتظار کرو گے کرایہ اور انعام الگ دوں گا۔ کوئی پوچھے تو کہنا کرایہ طے نہیں ہوا۔“ میں دوسری طرف سے نیچے اترتا ہوا ڈرائیور کو برا بھلا کہتا ہوا چل پڑا۔

وہ جو میری وجہ سے بے کار ہو کر پیدل خوار ہو رہا تھا اس نے مجھے پھر پیدل دیکھ کر یقیناً گالی دی ہوگی۔

ایک موٹر سائیکل چرچاتی ہوئی چند قدم میرے آگےڑکی، ٹڈ گارڈ پر رجسٹریشن نمبر، پلیٹ کے اوپر انگریزی میں ”پولیس“ لکھا ہوا تھا لیکن سوار سادہ لباس میں تھا۔

”عبدالعلی۔ آپ خطرے میں ہیں۔ دہشت گرد آپ کے تعاقب میں ہیں۔ جلدی بیٹھ جائیے۔“ میں جلدی سے اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ ”مجھے اوپر بے حکم ملا ہے کہ آپ کو شر سے باہر محفوظ جگہ پہنچا دوں۔“

”لیکن میں ایک گھنٹے سے پیدل گھوم رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”پھر مجھے.....“

”اس لیے کہ ان کو ایسی جگہ نہیں ملی تھی۔“ اس نے میری بات کاٹ کر جواب دیا۔ ”مصروف جگہوں پر وہ حماقت کر کے خود بھی بچ سکتے تھے۔“

اس نے ایسے شارٹ کٹ راستے اختیار کیے تھے کہ دس منٹ بعد ہم بارہ مولا روڈ

گیا تھا ان میں ہمارے مجاہدین نے ایک رات قیام کیا تھا۔ تمہارا مکان محمد رمضان شہید کے مکان کے سامنے ہے۔ تم نے بھارتی غنڈوں کو اطلاع دی۔ یعنی تم نے ایک خاندان کے پانچ افراد کو زندہ جلایا پھر 20 مارچ کو تمہیں اسلام آباد کے گاؤں منی واڈا میں بھارتی کتوں کے ساتھ دیکھا گیا اور اسی رات فوجیوں نے سفاکی سے عبداللہ ڈار کے دو بیٹوں اور ایک ملازم کو فزع کر دیا اور دو خواتین کو تم نے گھسیٹ گھسیٹ کر گلی میں کھڑے فوجی آفیسرز کے حوالے کیا تھا۔

”بس۔“ ایک شخص نے ہاتھ اٹھایا اور نوجوان نے کانڈ پلیٹ کر جیب میں رکھ لیا۔ ”میں تمہیں تمہارے اس نام سے مخاطب نہیں کروں گا جو تمہارے والدین نے رکھا تھا۔ تمہاری غلیظ ذات اس واجب تکرم نام کے قاتل نہیں ہے۔ تم غلام زر اور غلام حکومت ہو۔ تم معصوم بچوں کے قاتل، قوم کے غدار اور مسلمان عورتوں کی عزتوں کے ڈاکو ہو۔ میرے کمانڈر نے تمہاری عدم موجودگی میں تمہیں سزائے موت سنائی تھی جس پر آج عمل درآمد ہو گا۔“

”میری تجویز ہے برادر۔“ ایک نوجوان حقارت آمیز لہجے میں بولا۔ ویسے تمام لوگ مجھے کینہ توڑ نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ ”اس گندگی کے ذہیر پر قیمتی گولی ضائع نہ کی جائے پھر ایسے درندے کو آسان موت کی سزا نہیں دینی چاہئے، اسے کسی درخت کے ساتھ زمین سے ایک فٹ اونچا لٹکا دیا جائے تاکہ گیدڑ آہستہ آہستہ اسے نوح کھائیں۔“

”ہاں، ایسا ہی کیا جائے گا۔“ کمانڈر نے جواب دیا۔ ”البتہ تعاون کے عوض اسے آسان موت دی جاسکتی ہے۔“

”میں کسی موت سے خوفزدہ نہیں ہوں۔“ میں نے نہایت پرسکون انداز میں کہا۔ ”کیونکہ میرا ایمان ہے، موت مقررہ وقت اور طے شدہ طریقے پر آتی ہے۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جلد بازی سے کام نہ لیں، اگر غدار کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت سزا دی جا رہی ہے تو اس کے قانون کا ایک حق مجھے ملنا چاہئے۔ فیصلہ آپ کر چکے ہیں، عمل بھی آپ کو کرنا ہے لیکن مجھے صفائی کا موقع دیا جائے۔“

”کیا تم اپنے جرائم سے انکار کرو گے؟“

”ہاں۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”اس لیے کہ جس عبداللہ نے غدار

کی ہے وہ شخص میں نہیں ہوں۔“

”یعنی تمہیں سرے سے عبداللہ ہونے سے ہی انکار ہے؟“

”ہاں دوستو۔“ میں نے کہا۔ ”میں عبداللہ کا ایک وقتی روپ ہوں، حضرت شاہ صاحب نے مجھے مذاکراتی وفد میں شامل کرنے کی غرض سے عبداللہ کا روپ دیا ہے، اگر آپ لوگوں میں کوئی میک اپ کا ماہر ہے تو میرے قریب آکر میری سچائی کا ثبوت دیکھ لے، میک اپ اتارنا اور خراب کرنا ہم سب کے مفاد میں نہیں ہے لہذا آپ لوگ یہ تسلی کر لیں کہ آپ کے سامنے عبداللہ نہیں بلکہ انسپکٹر جہانگیر ہے۔“

ایک لاغر سا شخص محتاط انداز میں فاصلہ رکھ کر میری پشت پر چلا گیا، اس نے دونوں ہاتھوں سے میری گردن کو ٹٹولنا شروع کیا جب اس نے دگ کا کنارہ گردن سے الگ کرنا چاہا تو میں نے اس کا ہاتھ روک دیا۔

”مت اتاریں بھائی۔ ابھی مجھے اس روپ میں ایک اہم کام کرنا ہے۔“

”بے شک۔ یہ شخص میک اپ میں ہے۔“ اس نے فیصلہ سنا دیا۔

”پھر مجھے شک نہیں رہا کہ یہ عبداللہ نہیں ہے۔“ کمانڈر نے نرم آواز میں کہا۔ ”میرے بھائی! اب ضروری ہو گیا ہے کہ تم اپنے مشن کے بارے میں تفصیل سے بتا دو۔“

میں نے سچ کم اور جھوٹ زیادہ ملا کر ان کو ایسی کہانی سنائی کہ وہی لوگ جن کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے لپک رہے تھے جو مجھے اذیت ناک موت دینا چاہتے تھے شہر و شہر ہو گئے تھے۔ کمال محبت سے مجھے اپنے درمیان بٹھا کر مدار تیں کرنے لگے۔ وہ لڑکی جس نے مجھے لات ماری تھی بڑی شرمندہ تھی اور بار بار معافی مانگنے لگتی تھی۔

”واپس شہر پہنچانا کوئی مسئلہ نہیں۔“ کمانڈر نے میری خواہش سن کر کہا۔ ”اصل مسئلہ آپ کی سلامتی کا ہے۔ جس طرح ہم نے پہچان کر آپ کو اغوا کرایا تھا اسی طرح کوئی جذباتی مجاہد آپ کو گولی مار سکتا ہے۔“

”مجھے بہر طور آج شام تک ڈی سی کے رابطے پر رہنا ہے۔“

”ابو خالد! اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”تم جہانگیر صاحب کو اپنی نگرانی میں پوائنٹ تھری پر لے جاؤ۔ وہاں ابو قاسم ہوں گے لیکن بڑی احتیاط کی ضرورت ہے کسی کو

شک نہیں ہونا چاہئے۔“

مجھے ایک ٹرک کے ذریعے شہر کے مغربی کنارے پہنچایا گیا۔ ابو قاسم نامی مجاہد نیل ماسٹر تھا۔ گلی میں اس کی دکان تھی جس میں تین لڑکے بھی کام کرتے تھے، معلوم ہوا کہ وہ لڑکے انصار تھے ابو قاسم ان کے ذریعے رابطے ملاتا تھا۔ اس کا اصل نام کرم الہی تھا۔ دکان کے پیچھے اس کا خاندان رہائش پذیر تھا۔ ابو خالد چند منٹ بیٹھ کر واپس نکل گیا تو گلی خالی دیکھ کر مجھے ایک شاگرد لڑکے کے ساتھ بغلی دروازے سے اندر بھیجا گیا۔ شک و تاریک ایک سرنگ نما راہداری عبور کر کے روشن برآمدے میں پہنچا وہاں ایک نوجوان لڑکی فرش پر ٹاکی مار رہی تھی اور ادیز عمر خاتون مشین کو تیل دے رہی تھی۔

میں نے ایک غیر فطری بات محسوس کی تھی۔ لڑکی نے ایک بار بھی میری جانب نہ دیکھا تھا حالانکہ فرش پر قدموں کی ٹانوس چاپ پر خاتون نے چونک کر گردن گھمائی تھی پھر ہمارے درمیان سلام و دعا کی رسم پوری ہوئی تھی۔ قدرتی اور غیر ارادی طور پر اس لڑکی کو نوٹس لینا چاہئے تھا لیکن وہ گھٹنوں کے بل اسی انداز میں فرش رگڑتی رہی تھی۔

”فیصل!“ خاتون بولی۔ ”سمان کو نیچے لے جاؤ۔“ میرا خیال تھا مجھے تہ خانے میں جانا پڑے گا مگر وہ مکان کی غلی منزل تھی۔ تین کمرے اور چھوٹا سامن تھا۔ کمرے میں بان کی کھری چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کچے فرش پر سگریٹوں کے ٹوٹے بکھرے ہوئے تھے۔

ایسے گندے کمرے میں رات تک بیٹھنا میرے لیے کوئی خوشگوار عمل نہ تھا لیکن مجبوری تھی مجھے مجاہدین کی نگاہوں سے ایسی ہی جگہ محفوظ رکھ سکتی تھی۔ ابھی شاگرد لڑکا اور میں کھڑے ہی تھے کہ وہی لڑکی دھم دھم کرتی سیڑھیاں اترتی نیچے آئی اور صحن میں بچھی چارپائیوں کو اٹھا کر دیوار کے ساتھ رکھنے لگی۔

”بچہ! ایک کمرہ بھی صاف کروا دو۔“ جی بات یہ ہے کہ میں اس لڑکی کو قریب سے دیکھنے کی آرزو پر قابو نہ پاسکا تھا۔ میرا ماضی ایسا ہی ہے کہ میں کوئی پارسا اور زاہد خشک کبھی نہیں رہا۔ گو حالات نے بہت سی سوچوں کو متاثر کیا تھا لیکن پرانی عادات و عینا ہی تھیں۔ سارا تصور میری رنگین سوچ کا تھا۔ مجرم اس کے گلابی اور گداز ہاتھ بھی تھے۔

”ممتاز آپا کو گئی ہیں۔“ لڑکے نے بتایا تو شوق دید ایک دم دکھ میں بدل گیا پھر جب

ممتاز واپس مڑی تو اس کا بھیانک چہرہ دیکھ کر بھرپور جھٹکا لگا۔ وہ پھر دوڑتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔ ”دیکھا آپ نے آپا کا چہرہ؟“

”ہاں۔“ میں بمشکل بول سکا تھا۔ اتنی خوش رنگ اور قد آور لڑکی سے قدرت نے کیسا مذاق کیا تھا۔ ”کیا یہ پیدائشی.....“

”ناجی۔“ لڑکانہی میں سر ہلانے لگا۔ ”پچھلے سال تک آپا کالج میں پڑھتی تھیں۔ وہاں سے اس کو فوجی اٹھا کر لے گئے تھے پھر جب استاد جی کو واپس ملی تو ایسی تھی۔ فوجی کہتے تھے کہ اس نے خود کو آگ لگائی تھی لیکن لوگوں کو یقین ہے ان حرامیوں نے آپا پر ظلم کیا ہے۔“

فیصل ممتاز کے ذکر کے ساتھ دلشاد زیتون اور رقیہ نامی لڑکیوں پر ہونے والے تشدد کے بارے میں بتانے لگا تھا اور میں کھری چارپائی پر بت بنا بیٹھا اسے سنتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا سارے فوجی اور حکمران انسانیت سے محروم ہو چکے ہیں، کیا کسی کو بھی اپنے انجام اور اپنی موت کا خیال نہیں آتا؟ ایسی سفاکی کا مظاہرہ جنگی درندے بھی نہیں کرتے۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ نئے کشمیری مسلمان جارحیت کو اپنی سرحدوں سے دھکیل سکتے ہیں۔ کیا احتجاج آزادی کی منزل حاصل کر لیں گے؟ فیصل مجھے خاموش پا کر وہاں سے چلا گیا تھا پھر نہ ممتاز آئی تھی نہ ماسٹر نے کوئی خبر لی تھی۔ میں بازو پر مرر رکھ کر سوچتے سوچتے سو گیا تھا۔ برتنوں کی آواز پر آنکھ کھلی۔ ممتاز اور فیصل تپائی پر جھکے ٹرے سے برتن نکال رہے تھے۔

”فیصل۔ لوٹا لے آؤ“ میں منہ ہاتھ دھونا چاہتا ہوں۔ ”ممتاز نے فوراً گردن گھمائی تھی حالانکہ فیصل نے بتایا تھا کہ وہ گوشتی ہے کیا وہ صرف قوت گویائی سے محروم تھی۔ اگر وہ کچھ دیر رکتی تو میں اپنا شک دور کر لیتا لیکن وہ گھبرا کر فیصل کے پیچھے ہی کمرے سے نکل گئی تھی۔ فیصل کے ذریعے میں نے ماسٹر تک پیغام پہنچایا کہ مجھے ٹیلی فون کی سولت چاہیے۔ جواب میں ابو قاسم ٹیلی فون سینٹ کے ساتھ خود آ گیا۔ چمت کی چینی سے ٹیلی فون کے تاریچے کسی نے اتارے۔ پلگ لگا کر ابو قاسم واپس چلا گیا تو میں نے ڈی سی کا دیا ہوا نمبر ڈائل کیا۔

ڈی سی کی بیگم نے کال اینڈ کی۔ ”ہولڈ پلیز۔“ کہتے ہی ڈی سی لائن پر آ گیا تھا۔

میں نے اپنا نام بتایا تو اس کا لہجہ نرم ہو گیا۔

”کہاں ہو عبدالعلی۔ میرے ذرائع نے تمہارے بارے میں تشویش ناک رپورٹ دی ہے۔“

”جلتے گھر کی ہر شے کے بارے میں تشویش ناک رپورٹ ہی ہو سکتی ہے جناب۔“ میں نے ذومعنی جواب دیا۔ ”مجھے بس اسٹینڈ سے اغوا کر لیا گیا تھا، وہاں مجھ پر مقدمہ چلایا گیا اور موت کی سزا سنائی گئی لیکن میں ان کی قید سے آزادی بھی حاصل کر چکا ہوں۔ آپ مجھے کتنی جلدی تحفظ فراہم کر سکتے ہیں یہ آپ پر منحصر ہے۔“

”لوکیشن بتاؤ میں گاڑی بھیج دوں گا۔“

”چٹان کے آفس میں ہوں۔“ میں نے بتایا۔ ”یہاں صرف چوکیدار ہے۔ باقی لوگ ابھی آنے والے ہیں آپ جلدی گاڑی بھیج دیں اور گاڑی کا نمبر مجھے بتائیں۔ میں خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔“

اس نے گاڑی کا رنگ، نمبر اور ڈرائیور کا حلیہ لکھوا دیا۔ جب میں گلیوں کے جال سے نکل کر چٹان آفس کے سامنے پہنچا تو مطلوبہ گاڑی مخالف سمت سے آتی دکھائی دی، جوں ہی گاڑی رکی میں باڈی پر ہاتھ مار کر ڈرائیور کے سامنے سے ہوتا ہوا فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”آپ کو زیادہ انتظار تو نہیں کرنا پڑا جناب!“ ڈرائیور نے کار کو ٹرن دیتے ہوئے پوچھا۔ جواب میں، میں نے نفی میں گردن ہلا دی تھی۔

ڈی سی کو میں نے ایسی کہانی سنائی کہ وہ ساری مصروفیات ترک کر کے میرے لیے وقف ہو گیا تھا۔ اس نے امیریا کمانڈر کے ایک نمائندہ اور ڈی آئی جی کو کال کر لیا تھا۔

ایک لیفٹیننٹ کرنل اور ڈی آئی جی دونوں پانچ پانچ منٹ کے وقفے سے ڈی سی کی کونٹری میں داخل ہوئے۔ ڈی سی کا پرائیویٹ سیکورٹی دونوں کو باری باری اندر لایا تھا۔

ڈی سی نے میرا خاصی تفصیل کے ساتھ تعارف کروایا اور ان کے سامنے حکومت کے لیے میری سابقہ خدمات اور آئندہ کا پروگرام رکھا۔

”لیکن یونیفارم کیوں؟“ ڈی آئی جی نے سوال اٹھایا۔ ”آپ جانتے ہیں پولیس کے اپنے فرائض ہیں۔ ہم وادی میں امن و امان قائم رکھنے کی ذمہ داری سنبھالتے ہیں۔“

ہمیں حکومت اور سکیورٹی فورسز نے جس راستے پر لگا دیا ہے اس سے پولیس بدنام ہو چکی ہے آپ چاہتے ہیں کہ اب عبدالعلی جیسے لوگ ہم اپنے درمیان لے لیں۔ معذرت کے ساتھ میں اس تجویز کی اُس وقت تک مخالفت کروں گا جب تک مجھے مطمئن نہیں کیا جاتا۔“

”عبدالعلی کی زندگی خطرے میں ہے۔“ ڈی سی نے کہا۔ ”مجاہدین کی تمام جماعتیں ان کی تلاش میں ہیں اور ایک جماعت حرکت الانصار نے ان کو سزائے موت سنا دی ہے۔ ہم اپنے وفاداروں کو اگر تحفظ نہیں دیں گے تو کل عبدالعلی جیسے لوگ توبہ کرتے مجاہدین کے پاس چلے جائیں گے۔ اگر کسی کو یہ غلط فہمی ہے کہ کشمیری قوم کو باہر سے لائی ہوئی قوت سے دبایا جائے گا تو ایسے لوگ غلطی پر ہیں۔ تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں کہ جب تک اندر سے لوگ غداری نہیں کرتے کوئی قوت کامیاب نہیں ہوتی، کیا ہندوستان پر غلبہ انگریز کی گولی نے حاصل کیا تھا۔ نہیں بلکہ میر جعفر اور میر صادق جیسے لوگوں نے انگریزوں کو کامیابی دی تھی۔ ہمیں بھی ایسے ہی لوگوں کا تعاون حاصل کرنا ہو گا۔“

”آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے؟“ کرنل نے پوچھا۔ ”کیا یہ بتانے کے لیے یہاں کی سرکاری مشینری بھی ایسے خیالات رکھتی ہے؟“

”حقیقت کو خیالات نہ کہنے کرنل۔“ ڈی سی نے جواب دیا۔ ”اس وقت باہر کا کوئی آدمی نہیں ہے یہاں اس لیے میں نے حقیقت کا چہرہ آپ کو دکھایا ہے۔“

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“ کرنل اکھڑنے لگا۔ ”آپ بتائیں آرمی اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہے؟“

”ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی سر۔“ ڈی سی نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے جنرل صاحب نے میری درخواست پر غور کیا ہو گا اور ”را“ کے نمائندے کو بھیجا ہو گا۔ اصل بات یہ ہے کہ میں عبدالعلی کو صرف محفوظ ہی نہیں کرنا چاہتا بلکہ ایک پولیس انسپکٹر جاتگیر احمد کا روپ دینا چاہتا ہوں۔“

”کون جاتگیر احمد؟“

”وہی جاتگیر احمد سر۔“ ڈی سی نے مسکرا کر ڈی آئی جی کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال دیں۔ ”جسے حکومت کی سفارش پر اعلیٰ کورس کے لیے باہر بھیجا تھا اور جس نے نہ صرف پولیس کو لات مار دی ہے بلکہ وہ انڈیا انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ ”را“ کی قیمتی چادر بھی لے گیا ہے۔ سر کیا آپ تک یہ اطلاع پہنچ چکی ہے؟“

”ہاں۔“ کرٹل بولا۔ ”اگر ڈپٹی صاحب اس شخص کو لینے سے گریزاں ہیں تو اسے میں لے جاؤں گا۔“

”تو آپ۔“ ڈی آئی جی بول پڑا۔ ”عبدالعلیٰ کو جمانگیر کے میک اپ میں ادھر رکھنا چاہتے ہیں؟“

”نہیں سر۔“ ڈی سی اپنی کامیابی پر مسکرانے لگا۔ ”اس سے پولیس کے چہرے پر لگا داغ بھی دھل جائے گا اور ”را“ اصل حالات سے باخبر ہو کر اس نفلی جمانگیر پر ہاتھ نہیں ڈالے گی۔ اس طرح عبدالعلیٰ پولیس، سیکورٹی فورسز اور سول انتظامیہ کے درمیان مضبوط پل بن جائے گا۔ حسب ضرورت تینوں اسے استعمال کر سکیں گے۔“

”کیا مجھے انتخاب کا حق دیا جاسکتا ہے؟“ میں نے اتنی دیر میں ایک فیصلہ کر لیا تھا گو اندھی چھلانگ ہی تھی لیکن بعض اوقات ایک کمانڈو کو طوفانی کالی رات کے وقت ہوائی بمپ لگانا پڑتا ہے۔

”ہاں کیوں نہیں۔“ ڈی سی نے دوستانہ انداز میں جواب دیا۔ ”تم تو مرکزی کردار ہو تمہاری رضا اور مشاورت کو ہم اہمیت دیں گے۔“

”تھینک یو سر۔“ میں نے ممنون نگاہوں سے تینوں کو دیکھا۔ ”پولیس جمانگیر احمد کا گھر ہے۔ مجھے وہی دقتیں پیش آئیں گی جو کسی اجنبی کو دوسرے گھرانے میں آتی ہیں وہاں جمانگیر کے دوست ہوں گے دشمن بھی ہوں گے ہم پتے پتے ڈالی ڈال کو اس راز میں شریک کرنے کی حماقت نہیں کر سکتے لہذا مجھے قدم قدم پر ٹھوکریں لگیں گی اس طرح یہ بھانڈا کسی بھی وقت پھوٹ سکتا ہے۔ اگر مجھے کرٹل صاحب اپنے ساتھ ”را“ میں شامل کر لیں تو میری کارکردگی کی طاقت میں اضافہ ہو گا۔“

”کیا جمانگیر کے میک اپ میں؟“ کرٹل نے استفسار نہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔

میں نے جواباً گردن کو اثباتی جنبش دی تھی۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ کرٹل

نے یہ بات انگریزی میں کی تھی۔ ”بشرطیکہ میری اعلیٰ قیادت کو کوئی اعتراض نہ ہو“ مشروط طور پر میں اسے قبول کر سکتا ہوں۔“

”شکریہ سر۔“ ڈی سی نے کہا۔ ”کیا اسی وقت؟“

”نہیں۔“ کرٹل بولا۔ ”میں پہلے انفارمیشن کمانڈر سے منظوری لوں گا اور کل صبح کسی وقت لے جاؤں گا۔“

”یہ بہتر تجویز ہے۔“ میں نے کرٹل کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس دوران ایک ایکپیرٹ سے جمانگیر احمد کا میک اپ کروالوں گا۔ میرے پاس اس کی تازہ تصویر ہے۔“

چائے پی کر جب وہ دونوں چلے گئے تو ڈی سی نے ملازم کو بلایا جب وہ اسے شب بھری کا انتظام کرنے کا حکم دے چکا تو میں نے اس سے ایک گاڑی طلب کر لی۔ اس نے جواب دیا کہ رات کا کھانا کھا کر چلے جانا۔

ان دنوں کرفو اور قدم قدم پر سیکورٹی فورسز کی ناکہ بندی سے بچنے کی خاطر اکثر دو بیشتر محکموں نے گاڑیوں کی نمبر پلیٹ پر محکمے کا کوڈ نمبر لکھوا دیا تھا اور ڈرائیوروں کو خصوصی پاس جاری کیے ہوئے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ کریک ڈاؤن کے باوجود ہماری کار کو کسی نے نہیں روکا نہیں تھا ڈرائیور کو میری تحویل میں دے دیا گیا تھا۔ میرے لیے ڈی سی کا سلوک اور خصوصی انتظامات بھی ڈرائیور کے پیش نظر رہے ہوں گے اس لیے اس کا رویہ بڑا ہی فدیوانہ تھا۔ میں اسے شہر سے بہت دور پہاڑیوں کے درمیان تک لے گیا تھا لیکن اس نے کوئی سوال نہ کیا تھا پھر بھی احتیاطاً میں نے اسے ایک اور کچی سڑک پر اصلی منزل سے ایک کلومیٹر دور چھوڑ دیا تھا۔

مجھے ایک فرلانگ دور تین گمران مجاہدین نے نہ صرف روکا تھا بلکہ گمن پوائنٹ پر رکھ لیا تھا۔ میں نے کیمپ انچارج حضرت شاہ صاحب اور سرفرز کا حوالہ دیا اس کے باوجود میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر وہ مجھے اندر لے گئے۔ مجھے دیکھ کر وہاں ایک سرے سے دوسرے تک اپنل سی منج گئی تھی۔ فوراً مجھے حضرت شاہ صاحب کے کیمپ میں پہنچایا گیا تھا۔ شاہ صاحب گیس سلنڈر کی روشنی میں ایک شخص کے ساتھ نقشہ تیار کروا رہے

تھے۔

”کہاں رہ گئے تھے میرے عزیز؟“ شاہ صاحب نے سلام کا جواب دے کر پوچھا۔ ”ابھی دس منٹ قبل اطلاع دی گئی تھی کہ تم وفد کے ساتھ نہیں ہو۔ ہمارا خیال تھا کہ تمہیں الگ کسی سیل میں بند کر دیا گیا ہو گا۔“

میں نے شاہ صاحب کو تفصیل کے ساتھ ساری باتیں بتائیں تو انہوں نے ہاتھ اٹھا کر پتلے اللہ کا شکر ادا کیا اور پھر میری کارکردگی کی تعریف کرنے لگے۔ ”ٹھیک ہے عزیزم۔ پہلے اپنی خواتین سے مل لو۔ بچیاں روتے روتے نڈھال ہو گئی ہیں پھر ہم باتیں کریں گے۔“

سرفراز وہاں نہیں تھا۔ ایک مجاہد مجھے زنانہ حصے کی طرف لے گیا۔ اس نے پردے کے قریب جا کر خالہ زینب کو آواز دی۔ ایک ادھیڑ عمر خاتون نے پردہ ہٹا کر مجھے دیکھا اور پھر واپس چلی گئی۔

”آپ اس کیمبن میں چلے جائیں۔“ مجاہد نے ایک طرف اشارہ کیا۔ درختوں کی شاخوں سے پارٹیشن کر کے ایک کیمبن بنایا گیا تھا۔ اندر سٹی اسٹول تھے۔ میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور غدار کی کاغلاف نوچ کر کپے فرش پر پھینک دیا۔ ”بھائی..... جان.....“ زبیدہ کی لرزتی چیخ ابھری۔ دوسرے لمحے وہ میری ہانہوں میں تھی میں نے اپنا چہرہ اس کے بالوں پر رکھ دیا تھا۔

”ایک مجاہد کی مجاہدہ بہن کو یوں نہیں بکھرتا چاہئے۔“ میری سماعت سے انوکھی بھرائی ہوئی آواز نکرائی۔ اس نے روتی بلکتی زبیدہ کو میری گرفت سے بمشکل دور کیا تو ہاتھوں سے منہ دبائے بتول میرے شانے سے لگ گئی تھی۔ میں نے اس کے بالوں پر تھکی دی۔

”جنگگیر!“ انو شاکی آواز میں بولی۔ ”ختم کرو یہ ڈراما یہ پہلے ہی نڈھال ہیں۔ میں حیران ہوں کیا یہاں کی عورتیں اپنے بھائیوں کی ایک دن کی جدائی بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔“

بتول سسکتی ہوئی الگ ہو گئی۔

”خالہ ان کو اندر لے جاؤ۔“ انو کا لہجہ کسی سخت گیر ساس جیسا تھا۔ وہی عورت

اندر آئی اور دونوں لڑکیوں کو کلاوے میں بھر کر لے گئی۔ میرا چہرہ بالکل سپاٹ اور آنکھیں محراب کی مانند ویران اور جل رہی تھیں۔ انو لحظہ بھر میرے چہرے کو دیکھتی رہی پھر سامنے سٹی اسٹول پر بیٹھ گئی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں کے پیالے لبالب بھرے ہوئے تھے لیکن وہ ایسی ہی تھی اس نے پیالوں کو ایسے سنبھال کر رکھا ہوا تھا کہ ایک قطرہ بھی باہر نہ آیا تھا۔

”یقیناً تم وفد سے الگ ہو گئے تھے۔“ میں نے اثباتی اشارہ کیا۔ ”مجھے یقین تھا یہی بات میں نے شاہ صاحب کو بتائی تھی۔ میں نے کہا تھا جنگگیر کو شکار کرنا اتنا آسان نہیں۔“

”حالانکہ جنگگیر کو ایک لڑکی نے بڑی آسانی سے جال میں جکڑ لیا تھا۔“

”ہاں۔“ انو کے لبوں پر طاری سوگواریت کو میری بات نے توڑ دیا تھا۔ ”جنگگیر کو کوئی بھی لڑکی آسانی سے شکار کر سکتی ہے مگر سیورٹی فورسز میں ایسی لڑکی شاید نہ ہو۔“

”پوری دنیا کی فورسز میں اس جیسی کوئی لڑکی نہیں ہے۔“

”ہے ایک لڑکی جس کا نام شیلاکاماری ہے۔“ اس نے مسکراہٹ دبا کر چوٹ ماری۔

”خیر چھوڑو ان باتوں کو یہ بتاؤ دن بھر کہاں چھپے رہے ہو؟“

”کیا میں روشنی سے ڈرنے والا گیدڑ ہوں۔“

”شیر بھی شکاریوں کو ڈانگ دے کر کسی کھوہ میں جا چھپتا ہے۔“

تب میں نے اسے بھی دن بھر کی مصروفیات بتا دیں اور یہ بھی کہ مجھے ”را“ میں لینے کا فیصلہ ہو رہا ہے۔

”کیا تم واقعی اتنے احمق ہو یا اس کتیا کی یاد نے تمہاری مت مار دی ہے۔ جانتے ہو میں ایسا مذاق برداشت نہیں کیا کرتی۔“

”یہ مذاق نہیں ہے نواب زادی صاحبہ۔“ میں نے کہا۔ ”اپنے اندر سے عورت کی سوچ نکال کر میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہاں کے حالات تم سے بہتر میں نے جان لیے ہیں۔ یہاں مجاہدین کو چاروں اطراف سے محاصرے میں لے لیا گیا ہے۔ اس طرح تو ہم سو سال میں بھی اپنا مقصد حاصل نہ کر سکیں گے۔ تمام مجاہدین زیر زمین دبکے رہتے ہیں۔ جب بھی کوئی گروپ باہر نکلتا ہے تو ایک اور دس کے تناسب سے نفع و نقصان لے کر واپس آتا ہے، مجھے یہ طریقہ جنگ پسند نہیں ہے۔ میں ہاتھ پاؤں کھول کر

دشمن سے مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔ ہمیں ادھر سکھایا گیا تھا کہ وہ ہم اور وہ کمانڈو زیادہ موثر اور تباہ کن ہوتا ہے جو دشمن کی صفوں کے درمیان جا کر پھٹتا ہے۔ میں ایسا ہی موثر بن رہا ہوں۔

”تم شیلہ اور کرنل راج کو کس خانے میں فٹ کرو گے؟“

”نمبرون دشمن کے خانے میں۔“

”تو تم شیلہ سے ملاقات کرو گے؟“

”میں نہیں۔“ میرا جواب تھا۔ ”وہ“ را“ میں میری بو پا کر پاگل کتیا کی طرح مجھ پر جھپٹے گی، جو آگ اسے میرے تعاقب میں مظفر آباد لے گئی تھی وہی آگ اسے یہاں لے آئے گی۔“

”میرے بارے میں کیا کہتے ہو؟“

”تم زبیدہ اور بتول کا خیال رکھو گی پھر میں تم سے دور نہیں رہوں گا۔ اگر میرے پاؤں جم گئے تو تم تینوں کے لیے کوئی محفوظ رہائش گاہ لے لوں گا۔ فی الحال تم یہاں رہو گی اور میں پل پل کی خبر رکھوں گا۔“

”کیا شاہ صاحب نے تمہیں کچھ بتایا نہیں؟“

”نہیں، کیا بات ہے؟“

”مجھے ویمن ونگ کمانڈر بنا کر پونچھ سکیئر بھیجا جا رہا ہے۔“

”تم جانا چاہتی ہو؟“

”ہاں، اب انکار نہیں کروں گی۔“ انو نے کہا۔ ”جہاں تک بتول اور زبیدہ کا تعلق ہے شاہ صاحب سے میری بات ہوئی ہے اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو یہ امانتیں.....“

”میں سمجھ گیا ہوں۔ تم جو فیصلہ کرو گی مجھے قبول ہو گا۔“

”سن تو لو۔“ انو بولی۔ ”زبیدہ کے لیے سرفراز سے بہتر جیون ساتھی نہیں مل سکتا

اور بتول کو شاہ صاحب اپنی بہو بنانا چاہتے ہیں۔ ان کا بیٹا بھی کسی فرم میں ڈپٹی منیجر ہے۔“

”زبیدہ اور بتول کیا کہتی ہیں؟“

”دونوں نے فیصلے کا اختیار ہم دونوں کو دیا ہے۔“

”اگر ہم حالت امن میں ہوتے۔“ میں نے دہی زبان میں کہنا شروع کیا۔ میں اپنی مجبوری اپنی بہن تک نہیں پہنچانا چاہتا تھا اگر زبیدہ میری بات سن لیتی تو اسے خوشی کے ساتھ دکھ بھی ہوتا کہ بھائی اسے اب بوجھ محسوس کرنے لگا ہے۔ ”ہم چاروں اطراف سے آگ میں نہ گھرے ہوتے تو میرا فیصلہ شاید دوسرا ہوتا مگر اب میں یہ امانتیں سنبھال نہ سکوں گا لہذا آج اور ابھی یہ فرض ادا ہو جانا چاہیے۔ سرفراز بھی موجود ہے۔ باقی معاملہ شاہ صاحب کے ذمے ہو گا۔ بتول ان کی امانت ہے۔“

”ایک امانت اور بھی تو ہے جمانگیر!“ انو نے نگاہیں جھکا کر کہا۔ ”مجھے کس کے سپرد کرو گے؟“

”اللہ کے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جس محاذ پر میں جا رہا ہوں وہاں کسی اور نازک جذبے کی ضرورت نہیں ہے۔ آزاد کشمیر تک میری جستجو کی منزل صرف زبیدہ تھی۔ میں نے سوچا تھا زبیدہ مل گئی تو اسے ساتھ لے کر ہم کسی آزاد اور پرسکون ملک کی طرف نکل جائیں گے لیکن یہاں آکر جو کچھ دیکھا ہے۔ سارے خونی مناظر میرے اندر جل رہے ہیں میری سوچ اور منزل بدل گئی ہے اب میری منزل صرف اور صرف آزادی ہے۔ ہاں، جب منزل ملے گی تو میرا ایک گھر ہو گا۔ اس گھر میں میرے ساتھ صرف انیلا بیگم ہو گی۔ اگر اس گھر کی تعمیر تک میرا انتظار کر سکو تو میں اس یقین کے ساتھ منزل کا فاصلہ تیزی سے طے کر لوں گا۔“

”اگر میں انتظار نہ کر سکی تو؟“

”تو کچھ بھی نہیں ہو گا۔ مجھے بہر طور سانسوں کا قرض تو چکانا ہی ہو گا۔“ میں نے بالکل غیر مذہباتی انداز میں جواب دیا۔ ”کتنے لوگ ہیں جو تنہا زندگی گزار کر چلے جاتے ہیں۔“

”سنو۔“ انو نے بو جھل پلکیں اٹھا کر کہا۔ ”کیا تمہارا ایمان ہے کہ محشر کے میدان

میں میاں بیوی شانہ بشانہ کھڑے ہوں گے؟“

”ہاں بزرگوں سے سنا تو ہے۔“

”میری خواہش ہے جمانگیر، میں اس دن تمہارے نام کے ساتھ پکاری جاؤں۔“

”خواہش تو میری بھی ہے کہ تم اس مشکل گھڑی میں میرے شانے سے لگ کر

”پھر ہم اپنی اپنی خواہش کو ایک باوثوق ضمانت کیوں نہ دے دیں۔“
 ”وہ کیسے؟“

”ابھی ان کے ساتھ۔“ شاہ صاحب بولے۔ ”کیوں کوئی مسئلہ ہے؟“

ہے۔ میں چاہتی ہوں اپنی موجودگی میں زبیدہ کا نکاح.....“

”کوئی جلدی نہیں حضرت صاحب۔“ آسیہ نے جواب دیا۔ شاہ صاحب نے اپنے ماتحتوں کو بلا کر فوری انتظامات کا حکم دے دیا۔

چونکہ میں نے اپنی گاڑی اصل راستے سے ہٹ کر کھڑی کی تھی اس لیے ایک فرلانگ کے بعد میں انور پر بھرپور نگاہیں ڈال کر الگ ہو گیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ آسیہ وغیرہ کے لیے بھی کہیں گاڑی کھڑی ہے۔

”نہیں۔“ میں نے دو ٹوک انکار کر دیا۔ ”اگر ایسا ہو گیا تو میں تم سے دور نہیں جا سکوں گا۔ دوست ملتے ہیں۔ بچھڑ جاتے ہیں۔ اگر بیوی مل کر بچھڑ جائے تو چاہئے اور غیرت والا خاوند مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ احساس ہر سانس کے ساتھ ڈستار رہتا ہے کہ میری بیوی کہاں ہوگی۔ کیسی ہوگی، کس کے ساتھ ہوگی، کس سے باتیں کر رہی ہوگی۔ نہیں، ہر گز نہیں۔ انو میں اس زہر کو برداشت نہ کر سکوں گا۔ بس دوست رہو، بچھڑو تو اس یقین کے ساتھ کہ ہم پھر ملیں گے۔ باقی تمام معاملات میں دوستوں کو آزاد اور خود مختار رہنا چاہیے لیکن بیوی صرف بیوی ہوتی ہے جس کا ہر لحظہ خاوند کے لیے ہوتا ہے۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو انو۔“

”پھر ایک وعدہ کرو۔“

”رابطے سے کبھی باہر نہ جانا۔“

سرفراز نے آکر حضرت شاہ صاحب کا پیغام دیا۔ پیغام انوکے لیے بھی تھا اس لیے دونوں شاہ صاحب کی خدمت میں پیش ہوئے۔ وہاں تین خواتین موجود تھیں۔ تینوں کے چہرے نقاب میں تھے۔ آنکھوں اور ہاتھوں سے میں نے اندازہ لگایا تھا تینوں نوجوان ہیں۔ ”انوبٹی۔“ شاہ صاحب بولے۔ ”پہلے اپنی بہنوں سے مل لو۔ یہ دامن ہاتھ پہلے

کام لے گی۔“

ناشتے کے دوران ڈی سی بہت کچھ کہتا رہا تھا لیکن میری تمام تر توجہ آنے والے حالات پر لگی ہوئی تھی۔ ریکارڈ طلب کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ عبدالعلی اور جہانگیر کے جسمانی کوائف کا موازنہ کرنا چاہتے ہوں گے۔ یہ اتفاق ان کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا کہ دونوں کا قد ایک ہو۔ آنکھوں کا رنگ ملتا ہو۔ ذرا سا شک ان کو گہرائی میں اترنے پر اکسا سکتا تھا۔

میں نے سوچا تھا کہ یہاں سے ہی بھاگ جاؤں اور کسی اور میک اپ میں اپنی مرضی کے ساتھ اپنا راستہ اختیار کروں لیکن ابھی ناشتا کیا جا رہا تھا کہ اطلاع ملی آرمی کا ایک دستہ مجھے لینے آیا ہے۔

ایک کیپٹن اور تین نوجوانوں کا دستہ اپنے ساتھ بکتر بند جیپ لایا تھا۔ مجھے تین گمرانوں کے درمیان بٹھایا گیا تو مجھے کوئی شک نہ رہا کہ میں خطرے میں گھر چکا ہوں۔ ”خطرہ کہاں نہیں۔“ میں نے دل کو تسلی دی اور خود کو نارمل اور پرسکون رکھنے کے لیے سانسوں کی مشق شروع کر دی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ خوف اور پریشانی میرے اعصاب پر اثر انداز ہو جائے اور پہلی ہی نگاہ میں ان کو سہا ہوا مجرم دکھائی دوں۔

حسبِ عادت پہلی بار صبح کاذب کے وقت نیند ٹوٹی پھر کروٹ بدل کر سو گیا تھا۔ سات بجے ہی بلاوا آ گیا تھا لیکن میں غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر نو بجے جانے کے لیے تیار ہوا تھا۔ بلاوا تحریری تھا جسے پڑھنے کے بعد واپس لے لیا گیا تھا۔ جب مخصوص قسم کا کانڈ میرے ہاتھ میں دیا گیا تو میں اسی وقت سمجھ گیا کہ دوسری طرف چھان بین شروع ہو چکی ہے۔

کانڈ کو چھوئے بغیر میں واپس نہیں کر سکتا تھا پھر جب تک کانڈ ہاتھ میں نہ لیا تھا اس کی خاصیت معلوم نہ ہوئی تھی۔ وہ کانڈ خصوصی طور پر مطلوبہ شخص کے فنگر پرنٹس حاصل کرنے کے لیے تفتیشی مراکز استعمال کرتے ہیں۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

میں اس یقین کے ساتھ رہبر کے ساتھ کرل کے آفس میں داخل ہوا تھا کہ جاتے ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔ میں بھاگنا چاہتا بھی تو اس قلعہ نما عمارت سے فرار ناکسن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

تھی۔ میں ہمیشہ بروقت کام آنے والی سوچ اور شے کو ہی کارگر ہتھیار سمجھتا رہا ہوں۔ کسی جگہ حکایت پڑھی تھی کہ مغل اعظم نے اپنے ایک رتن ملا دوپیاڑہ سے پوچھا۔ ”بتاؤ موزر اور کارگر ہتھیار کون سا ہے؟“ ملانے برجستہ جواب دیا۔ ”مہاشلی، جو وقت پر کام آئے۔“ حاسدوں نے ملا کا مذاق اڑایا۔ بادشاہ نے بھی احمقانہ جواب پر ناک بھوں چڑھائی پھر ایک دن مغل اعظم اپنے محافظوں کے درمیان پیدل چل رہا تھا کہ ادھر سے پاگل ہاتھی نمودار ہوا۔ عوام و خواص گھبرا کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ قریب تھا کہ پاگل ہاتھی شہنشاہ کو پاؤں تلے روندنا نکل جاتا کہ ایک گلی سے بلی کا بچہ بھاگتا ہوا آیا۔ ملا دوپیاڑہ نے بلی کا بچہ اٹھا کر پاگل ہاتھی کی سونڈ پر مارا۔ بلوگڑے نے سونڈ پر بچے پست کر لیے اور پاگل ہاتھی گھبرا کر واپس بھاگ نکلا، تب مغل اعظم نے اپنے رتن کے جواب کو تسلیم کر لیا اور اسے انعام عطا کیا۔

جب مجھے وقت کا ہتھیار ہی استعمال کرنا تھا تو پھر رات کی نیند حرام کیوں کی جاتی، میں تمام تر خطرات اور خدشات کو جھٹک کر نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔ صبح ناشتے کی میز پر ڈی سی نے میری نئی شکل دیکھی تو چونک پڑا جواب میں مجھے مسکراتا پڑا تھا۔

”میں نے انسپٹر جہانگیر کا سارا ریکارڈ منگوا لیا ہے۔ کرل نے رات فون پر ریکارڈ طلب کیا تھا۔ تمہارے ساتھ جو آدمی جائے گا وہ ریکارڈ بھی لے جائے گا۔“ ڈی سی نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”ان لوگوں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں ایڈ ہاک میں پر فوج میں لے لیا جائے۔“

”لیکن میں انسپٹر جہانگیر نہیں ہوں۔“ میں نے کرسی پر بیٹھ کر احتجاجی انداز میں کہا۔ ”جناب میں نے آج تک ریوالور کے علاوہ کبھی کسی ہتھیار کو ہاتھ نہیں لگایا۔ میں پیشے کے لحاظ سے بروکر ہوں اس تجربے کو میں نے حکومت کے لیے کام کرنے پر استعمال کیا ہے۔“

”عبدالعلی میرے دوست۔“ ڈی سی کپ میں چائے اندھلتے ہوئے بولا۔ ”تم نے بھڑوں کے چستے کو ہاتھ لگانے کا نود فیصلہ کیا ہے۔ اگر تم پولیس ڈیپارٹمنٹ میں چلے جاتے تو میں تمہاری سفارش کرتا تمہیں خفیہ ونگ میں لے لیا جاتا۔ اب آرمی اپنے طریقے پر

گیا تھا۔

”میں یہی کچھ چاہتا تھا کرٹل شو بھراج؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”میں نے جب آپ کو ڈی سی آفس میں دیکھا تو شک سا ہوا پھر جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ کا تعلق ”را“ سے ہے تو شک یقین میں بدل گیا“ آپ وہی شو بھراج ہیں نا جسے کرٹل راج کی بہن شیلہ کماری کو ایک رات اپنی تحویل میں رکھنے کے جرم میں کورٹ مارشل کے مراحل سے گزرنا پڑا تھا؟“

”تم!“ کرٹل دوڑتا ہوا میرے پاس آن رکا۔ ”تم یہ باتیں.....“

”بی ایزی مائی فرینڈ۔“ میں نے اس کی ران پر تھپکی دی۔ ”ہم دونوں ایک ہی تیر کے گھائل ہیں۔ ہمیں ایک ہی ناگن نے باری باری ڈسا ہے۔“

”ٹھہرو۔“ کرٹل تیزی سے الماری تک گیا، بوتل نکال کر واپس آیا اور چند گھونٹ حلق میں اتار کر میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”ہاں اب بولو۔“ اس مختصر وقفے نے مجھے اپنی چال کو متوازن کرنے کا وقت دے دیا تھا۔ عملی میدان میں اترنے سے قبل میں بھی عوام کا ہم خیال تھا کہ اتفاقات صرف فلموں، ڈراموں اور افسانوی دنیا میں ہیرو سے ٹکراتے ہیں مگر مماتی معاملات سے جب سابقہ پڑا تو قائل ہونا پڑا کہ غیبی ہاتھ جب مدد کرنا چاہے تو ان ہونی ہو جاتی ہے۔ یہ بھی ان ہونی ہی تھی کہ اتفاق سے وہ شخص سامنے آیا تھا جس سے میں غائبانہ بڑی اچھی طرح واقف تھا۔ کرٹل شو بھراج کے بارے میں شیلہ نے مزے لے لے کر بہت کچھ بتایا تھا۔ ڈبل ایم مشن کے لیے میجر شو بھراج مقرر ہوا تھا اور اسے اپنی پسند کے ایک معاون کا ڈی جی نے اختیار دیا تھا۔ میجر شو بھراج نے کیپٹن شیلہ کا نام دیا تھا اور مشن کے دوران ایک دن دست درازی کر بیٹھا تھا جس کی رپورٹ شیلہ نے اپنے بھائی کے ذریعے اوپر پہنچا دی تھی۔ کورٹ مارشل کے دوران جب معافی کی آپشن اسے ملی تو اس نے کیپٹن شیلہ سے تحریری معافی مانگ کر اپنی گردن بچائی تھی۔

شیلہ نے یہ بھی بتایا تھا کہ کرٹل راج اور شو بھراج المعروف شو بھی کے درمیان ٹکمانہ اور عاشقانہ بڑی زوردار رقابت چلتی ہے۔ میں نے ان ہی معلومات کو بطور ہتھیار استعمال کیا تھا اور وقت کا ہتھیار بڑا ہی کارگر ثابت ہوا تھا۔ ”میرے سروس ریکارڈ میں کسی جگہ شیلہ کماری کا ذکر نہیں ہے مگر میری ذات کی ڈائری اس نام سے بھری پڑی ہے۔“

میرا ایک اندازہ غلط ہو گیا تھا۔ وہ آفس نہیں بلکہ کرٹل کا بیڈ روم تھا، دروازے سے داخل ہوتے ہی میں نے دیکھ لیا تھا کرٹل ٹی ڈی سیٹ کے سامنے ایزی چیئر پر نیم دراز حالت میں تھا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا اور پھر ریپوٹ کنٹرول سے ٹی ڈی سیٹ آف کر دیا تھا۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو وہ اٹھا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا کر خوشگوار لمبے میں بولا۔ ”ویل کم انسپکٹر جانیئر۔ بھگوان بنے میک اپ کرنے میں کسی بجل سے کام نہیں لیا، اگر براؤن فاکس نے تمہاری خاطر اتنا بولڈ اسٹیپ اٹھانے میں کسی خطرے کو مد نظر نہیں رکھا تو وہ حق بجانب تھی۔ تم جیسے مرد کی خاطر کوئی بھی عورت تخت کو ٹھوکر مار سکتی ہے۔ بیٹھو مائی فرینڈ۔ مجھے یقین تھا پولیس ڈیپارٹمنٹ سے گولڈ میڈل حاصل کرنے والا نوجوان آئرن مین ہی ہو گا۔“ میں آئرن کے پول کی مانند ایک جگہ جم گیا تھا۔ کرٹل کی ساری باتیں میرے اعصابی نظام پر پتھروں کی طرح برسی تھیں، شاید ایسے حالات میں میری جگہ کوئی دوسرا انسان ہوتا تو کھکھیاٹے لگتا، انجان بننے کی حماقتیں کرتا۔ کرٹل کی باتوں کو نہ سمجھنے کی ناکام اداکاری شروع کر دیتا مگر میں بالکل خاموش کھڑا رہا تھا۔

”تم نے تردید نہ کر کے بھی مجھے متاثر کیا ہے دوست، بیٹھ جاؤ، اگر تم اس خیال کے تحت خاموش ہو کہ یہ کمرہ بگڈ ہے تمہاری آواز کیسے سنی جاسکتی ہے یا ٹیپ ہوگی تو ایسا نہیں ہے۔ میں بھگوان کی قسم کھاتا ہوں کہ یہاں صرف میں ہوں، میرے کان ہیں اور میں تمہارا دوست ہوں۔“ میں نے طویل سانس لے کر کندھے جھکے اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ کرٹل ٹھٹھا ہوا مینٹل پیس تک گیا اور پھر پلٹ کر ایک کھنی مینٹل پیس پر ٹیک کر بولا۔ ”ویسے تم جیسے فرینڈ اور ریکارڈ کے مطابق ذہین اور شاطر کمانڈو سے ایسی بچکانہ حرکت کیسے ہوئی؟“

”اگر میں یہ جواب دوں کہ یہ میری ذہانت اور شاطرانہ پالیسی ہی تھی کہ میں جو چاہتا تھا دیا ہی ہوا، آپ نے صرف میرا سروس ریکارڈ دیکھا ہے اور فنگر پرٹس سے پہچانا ہے۔ میرے نزدیک یہ کوئی کمال نہیں، کوئی محتاط آفیسریہی کچھ کرتا اور یہی رزلٹ نکال لیتا، اگر ایسا نہ ہوتا تو میں یہاں رہ کر وہی کچھ حاصل کر لیتا جو میں نے چاہا تھا۔“

”جھوٹ مت بولو مسٹر جانیئر۔ تم یہی نہیں چاہتے تھے۔“ میری کوشش کامیاب رہی تھی۔ کرٹل کا وہ اعتماد جس کے بل پر وہ مجھ سے جلی چوہے کا کھیل کھیلنا چاہتا تھا ٹوٹ

ریکارڈ میں براؤن فاکس کے نقش پاپ کو نہیں ملے ہوں گے جب کہ براؤن فاکس کا زہر بھی میرے خون میں شامل ہے۔“

”مجھے صرف میجر شیلہ کماری کے ذکر سے دلچسپی ہے۔“ کرنل نے بوتل منہ سے ہٹا کر ہاتھ کی پشت سے ہونٹ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”کچھ سرگوشیاں وہاں گردش کر رہی تھیں لیکن مجھے جلد ہی یہاں آنا پڑا۔ ہاں تو شیلہ کے بارے میں تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”کہنا نہیں کرنل!“ میرے حلق سے غراہٹ ابھری۔ ”الفاظ میرے اندر کی آگ کو نہیں بجھا سکتے۔ میں بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔“

کرنل نے جھک کر بیڈ کے پائے میں نصب الیکٹرک بٹن دبا دیا۔ میرا بدن آنے والے لمبے کے لیے تن سا گیا تھا۔ اس نے کسی کو کال کیا تھا، آدھے منٹ بعد ایک نوجوان اندر آیا۔ ”جوشی، گیٹ کے لیے گرم گرم چائے لے آؤ، ہاں دوست۔ آگے چلو اس یقین کے ساتھ کہ تمہاری آگ بجھانے میں کرنل شوبھراج پوری مدد کرے گا۔“

”میں واپس انڈیا جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور ڈال کر کہا۔ ”میں چاہتا تو عبدالعلی کے روپ میں جاتا لیکن عبدالعلی کو انڈین گورنمنٹ خدمات کے صلے میں ہر سولت دیٹی مگر عبدالعلی کو ”را“ کے درمیان جانے کا راستہ کبھی نہ دیٹی، میں ”را“ کی چھڑی ہاتھ میں رکھ کر وہاں داخل ہونا چاہتا ہوں۔“ کرنل نے دو گھونٹ منہ اٹھا کر حلق سے اتارے، میں دیکھ رہا تھا وہ گھونٹ گھونٹ آدھی بوتل معدے میں پہنچا چکا تھا، مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ مائل بہ کرم اور تعاون کرنل نشے میں دھت ہو کر باعثِ خطرہ نہ بن جائے لیکن وہ آخری دقت تک پیتا بھی رہا تھا اور باہوش بھی رہا تھا۔

”تم وہاں کیوں جانا چاہتے ہو انسپکٹر؟“

”اس زہریلے جوڑے کا سر کپکنے، کرنل۔“

”جوڑے!“ اس نے استغما میہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ ”وضاحت کرو۔“

”وہ دونوں بہن بھائی ناگوں کا جوڑا ہیں بلکہ ناگوں سے زیادہ بے وفا، ظالم اور زہریلے ہیں۔ دوران کورس شیلہ نے مجھے اپنے جال میں پھنسایا، یہی نہیں بلکہ مذہبی روایات اور پابندیوں کو بھٹانگ کر اس نے مجھے شادی پر مجبور کر دیا۔“

”ادہ..... ادہ مالی گاڈ.....“ کرنل ران پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”کیا شیلہ نے تم

.....“

”لیس سر۔“ میں نے جواب میں دانت پیس کر سر ہلایا۔ ”ہم نے کورس کے دوران شادی کر لی تھی۔“

”کیا تم سچ کہہ رہے ہو جہانگیر؟“ کرنل بے قراری سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ”کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے؟“

”شادی کی تقریب زمبابوے کے اسلامی سنٹر میں ہوئی تھی۔“ میں نے جواب دیا پھر ملازم چائے لایا تو میں خاموشی ہو گیا۔ کرنل نے ملازم کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ ٹرے رکھ کر دبے پاؤں کمرے سے نکل گیا تو میں نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ”میں جن حالات سے گزرتا ہوا یہاں آیا ہوں، تن کے لباس کے سوا کوئی شے ساتھ نہیں رہی، سامان تو کرنل بلراج کے گھر ہی چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا۔“

نمک مرچ لگا کر میں اسے تھوڑا سچ اور زیادہ جھوٹ سناتا رہا اور وہ بوتل سے گھونٹ گھونٹ شراب پیتا رہا تھا۔ وہ بہت اچھا سامع تھا داستان گوئی کے درمیان بہت کم بولا تھا۔

”اب خوب سوچ کر بتانا جہانگیر۔“ وہ سنجیدہ آواز میں بولا۔ ”تم پر کس قدر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟“

”جتنا آپ کا ظرف ہے کرنل۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں مردانہ اور سرفراز عہد جب کرتا ہوں تو جان کی قیمت پر نبھاتا ہوں پھر موجودہ حالات کا اپنا تقاضا بھی ہے میں خوش فہم نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں میری جان اور کامیابی کی چابی آپ کی مٹھی میں ہے، میں ہر قیمت پر اپنی جان اور اپنے مشن کی کامیابی خرید لوں گا۔“

”ہر وہ چابی تمہارے حوالے کی جاسکتی ہے۔“ کرنل سلگتے ہوئے بولنے لگا۔ ”چابی ہی نہیں بلکہ مطلوبہ لاک تک جانے کی تمام تر سہولتیں بھی تمہیں ملیں گی، لاک کھول کر جو کچھ تم حاصل کرو گے اس میں کسی اور کی شراکت بھی نہیں ہوگی۔“ اس نے سگریٹ کے لیے لائینر کا شعلہ روشن کیا تو اس قلیل وقفہ کے دوران میں نے اس سے سوال کیا۔

”اس تعاون کی مجھے کیا قیمت ادا کرنی ہوگی؟“

”اچھا سوال کیا تم نے انسپکٹر۔“ کرنل نے دھواں اگلے۔ ”اس دنیا میں

تمہارے مذہبی عقیدے کے مطابق بھی اور دنیا کے ہر قانون کے تحت بھی ہر کام اور شے کی کوئی نہ کوئی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ کیا تم جانتے ہو آج کل دولت ہی طاقت اور عزت کی علامت ہے۔“

”یس سر۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بلکہ دولت ہی دنیا پر راج کر رہی ہے۔“

”بے شک دولت ہی راج کا دوسرا نام ہے۔“ کرٹل نے بھرپور کش لے کر دھواں چھوڑا۔ ”تو میرے دوست کو بھی دولت سے اپنی کامیابیاں مشروط کرنا ہوں گی۔ تم جب میرے کندھوں پر بیٹھ کر ”را“ کے اندر اترو گے تو تمہیں دیکھ کر یقیناً حیرت ہوگی وہاں ہر تیسرے شخص کے اندر دولت بنانے کی مشین لگی ہوئی ہے۔ اس ریس میں جو بھی احمق رک جاتا ہے اسے دوسرے روند ڈالتے ہیں۔“

”میں وضاحت چاہوں گا سر۔“ میں نے فدیوانہ لہجے میں کہا۔ ”اگر یہ قیمت مجھے اپنی جیب سے ادا کرنی پڑے گی تو میں شرمندگی کے ساتھ معذرت ہی ادا کر سکوں گا میرے پاس تو باجس خریدنے کی بھی مالی سکت نہیں ہے۔“

”نہیں ڈیئر۔“ کرٹل ہنس پڑا۔ ”تم جب ادائیگی شروع کرو گے تو تمہارا بینک بیلنس فائو سکس فلگز ہو گا۔ اب میں اوتھ کے ساتھ تمہیں ایک ایسے راز میں شریک کر رہا ہوں جو خطرناک حد تک سودمند ہے۔ یوں سمجھو تم اور میں بیک وقت اپنی اپنی ٹانگوں کے ساتھ ٹائم بم باندھ لیں گے جس کا ریموٹ کنٹرول ہماری انگلیوں کے نیچے ہو گا۔ اگر کسی ایک نے بھی بٹن دبایا تو رازوں کے پرچے اڑ جائیں گے۔ کیا تم ایسے خطرناک راز کے لیے تیار ہو؟“

”دل و جان سے سر۔“ میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا۔ ”مجھے رازوں کی حفاظت کا اہل بنایا گیا ہے، آپ مجھ پر اعتماد کر کے کبھی مایوس نہیں ہوں گے۔“

”گڈ، تھینک یو بیک مین۔“ کرٹل نے میرے شانے پر چھکی دی۔ ”آج سے ہم اچھے دوست اور دیانت دار پارٹنر ہیں اب جو دوسری بات کرنے جا رہا ہوں وہ شاید ہضم نہ کر سکو۔ کیا کوئی ہوش مند شخص اپنے دشمن کے ہاتھ مضبوط کر سکتا ہے۔ کیوں! ہے نا عجیب بات، لیکن ہم صرف ان ہاتھوں کو پہچانتے ہیں جن میں دولت ہوتی ہے چاہے وہ ہاتھ دشمن کے ہی کیوں نہ ہوں۔“

”میں ہمہ تن گوش ہوں سر۔“ میں نے پُر تجسس انداز میں کہا۔ ”میں تو پوری بات سننے سے پہلے ہی حیرتوں میں ڈوبتا ہوا محسوس کر رہا ہوں، میں تو یہ بات بھی ہضم نہیں کر پا رہا کہ ”را“ کا اعلیٰ آفسر مجھ جیسے بھگوڑے پر اس قدر مہربان ہے۔ دوستی کا یقین دلا رہا ہے۔ کیا یہ انہونی بات نہیں سر؟“

”نہیں مسٹر جہانگیر۔“ کرٹل نے ہاتھ کو نفی میں لہرایا۔ ”تم بھی ٹرینڈ کمانڈو ہو، کیا ہمیں سکھایا نہیں گیا کہ کسی بڑے مفاد پر چھوٹے چھوٹے بہت سے نقصانات اٹھالے جائیں، میری دوستی بھی ایک بڑے فائدے کے لیے چھوٹے نقصان کو بخوشی برداشت کرنے والی ہے، میری یہ سچائی نگل لو دوست۔ مجھے یقین ہے درد شکم کی شکایت نہ کرو گے۔ میرے ساتھ آؤ۔ میرا خیال ہے کرٹل نرائن ہمارے لیے کوئی مسئلہ نہیں بنے گا۔“

باہر نکل کر ہم جیب میں بیٹھے چونکہ جیب ایک سکھ ڈرائیور چلا رہا تھا اس لیے کرٹل پچھلی سیٹ پر خاموش رہا تھا۔ میری سوچوں کے سارے دروازے بند ہو گئے تھے، کرٹل نے واقعی مجھے ناقابل یقین صورت حال سے دوچار کر دیا تھا، بھیڑیے اور بھڑکی دوستی کا کون یقین کر سکتا تھا؟ میٹر نی ہوم کے گرد کانٹے دار تار اور گیٹ پر مسلح دو گارڈ دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ ہاسٹل کو بھی فوجی مقاصد کی بھیئت چڑھا دیا گیا تھا، گیٹ سے جیب گزری تو گارڈز نے آرڈر سلوٹ دیا۔ کرٹل نرائن کا آفس آپریشن ٹھہر گیا تھا۔ سرخ پٹا گلے میں لٹکائے کرٹل کا حوالدار انٹینڈنٹ کرٹل شو بھراج کو دیکھ کر تن کر کھڑا ہو گیا تھا۔

مجھے باہر برآمدے میں چھوڑ کر جب وہ اندر گیا تو میرے اندر کے جہانگیر نے مجھے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دی لیکن میں نے اس خیال کو فوراً جھٹک دیا تھا، اگر کامیابی کا امکان ایک فیصد ہو تب بھی ایک اچھا کمانڈو اندھی چھلانگ لگانے سے دریغ نہیں کرتا، جب کہ کرٹل شو بھراج نے میرے سامنے روشن راستہ رکھ دیا تھا۔

کال نیل سن کر حوالدار مارچ کرتا ہوا اندر گیا اور پھر اسی انداز میں باہر نکل کر بولا۔

”سر۔ آپ کو کرٹل صاحب نے یاد کیا ہے۔“ میں نے اسے ہلکی سے مسکراہٹ دی اور پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا، چونکہ میں ننگے سر تھا اس لیے اینٹیاں جوڑ کر کرٹل کو

تقظیم دی تھی۔

”ویل کم انسپکٹر۔“ بھاری سفید مونچھوں سے اس کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔
”شوبھی سے جو معاملات تم طے کرو گے میں اس کی ایڈوائس اپروڈل دے رہا ہوں، مجھے
صرف اتنا کہنا ہے کہ..... ہمارے بتائے ہوئے راستے پر جب تک چلتے رہو گے دنیا کی
ہر سولت تمہارے ساتھ چلے گی۔ ہم اپنے وفادار دوستوں کا بے حد خیال رکھتے ہیں،
جب کبھی یہ راستہ چھوڑنا چاہو تو اُس وقت سے سانسوں کو گن لیتا ہم فاصلے کے مطابق ہی
سانسوں کی سہمت دیا کرتے ہیں۔“

”میں نے زندگی میں صرف ایک حماقت کی ہے سر۔“ میں نے مضبوط لہجے میں
کہا۔ ”اس پہلی اور آخری حماقت کی تلافی کرنے آیا ہوں۔“
”ایک بات میری یاد رکھنا مسٹر جہانگیر۔“ کرٹل نرائن سگار کا ڈبا اٹھاتے ہوئے بولا۔
”جذباتی فیصلہ اور جوانی میں انتقامی کارروائی دونوں خطرناک ہوتے ہیں، تمہیں فری ہینڈ
رکھا جائے گا لیکن میں چاہوں گا تم پہلے اپنے قدم جماؤ پھر ہدف پر فائر کرو۔“

کرٹل شوبھراج نے کرسی سے اٹھ کر اپنے فل کرٹل کو سلوٹ کیا تو میں نے ایک
طرف ہٹ کر اسے راستہ دے دیا۔ جب وہ دروازے سے نکل گیا تو میں نے کرٹل نرائن
کو الوداعی سلام کیا اور ایڈیوں پر گھوم کر برآمدے میں گیا، کرٹل شوبھی جیب کے پاس جا کر
سگریٹ سلگانے لگا تو ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ نے سلوٹ مار کر اس سے کوئی بات کی۔

”درشن سنگھ۔“ کرٹل نے سکھ ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ ”صاحب کو واپس میرے
کمرے میں لے جاؤ، ہاں انسپکٹر تم شام تک آرام کرو میں ملازم کو ٹیلی فون پر ہدایات دے
دوں گا۔ مجھے آفس میں کچھ کام کرنا پڑے گا۔“

”میرے بھی کچھ ادھورے معاملات ہیں سر۔“ میں نے انگریزی میں کہا۔ ”جو مان
اور عزت آپ نے دی ہے اس کے بھروسے پر میں شام تک پریشن سلف اور جیب ساتھ
رکھنا چاہتا ہوں کچھ اشارے جو میں سمجھ سکا ہوں مستقبل کے لیے یہاں مضبوط اور قابل
اعتماد رابطوں کی ضرورت ہوگی۔ آپ کی اجازت کے ساتھ فی الحال میں ڈبل ٹیم کھیلنا
چاہوں گا۔“

کرٹل شوبھراج نے لحظہ بھر کچھ سوچا اور پھر مجھے ساتھ لے کر اپنے آفس میں گیا۔

وہاں وہی نو عمر لیفٹیننٹ لڑکا وائلیس سیٹ پر جھکا بول رہا تھا۔

”میری آن بوائے۔“ لیفٹیننٹ کو چونکتے دیکھ کر کرٹل نے اسے ہاتھ کا اشارہ دیا،
میری آنکھیں تو کرٹل پر تھیں مگر سماعتی توجہ لیفٹیننٹ کی جانب تھی وہ کسی کو کریک ڈاؤن
ختم کرنے کا حکم پاس کر رہا تھا۔

”یہ لو پریشن کارڈ۔“ کرٹل شوبھی نے ہاتھ کے مونو گرام والا کارڈ میری طرف
بڑھا دیا۔ ”تم کسی کی بھی ناک میں گھس سکتے ہو۔“ اس نے خوش دلی کے مظاہرے کے
لیے قہقہہ لگایا۔ ”اپنی تھنگ مور؟“

”ایک لانگ ریج ٹرانسمیٹر ودھ فریکوئنسی سر۔“ میری درخواست پر اس نے ٹیلی
فون سیٹ پر انٹرئل نمبر ڈائل کیا، جب کوئی رابطے پر آیا تو کرٹل نے اسے جی ایس تھری
ٹرانسمیٹر اشو کرنے کا حکم دیا۔ ایڈیو نیشن اسٹور شاید دور تھا مجھے انتظار میں کرٹل کی باتیں
اور ایک کپ چائے پینا پڑا تھا۔

میں نے جب کارڈ ڈرائیور کو دکھایا تو اس نے فوراً جیب کی چابی اور ڈاکومنٹ
حوالے کر دیے تھے۔ کارڈ واقعی جادو اثر تھا۔ ڈرائیور بھی اس کی جھلک دیکھ کر مسحور ہو
جاتے تھے، جس طرح پرانے وقتوں کے بادشاہوں کی انگوٹھیوں کے سامنے کوئی دروازہ بند
نہیں رہ سکتا تھا۔

ایک گھنٹے کی تلاش کے بعد مجھے کرٹل اشوک کی یونٹ ملی تھی۔ وہ بارہ مولا روڈ پر
شر سے تقریباً دس کلومیٹر دور دو پہاڑیوں کے درمیان فارسیٹ ڈیپارٹمنٹ کے ریٹ
ہاؤس میں کیمپ تھا۔ عمارت میں آفس اور کرٹل اشوک کی فیلٹی تھی اور پچاس گز کے
فاصلے پر چاروں اطراف کا علاقہ خیموں کا تھا۔

گارڈ نے مجھے فوراً سیکنڈ ان کمانڈ میجر جوشی تک پہنچا دیا۔ جب وہ بولا تو میں نے
اسے آواز سے پہچان لیا تھا۔ یہ وہی تھا جو غلام علی نون کو وہاں سے لے آیا تھا۔ ”ہماری
اطلاع کے مطابق کرٹل اشوک کمار لا پتا ہے۔“ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہی تحکمانہ لہجے میں
کہا۔ ”یہ کارروائی یقیناً دہشت گردوں کی ہے، اگر کرٹل کو زندہ رکھا گیا ہے تو اس میں
شک نہیں کہ وہ لوگ تبادلے میں اپنا کوئی بڑا لیڈر طلب کریں گے، آپ جو شخص وہاں
سے لائے ہیں وہ کرٹل اشوک کا باپ ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں ایک اعلیٰ آفیسر کے باپ

کو آپ کیوں لائے ہیں؟

”اس لیے۔“ میجر جوشی کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ”وہ کرئل کا باپ نہیں ہے۔“

”اوہ..... واقعی۔“ میں نے چونک کر پوچھا۔ ”میرے لیے یہ خبر بڑی خوشگوار ہے، کیا اسے یہاں لایا جاسکتا ہے آفیسر؟“

”ہاں، لیکن.....“

”سنو آفیسر۔“ میں جھک کر رازدارانہ انداز میں بولا۔ ”کرئل اشوک کا خاندان دہشت گردوں کی قید میں ہے اور صرف یہی شخص جانتا ہے کہ وہ کہاں ہے، ہم اس سے معذرت کریں گے اور آزاد کر دیں گے کیا آپ میری بات سمجھ رہے ہیں۔“

”ہاں۔“ میجر جوشی نے سر کو اٹاتی جنبش دی۔ ”وہ کسی نہ کسی طرح اپنے لوگوں سے رابطہ قائم کرے گا اور اس طرح ہم کرئل کے خاندان تک پہنچ جائیں گے۔“

”مجھے اپنی آرڈر فورس کے آفیسرز کی ذہانت پر فخر کرنا چاہیے۔“ میں نے تعریفی لہجے میں کہا۔ ”میرے آدمی سایہ بن جائیں گے اس کا۔“

غلام علی کو کہیں قریب ہی رکھا گیا تھا، جب اسے چار فوجیوں کی نگرانی میں لایا گیا تو میں اسے پہچان نہ سکا۔ اس کا میک اپ کھچ دیا گیا تھا اور اس کے اصل چہرے پر تشدد کے نیلے اور سرخ نشانات تھے۔ اس نے یقیناً مجھے پہچان لیا تھا کیونکہ میں اپنی اصل شکل میں تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے دکھ ہوا تھا۔

”بڑے صاحب۔“ میں نے نرم آواز میں کہا۔ ”ہمارے صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہمارا مقصد آپ بزرگوں کو پریشان کرنا نہیں ہے۔ ہم وادی میں امن اور محبت کی فضا قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک وادی کے تمام لوگ محترم ہیں، کیا آپ خود اپنے گھر تک چلے جائیں گے۔“

”نہیں۔“ غلام علی نے کہا۔ ”میں چل نہیں سکتا۔“

”یہ رکھ لیں۔“ میں نے کچھ نوٹ غلام علی کے خون آلودہ ہاتھ میں دیے۔ ”شہر تک میں پہنچا دوں گا آگے آپ کرائے کی سواری کر لیجئے گا۔“

”میں ان کو گھر تک پہنچا دوں گا۔“ میجر جوشی نے کہا تو میں نے اسے آنکھ سے

اشارہ کیا کہ اسے جانے دو۔ میجر جوشی کا اضطراب اس کے چہرے پر لہریں مارتا رہا اور میں غلام علی کو لے کر وہاں سے نکل گیا تھا۔ میری نگاہوں سے میجر جوشی کا وہ شکاری کتا پوشیدہ نہ رہا جو موٹر سائیکل پر پیچھے لگایا گیا تھا۔

”بچے تو بخیریت ہیں نا؟“ باہر آتے ہیں غلام علی نے پوچھا۔

”ہاں بالکل محفوظ ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن اب آپ وہاں تک نہیں جا سکیں گے۔ ایک شخص تعاقب میں ہے۔ کیا آپ اپنی حفاظت کر لیں گے؟“

”کسی گمنجان محلے کی گلی میں اتار دیتا۔“ غلام علی نے کہا۔ ”کسی مسلمان گھرانے میں پناہ مل جائے گی۔“ جوں ہی موٹر سائیکل سوار جیب کو اوور نیک کرنے کے لیے سائڈ میں آیا میں نے چاروں اطراف کا جائزہ لیا اگر مجھے تھوڑی سی ویران جگہ مل جاتی تو میں اسے ٹھکانے لگا دیتا لیکن کریک ڈاؤن اور کرفیو کی نرمی نے انسانوں کو باہر اگل دیا تھا۔ ساری سڑکیں مصروف تھیں۔

میں نے اسپینڈ بڑھائی اور ایک اندھے موٹر پر غلام علی کو ڈراپ کر دیا۔ سامنے دو گلیاں تھیں۔ غلام علی زخمی ہونے کے باوجود دوڑتا ہوا ایک گلی میں داخل ہو گیا پھر میں موٹر سائیکل والے کو سڑکوں پر دوڑاتا رہا تھا۔ جب ایک دکان کے سامنے میں نے جیب روکی اور بلا ضرورت سگریٹ خریدنے گیا تو میں نے اسے خالی جیب دیکھ کر بوکھلاہٹ میں واپس مڑتے دیکھ لیا تھا۔

یہ ایک خطرناک قدم تھا پھر جوشی کسی بھی وقت کارڈ کی روشنی میں کرئل شو بھی تک رسائی حاصل کر سکتا تھا اور اگر مجھ سے جواب طلب کیا جاتا تو میں ان کو مطمئن نہیں کر سکتا تھا۔ بات کرئل اشوک اور اس کے ساتھیوں سے مدھوک اور اس کے گھروالوں کی گمشدگی تک جاسکتی تھی۔ اس کے باوجود میں نے رسک لے کر غلام علی نوٹ کو رہائی دلائی تھی اور میں خطرات کو اگر ایک پلڑے میں رکھتا تو بھی کامیابی کا پلڑا بھاری رہتا۔ مجھے اپنی ذات کی پرواہ نہ تھی۔ میں نے بقول کرئل شو بھی اپنی ناگوں سے ٹائم بم باندھ کر ریوٹ کنٹرول کرئل کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔

ایک بچے اور فعال حریت پسند کی موت سے جدوجہد کو جو نقصان ہوتا وہ میری گرفتاری یا موت سے کہیں زیادہ تھا۔

اگلے تین دن میں بالکل لاوارث رہا تھا۔ کرنل شو بھی اچانک جنرل ہیڈ کوارٹر کے لیے فلائی کر گیا تھا۔ میری خدمت کے لیے اس کا ملازم ہر وقت الہ دین کے جن کی طرح قریب رہتا تھا چونکہ کرنل کی موجودگی میں جیب میری تحویل میں آگئی تھی۔ جاتے ہوئے اس نے مجھے 'نہ کسی دوسرے کو حکم دیا تھا اس لیے مجھ سے جیب واپس نہیں لی گئی تھی اور نہ ہی مجھ پر کوئی پابندی تھی۔

رات آٹھ بجے کھانا کھاتے ہی میں جیب لے کر نکل گیا۔ جب شر سے باہر نکلا تو پولیس اور سیورٹی فورسز کی مشترکہ ناکہ بندی پر مجھے رکنا پڑا۔ جیب کے دائیں صوبیدار اور بائیں ایک انسپٹر آیا تھا۔ جیب آرمی کی تھی اور میں سادہ لباس میں تھا۔

”جوائنٹر تم!“ انسپٹر مدن لعل مجھے دیکھتے ہی چیخا تھا۔ ”تم تو.....“

”آئی ڈینٹی پلیر۔“ صوبیدار نے انسپٹر کی بات دبا دی۔ میں نے مسکرا کر جیب سے کارڈ نکال کر صوبیدار کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ ”تھینک یو سر۔“ اس نے کارڈ واپس دیا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر کھٹ سے سلوٹ کیا۔

”مدن پیارے۔ دوسرے دوستوں کا کیا حال ہے؟ میں کسی دن آؤں گا۔“ میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”سب کو بتا دینا میری خدمات آرمی نے مستعار لے لی ہیں۔“

”ضرور آنا۔“ مدن نے آنکھ دبا کر کہا پھر کان پر جھک کر بولا۔ ”انسپٹر انوما کے لیے اس نے گھونٹا بدل لیا ہے۔ آج کل اے ایس پی دریاہم کے گھونٹے میں انڈے دے رہی ہے۔“

”اوہ۔“ میں نے منہ بنا کر کہا۔ ”پھر تو ضرور آؤں گا۔ اسے بھی پیغام پہنچا دینا میرا۔“ میں نے بریک سے پاؤں ہٹایا تو جیب غراتی ہوئی نکل گئی تھی۔

حضرت شاہ صاحب کے چند خدمت گاروں کے علاوہ کیمپ میں کوئی نہ تھا۔ سرفراز اور زبیدہ نے شہر میں مکان لے لیا تھا۔ گل احمد واپس اپنے ساتھیوں کے درمیان چلا گیا تھا اور ہتول کو شاہ صاحب نے انڈیا کے لیے روانہ کر دیا تھا۔

”وہ لوگ تمہیں سچ سچ عبد العلی تو نہیں بتانا چاہتے ہیں جوائنٹر۔“ کرنل شو بھی کی تمام باتیں سن کر شاہ صاحب بولے۔ ”اگر ایسا ہوا تو واپس چلے جانا بیٹے۔ میں نہیں چاہتا تم کسی اپنے ہی بھائی کی اندھی گولی کا نشانہ بن جاؤ۔“

”میرا خیال ہے وہ مجھے کس خاص مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔“

”وہ بڑے محتاط شیطان ہیں جوائنٹر۔“ شاہ صاحب نے کہا۔ ”ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا اتنی جلدی وہ اعتماد نہیں کریں گے۔“

”میں آپ کی ہدایت کی روشنی ساتھ لے گیا ہوں حضرت صاحب۔“ میں نے کہا۔

”مجھے اللہ تعالیٰ کی مدد پر بھی بھروسہ ہے۔ مجھے شاید پھر ادھر آنے کی مہلت نہ ملے۔ آپ میری فریکوئنسی کسی طرح انو تک پہنچا دیجئے گا۔ میں نے ٹرانسمیٹر حاصل کر لیا ہے۔“

شاہ صاحب نے مجھے محتاط رہنے کی پھر ہدایت کی اور دعاؤں کے ساتھ روانہ کیا تھا۔ انو اور زبیدہ سے ملاقات نہ ہونے کا دکھ سمیٹ کر میں رات ایک بجے جب خواب گاہ میں داخل ہوا تو ملازم فوراً حاضر ہو گیا۔

”آپ کے لیے ضروری پیغام۔“ اس نے مہربان لہجہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ہیڈ کوارٹر سے دو آدمی پوچھنے آچکے ہیں۔“ لفافے کے کونے پر سرخ حروف میں ”ٹائپ پرائمری“ درج تھا۔ میں نے اندر سے ٹائپ شدہ کانڈ نکال کر ملازم کو کھانا لانے بھیج دیا۔

”جوائنٹر! تم بلا تاخیر دہلی کے لیے چل پڑو۔ رائل ہوٹل میں تمہارے لیے روم نمبر 403 مسٹر روبن کے لیے بک کروا لیا گیا ہے۔ مزید ہدایات تمہیں وہاں ملیں گی۔“

بچے کرنل شو بھی کا نام تھا۔

ابھی ملازم برتن بھی نہ اٹھانے آیا تھا کہ دستک دے کر ایک فل یفینینٹ نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس نے پوچھا کیا میں روائگی کے لیے تیار ہوں؟ میرا جواب اثبات میں پا کر وہ کرسی پر بیٹھ گیا اس کی کالی بھور آنکھوں میں نیند کے سرخ ڈورے تیر رہے تھے اور چہرے پر کبیدگی طاری تھی۔

”کیا تم میرے ساتھ جا رہے ہو یفینینٹ؟“

”یس سر۔“ اس نے جواب دیا۔ میں کاپٹر کا پائلٹ یفینینٹ آنند ہوں۔“ کاپٹر کا کن کر میرے ہونٹ دائرے میں سکڑے تو نوجوان آفیسر نے جمابہی لے کر کپ بورڈ کی جانب دیکھا۔ ”میں گرم گرم کافی کی طلب محسوس کر رہا ہوں سر۔“

میں نے ملازم کے لیے کال بیل بجائی۔ جب ملازم آیا تو اس کے ہاتھوں میں دو گ تھے۔ عجیب شخص تھا مطلوبہ کافی لے آیا تھا۔

جب ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہو رہا تھا تو دائیں جانب دور میں نے آگ کے رقص کرتے شعلے دیکھے اور دل دکھ سا گیا۔ مجھے یقین تھا مسلمانوں کا کوئی گاؤں جل رہا تھا۔ وادی پر تاریکی کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ وہ میرے اندر کا احساس تھا یا واقعی وادی سوگوار بیوہ جیسی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ زمین کا ٹکڑا جسے ہر دیکھنے والی آنکھ نے جنت کا ٹکڑا کہا تھا۔ جل رہی تھی اجڑ رہی تھی اور سوگوار تھی۔

میں ایک طرف جھکا ٹھماتی روشنیاں اور ان کے درمیان اپنے جھن کا ٹوٹا ہوا بلبل تلاش کر رہا تھا کہ میری آنکھوں نے معاً ایک تاریخی شعلہ پہاڑ کی طرف سے اوپر اٹھادیکھا شعلے کا رخ میری جانب تھا۔ میں کوئی سویلین شہری نہ تھا کہ شعلے کو نہ پہچان سکتا۔ ہمارے کاپٹر پر فائر ہوا تھا پھر پائلٹ نے شاید ہدف کو ہٹانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہیلی کاپٹر ایک دم بائیں جانب جھکا تو میں لڑھک کر بائیں سیٹ پر جا گرا۔

”کاپٹر ہٹ ہو گیا ہے۔“ پائلٹ کی آواز سنائی دی۔ ”میں نیچے جا رہا ہوں۔“ مجھے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی لیکن اس کی بات کا مطلب سمجھ نہ آیا تھا کہ نیچے سے اس کی مراد کاپٹر اٹارنا ہے یا وہ مجھے زخمی پرندے کے پیٹ میں چھوڑ کر خود ہوائی جھلانگ لگا رہا ہے۔ ہیلی کاپٹر وزنی گھڑی کی مانند نیچے گر رہا تھا اور میرا سانس سینے سے اچھل کر حلق میں پھنس گیا تھا۔

ہیلی کاپٹر ایک قلابازی کھا کر پھر خود بخود سیدھا ہو گیا تھا۔ یہی وجہ رہی تھی کہ میرا توازن درست ہو گیا تھا۔ پائلٹ اپنی سیٹ پر اوندھا ہو گیا تھا شاید قلابازی کے دوران اسے شدید ضرب آئی تھی یا حادثے کے خوف نے اسے موت سے پہلے مار دیا تھا۔ حالانکہ اسے ہنگامی حالات سے مقابلہ کرنے کی باقاعدہ تربیت دی گئی ہوگی۔ جب مجھے تربیت کے لئے ہیلی کاپٹر اسکو ارڈن میں بھیجا گیا تھا تو ہمیں تا صرف کاپٹر کو آپریٹ کرنے کی ٹریننگ دی گئی تھی بلکہ فضائی جھلانگوں اور ہنگامی حالات میں خود کو پہچانے کے بہت سے گر جتائے گئے تھے۔ حفاظتی بیلٹ کو نوچ کر میں کسی ٹڈے کی مانند کود کر پائلٹ پر جا گرا تھا اور پھر دائیں جانب کی اسکرین سرکانے کا بٹن دبا دیا۔ نیچے جھک کر دیکھا، رات کے باوجود جھیل کے پانی میں روشن آسمان کا تاروں بھرا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ میں جھکا فاصلے کا اندازہ لگا رہا تھا جب میرے اندازے نے مجھے فضا میں دھکیل دیا تو میں نے فضا میں ہاتھ پاؤں پھیلا کر تین

کروٹیں یا قلابازیاں لیں تاکہ اوپر سے آتے کاپٹر کی زد سے دور نکل سکوں۔ کشش ثقل کے اصول کے تحت وزنی جسم کو تیز رفتاری سے نیچے جانا تھا کاپٹر مجھ سے کئی سو گنا بھاری تھا۔

ابھی میں فضا میں ہی اپنے بگڑنے توازن کو سنبھالنے میں مصروف تھا کہ ہیلی کاپٹر شور دھماکے کے ساتھ پانی میں گرا۔ جب پانی اور میرا فاصلہ کم ہوا تو میں نے بدن کو ایک دم الٹا کر دیا تھا اور ہاتھ جوڑ کر آگے کر لیے۔ وہ ڈائیو کا آزمودہ انداز تھا۔

ایک خطرہ جو جھیل کے کناروں پر ہو سکتا تھا اسے میں پانی میں نیچے اترتے وقت بھی نہ بھولا تھا، کاپٹر جن ہاتھوں نے تباہ کیا تھا یقیناً جھیل کے آس پاس ہی تھے اور اپنی کامیابی کو دیکھنا بھی ان کے لیے یقیناً خوش گوار عمل تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ پانی سے ابھر کر برسٹ کا نشانہ بن جاؤں۔ ’کون سوچ سکتا تھا کہ انڈین ہیلی کاپٹر میں ایک مسلمان سوار ہو گا۔ پانی سے زندہ ابھرتے دیکھ کر کوئی جذباتی مجاہد گولی مار سکتا تھا۔ اس خطرے کے باوجود مجھے ایک لمحہ کے لئے آکسیجن کے لئے پانی سے کم از کم ناک باہر نکالنا تھی، کیونکہ بلندی سے جب میں عمودی انداز میں گرا تھا تو بہت گہرائی تک اتر گیا تھا جب بدن کو روک کر اوپر جانے کا عمل کیا تو سینے میں گھٹی ہوئی سانس ضبط کے کنارے چھوٹنے لگی تھی۔

میں نے بہ آہستگی پانی سے چہرہ اوپر اٹھایا تھا تاکہ پانی کی آواز پیدا نہ ہو۔ ابھرتے ہی میں نے آنکھیں کھول کر تیز رفتار ریڈار کے مانند چاروں اطراف کا جائزہ لے لیا تھا۔ مجھ سے کچھ دور دو بجرے کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ برقی نظام تھا سرخ روشنیاں جھللا رہی تھیں۔ تیرتا آسمان تھا لیکن تیرنے میں خطرات تھے لہذا ڈبکی میں جا کے میں نے بجزوں کی جانب بڑھنا شروع کیا۔ جب تازہ ہوا کی ضرورت محسوس ہوتی چند سیکنڈ کے لئے سطح آب پر چہرہ ابھار لیتا تھا۔ میری سابقہ معلومات کے مطابق نوے فی صد مسلمان اس دھندے میں تھے لیکن دس فی صد میں یہ بجرے ہو سکتے تھے، اگر کوئی سکھ یا ہندو بجرے پر ہوتا تو میرے لئے مسائل پیدا ہو جاتے۔ میں نے پہلے بجرے کے گرد چکر لگایا دو سرا بجزا بیس تیس گز دور تھا۔ ملاح سوئے ہوئے تھے یا خنک ہواؤں سے بچنے کی خاطر اوٹ میں تھے، کوئی حرکت تھی نہ زندگی کے آثار تھے۔ میں نے سوچا ممکن ہے بجزوں کو لنگر انداز کر کے وہ لوگ خشکی پر چلے گئے ہوں۔ میں ایک دو گھنٹے اور پانی میں رہ سکتا تھا میرے اعصاب

عقل مندی نہ تھی اس لیے اللہ کا نام لے کر میں نے بازوؤں کے سارے جسم کو اوپر اٹھایا اور پھر ڈولتے بجرے کے اندر چلا گیا۔

دو تین منٹ گیلے فرش پر بے حس و حرکت لیٹا رہا اور سن گن لینے کے بعد ہاتھ پاؤں کے بل چلتا ہوا اس کیبن کی جانب گیا جس کی درزوں سے دھندلی دھندلی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ ایک قدرے فراخ جھری سے آنکھ لگائی۔ سامنے جو منظر آنکھ نے دیکھا وہ اتنا شرم ناک تھا کہ میں بے اختیارانہ پیچھے ہٹ گیا تھا۔ ایک عورت قدرتی لباس میں ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی اس کے منہ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ دو مرد دائیں بائیں کھڑے تھے اور ایک رخ بدل بدل کر عورت کو قابو کرنے کی جنگ لڑ رہا تھا۔ غالباً دونوں اس دلچسپ جنگ سے محظوظ ہو رہے تھے۔ عورت تڑپ کر جوں ہی اٹھنے کی کوشش کرتی اس کا دمقابل اسے بالوں سے پکڑ کر گرا دیتا۔ ایک بار اس نے عورت کے سینے پر لات بھی ماری تھی۔ ضرب کھا کر عورت منہ کے بل اوندھی ہو گئی تھی۔

معاً میری چھٹی جس نے مجھے احساس دلایا کہ میری پشت پر کوئی کھڑا ہے۔ میں نے گردن گھمائی وہ ایک قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کے شانے پر کمبل یا شال لٹک رہی تھی۔ میں نے بچوں پر جسم کا بوجھ ڈالا اس سے قبل کہ میں اس سے ٹکراتا اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھالے تھے۔ گویا اس نے شکست قبول کر لی تھی۔ میں اسے دھکیلتا ہوا کنارے تک لے گیا تھا۔

”میں ان بجزوں کا چوکیدار ہوں۔“ وہ سرگوشی میں بولا۔ ”اندر بھارتی فوجی ہیں ابھی دس منٹ پہلے ان کا بجرا یہاں آیا ہے۔ کیا تم بھی.....“

”نہیں۔“ میں نے زیر لب کہا۔ ”میں ان کا تعاقب کرتا ہوا تیر کر یہاں آیا ہوں۔ یہ عورت کون ہے.....؟“

”کوئی مسلمان ہوگی، روزانہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ لوگ کسی لڑکی کو پکڑ لاتے ہیں ادھر ٹیکری پر ان کا کیمپ ہے۔“

”کیا تمہاری موجودگی سے وہ آگاہ ہیں؟“

”ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ہر رات میری موجودگی میں شیطانی کھیل ہوتا ہے۔ مجھے سگریٹ اور بسکٹ اور کبھی نقدی دے جاتے ہیں۔ میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ جب

مجھے سگریٹ اور بسکٹ اور کبھی نقدی دے جاتے ہیں۔ میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ جب کشمیری قوم کے مردان کو نہیں روک سکے۔“

میں دانت پیس کر رہ گیا تھا۔ جی تو چاہتا تھا کہ اس بے غیرت کو اٹھا کر پانی میں پھینک دوں جو سگریٹوں اور بسکٹوں کے عوض مسلمان عورتوں کے قاتلوں کی خدمت کرتا تھا۔

”کیا تم میری تھوڑی سی مدد کر سکتے ہو؟“

”کیا کرو گے؟“

”مظلوم عورت کی مدد۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم کیبن کا دروازہ کھلوادو۔“

”ٹھیک ہے لیکن تم میری پشت پر رہو گے تاکہ میں کہہ سکوں کہ تم نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔“

اس نے دستک دی۔ میں بالکل خالی ہاتھ تھا اور مقابلہ تین سے تھا۔ میں نے چوکیدار کے ہاتھ سے لاشی لے لی۔

”میں ہوں مومج دین باہر آپ کی پولیس ہے۔“

دروازہ فوراً کھل گیا تھا۔ تیسرا شخص جس نے عورت پر قبضہ کر لیا تھا اچھل کر اٹھا تھا۔ باقی دونوں سر جھکائے جوں ہی باہر نکلے ایک ایک ضرب نے دونوں کو گرا دیا تھا۔ ان کو پھلانگ کر میں اندر داخل ہوا تو تیسرا مجھے دیکھتے ہی کونے میں اکڑوں انداز میں دبک گیا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا اسٹول پر عورت کا لباس پڑا ہوا تھا۔ میں نے چادر اٹھا کر اس پر پھینک دی۔ اس نے فوراً خود کو ڈھانپ لیا تھا۔

”اے تمہارا تعلق کس یونٹ سے ہے؟“ میں نے گرج دار لہجے میں پوچھا۔

”تھا۔ تھرڈ مونٹ بیٹری۔“ وہ گھٹکیا لگا۔

”ریٹک؟“

”نائیک..... مم..... مجھے شاکر دیجئے سر غلطی ہو گئی ہے۔ کیپٹن شام کے لیے اسے لائے تھے ان کو اس سے بہتر مل گئی تو یہ ہم.....“

میں نے پوری قوت سے اس کی کھوپڑی پر ضرب لگائی۔ اس کا منہ کھل گیا تھا اور پھر وہ اوندھا ہوتا چلا گیا تھا۔ جب میں نے خاتون کی جانب دیکھا تو وہ منہ سے پٹی کھول چکی

تھی۔

پچیس اور تیس برس کی وہ خوبصورت جوان عورت تھی۔ چہرے پر دانتوں کے نشان ابھی تازہ تھے۔ ”تم لباس پہن لو۔ میں باہر جاتا ہوں۔“ میں نے اسٹول اٹھا کر اس کے قریب رکھا اور باہر نکل گیا تھا۔ چوکیدار نے دونوں مضروب فوجیوں کی مشکیں اپنی چادر پھاڑ کر کس دی تھیں۔ دونوں ابھی تک بے ہوش تھے، اگر وہ صرف فوجی ہوتے تو انسانیت کے نائے میں ان کو خشکی تک لے جاتا مگر وہ صرف فوجی ہی نہیں بلکہ درندے تھے اور ایک معصوم عورت کی بے حرمتی کرنے کا جرم بھی ان سے سرزد ہو چکا تھا لہذا ان کے گندے وجود کو میں ساتھ لے جانے کا فیصلہ نہ کر سکا تھا۔“

تینوں کو باری باری پانی کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

”اچھا کیا آپ نے۔“ چوکیدار بولا۔ ”اگر آپ ان کو چھوڑ کر جاتے تو میرے ہاتھوں ان کو مرنا تھا میں ان کو زندہ رکھ کر اپنی سلامتی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔“

”کیا تم بجرے کو کنارے تک لے چلو گے؟“

”کیوں نہیں جناب۔“ وہ سینے پر ہاتھ لاکر بولا۔ ”اب تو آپ کی مدد کر کے مجھے خوشی ہوگی۔ آپ بڑے بہادر ہیں۔ کیا یہ آپ کی.....“

”ہاں یہ میری بہن اور تیری بیٹی ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں تمہیں اس شرط پر چھوڑ رہا ہوں کہ آئندہ تم بے غیرتی کی پٹی عقل پر نہیں باندھو گے۔“

”میں..... میں ایک غریب آدمی ہوں جناب۔“ وہ ندامت بھری آواز میں بولا۔ ”میں جبر دیکھ دیکھ کر واقعی بے غیرت ہو چکا ہوں۔ میری تین جوان بیٹیاں ہیں۔ ایک بیمار بیوی اور بوڑھے ماں باپ ہیں۔ غیرت کی آنکھ کھل گئی تو دو چار کو تو مار دوں گا اور پھر خود بھی زندہ نہ رہ سکوں گا اور میرا خاندان بھوکا مر جائے گا۔“

میں اس کا جواب سن کر ہونٹ چبانے لگا۔

جب بجز کنارے لگا تو میں نے اس زخمی خاتون کو سہارا دے کر خشکی پر پاؤں رکھنے میں مدد دی تھی۔ اس نے اپنا زخمی چہرہ چادر کی بیکل میں چھپا لیا تھا۔ جس حصے میں ہیلی کاپٹر گرا تھا ادھر سرچ لائیٹوں کا جیسے سیلاب آیا تھا۔ پورا علاقہ روشن تھا اور روشنی میں فوجی گاڑیاں اور فوجی حرکت کرتے صاف دکھائی دے رہے تھے۔

ہمارے حق میں یہ بات اچھی تھی کہ وہ لوگ سڑک سے جھیل کے اُس پار تھے، جدھر ہمارا بجز کنارے لگا تھا ادھر کئی پھٹی اور ناہموار زمین تھی۔ کیپ کے فوجی نیم پختہ سڑک سے ادھر چلے گئے تھے۔ وہ سارا علاقہ دیران تھا۔

”اب تم رہنمائی کرو گی۔“ میں نے چوکیدار کا شکریہ ادا کرنے کے بعد خاتون کو مخاطب کیا۔ ”تمہارا گھر یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے؟“

”اس ٹیکری سے پرے۔“ اس نے جنوب کی جانب اشارہ کیا۔ ”لیکن میں شر جاؤں گی۔ میرا خاندان زخمی ہے۔ اس کی ران میں گولی انک گئی ہے۔ میں ڈاکٹر لینے جا رہی تھی کہ ان درندوں نے گھیر لیا تھا۔“

”کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ پہلے تم گھر چلو، مجھے اپنا گھر بتاؤ پھر میں ڈاکٹر لے آؤں گا۔ سارے فوجی الٹ ہیں۔ ان کا ہیلی کاپٹر مار گرایا گیا ہے۔ تمہارا جانا مناسب نہیں ہے۔“

”آپ میرے محسن ہیں۔“ وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ ”آئیے چلیں۔“

فوجی کیپ کی وجہ سے اس نے جو راستہ اختیار کیا تھا دلدلی اور دشوار تھا۔ قدم قدم جھاڑیوں اور اونچی اونچی جگہوں کی وجہ سے سنبھل سنبھل کر چلنا پڑا تھا۔

”آپ وہاں کیسے پہنچے تھے؟“ چڑھائی چڑھ کر اس نے پوچھا۔ ”مجھے تو آواز تک نکلنے کی مہلت نہ دی گئی تھی۔ کیا آپ دوسرے بجرے پر تھے؟“

میں نے ہیلی کاپٹر کو درمیان نہیں آنے دیا تھا ورنہ وہ سوال کرتی اور مجھے جواب میں کوئی کہانی سنانا پڑتی۔

”میرا نام آسیہ وہاب ہے۔ میں ریڈیو سری ٹکڑ میں اسکرپٹ رائٹر تھی۔ اب فری لانسر صحافی ہوں۔ اگر آپ کا تعلق اسی وادی سے ہے تو آپ نے ”چٹان“ میں میری ڈائری پڑھی ہوگی۔ مجھے ایک ماہ پہلے آرمی ایکٹ کے تحت گرفتار کر لیا گیا تھا لیکن وہ ثابت نہ کر سکے کہ تحریر میری ہے کیونکہ میں ایک ریٹائرڈ ٹیچر سے کاپی کروا لیتی ہوں۔ میں نے صاف انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ مجھے بدنام کرنے کی سازش کی گئی ہے۔“

”میں باہر تھا چند دن پہلے آیا ہوں اگر آپ کے پاس چٹان کی کاپی ہے تو میں ضرور پڑھوں گا۔“

”شاید وہاب نے کہیں محفوظ کر رکھی ہو۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تلاش کے

دوران میری لائبریری فوجیوں نے جلادی تھی۔“

ایک کتابھونکتا ہوا آیا تو آسیہ نے اسے آواز دے کر چکارا۔ کتاب دم ہلاتا ہوا قریب چلا آیا۔ آسیہ نے اس کے پنے پر ہاتھ رکھ کر اسے کچھ کہا۔ میں چونکہ چند قدم دور رک گیا تھا۔ اس لیے سن نہیں سکا۔ کتے کو اس نے نہ جانے کیا کہا تھا کہ وہ مجھ پر بھی مہربان ہو گیا تھا۔

”وہ سامنے بڑے درخت والا میرا گھر ہے۔“ اس نے ایک دو منزلہ عمارت کی جانب اشارہ کیا۔ ”میں آپ کو ایک ٹیلی فون نمبر دوں گی۔ آپ ڈاکٹر رضوان کو کسی بھی جگہ سے وہاب اور میرا حوالہ دے کر اطلاع کر دیجئے گا“ آپ کو اس کا گھر تلاش کرنے میں دقت ہوگی۔“

”یہ وہی ڈاکٹر ہے ناجس کالینک نور باغ میں ہے؟“

”اوہ..... ہاں، کیا آپ ان کو جانتے ہیں؟“

”ہاں۔“ میں نے بتایا۔ ”رضوان کی کوٹھی نالہ مار روڈ پر ہے۔“

”بالکل۔“ آسیہ بولی۔ ”لیکن پیدل.....“

۔ ”سواری سے پیدل محفوظ رہتا ہے۔“ میں نے مڑتے ہوئے کہا۔ ”اگر اجازت دو

تو ڈاکٹر کے ساتھ میں بھی واپس آجاؤں۔ مجھے آپ جیسے لوگوں کی پناہ درکار ہے۔“

”مجھے خوشی ہوگی۔“ آسیہ بولی۔ ”وہاب بھی اپنی عزت کے محافظ سے مل کر خوش ہوں گے، ضرور آئیے گا۔“

میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے شب بخیر کہا اور دوڑتا ہوا اترائی اترنے لگا۔

میرے سامنے نالہ مار روڈ تک جانے کے لیے دو راستے تھے ایک مین روڈ جو روشن تھی اور دوسرا دو ٹیکریوں کو عبور کر کے شارٹ کٹ راستہ تھا۔ مین روڈ پر پیدل چلنے کا رسک لینا گویا وادی میں پھیلے ہوئے بھارتی بیلوں کو دعوت مکر دینے کے مترادف تھا۔ ٹیکریوں والا راستہ دشوار گزار تو تھا لیکن محفوظ تھا۔ مجھے معلوم تھا کرائے کے فوجی ویران اور مشکل راستوں کو اختیار نہیں کرتے تھے۔ وہ ڈیوٹی کا وقت مسلمانوں کے گھروں میں گھس کر یا فٹ پاتھوں پر بیٹھ کر گزرنے کے عادی بن چکے تھے۔

میں نے شارٹ کٹ ہی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ڈاکٹر رضوان کی کوٹھی کا محل وقوع مجھے یاد تھا۔ چار کنال میں پھیلی ہوئی دو منزلہ عمارت کا گیٹ مین روڈ کے رخ تھا۔ مین کو گیٹ تک آنے کے لیے طویل ہاتھ دے پر چل کر آنا پڑتا تھا۔ ہاتھ دے کی دائیں جانب گیراج تھا اور بائیں ہاتھ وسیع لان تھا جبکہ مغربی حصہ گنجان آبادی سے جڑا ہوا تھا۔ درمیان ایک تنگ گلی تھی جو برساتی نالے کے جھولتے پل سے گزرتی تھی۔

میں نے گلی والا حصہ استعمال کیا تھا۔ ڈاکٹر نے دو برس قبل گلی کی جانب کھلنے والے دروازے کو مریضوں کے لیے وقف کیا ہوا تھا۔ وہ ان دنوں گھر پر ہی مریض دیکھا کرتا تھا۔

دستک کی آواز تنگ گلی میں گونجی تو سامنے والا دروازہ نیم وا ہوا اور ایک چاند سا چہرہ بلب کی روشنی میں جھانک کر ایک دم اوٹ میں چلا گیا۔

”کون ہے؟“ ڈاکٹر رضوان کی آواز پہچان کر میں نے اپنا نام بتا دیا۔ اس نے ایک پٹ کھولا اور ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھام لیا اور فوراً اندر گھسیٹ کر دروازہ بند کر دیا تھا۔

”ارے واقعی! یہ تم ہی ہو۔“ رضوان نے مجھے ہانہوں میں بھر لیا۔ ”خیریت تو ہے میں تمہاری حالت ٹھیک نہیں دیکھ رہا تمہارا لباس بھی بھیگا ہوا ہے۔“

”پیدل آیا ہوں پسینے سے بھیگ گیا ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”کبھی یہ تمہارا کلینک ہوا کرتا تھا۔“ خالی کمرادیکھ کر میں بولا۔ ”کیا اب مریضوں کو نہیں دیکھتے؟“

”ہاں.....“ وہ میری پشت پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”گھرنہ باہر کہیں بھی نہیں۔“

پریکٹس کالاسنس ضبط کر لیا گیا ہے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو، یہ بتاؤ اس وقت کیسے آئے ہو اور مجھ جیسے خطرناک ڈاکٹر کے پاس، جسے لوگوں کے لیے شجر ممنوعہ بنا دیا گیا ہے۔“

”مجھے آسیہ وہاب نے بھیجا ہے۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”وہاب کی ٹانگ میں گولی پھنسی ہوئی ہے۔“

”یہ آسیہ تمہاری کیا لگتی ہے میرا مطلب ہے کب سے واقف ہے؟“

”کیا تمہارے سوال کا جواب دینا ضروری ہے؟“

”اوہ نہیں۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”میں مذاق کر رہا تھا۔ ہاں باہر سے کب واپس آئے ہو؟“

”چند دن ہوئے ہیں اور ابھی جوائننگ رپورٹ نہیں دی۔ چلو یا صبح سے پہلے تمہیں واپس بھی آنا ہوگا۔“

”کیا تم لباس بدلنا چاہو گے۔“ رضوان نے پوچھا۔ ”جاؤ میرے بید روم میں لباس بدل لو۔ اتنی دیر میں میں بریف کیس تیار کر لوں گا۔“

”بھالی اور بچے کہاں ہیں؟“

”غیر مہذب الفاظ میں کہوں تو کمنا پڑے گا مشکل وقت میں چھوڑ گئے ہیں۔“

”کیا واقعی؟“

”ہاں جوائننگ انکل اپنی بیٹی اور نواسوں کو انڈیا لے گئے ہیں۔ اس لیے کہ ان کی بیٹی کی عزت میاں محفوظ نہ تھی۔ میں معتبہ ڈاکٹر ہوں ہر ہفتے کسی نہ کسی بہانے مجھے انٹیروگیشن سینٹر لے جایا جاتا ہے۔ جب بھی کوئی شکار زخمی ہو کر ان کی دسترس سے فرار ہو جاتا ہے تو وہ سیدھے میرے پاس چلے آتے ہیں۔ حالانکہ وادی کے ستراسی فی صد ڈاکٹروں نے خود کو مجاہدین کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا ہے، مگر ملٹری کا ہدف میں ہی ہوں۔ میرا کلینک بھی سیلڈ ہے۔ میں پریکٹس نہیں کر سکتا۔“

”کیا تم گاڑی لے چلو گے؟“

”نہیں۔“ رضوان نے جواب دیا۔ ”گاڑی لے گیا تو آسیہ کے گھر نہیں بلکہ کہیں

اور پہنچ جاؤں گا۔“

اس نے تمام ضروری سامان بریف کیس میں رکھا اور گیٹ والے راستے میرے ساتھ نکل کر کمپاؤنڈ وال کی آڑ میں چلتا ہوا پھر محلے کی ایک گلی میں داخل ہوا تھا۔ ”یہ تمہارے دروازے کے سامنے کون رہتا ہے؟“ مجھے وہ چہرہ یاد رہا تھا۔

”ایک خوبصورت بلا۔“

”جو تم میں دلچسپی لے رہی ہے۔“

”ہاں۔“ رضوان سنجیدگی سے بولا۔ ”وہ انڈین سکیورٹی فورسز کی انفارمر ہے۔“

”کیا ہندو ہے؟“

”بس انفارمر ہے۔“ رضوان نے جواب دیا۔ ”ایسے بے ضمیر لوگوں کا کوئی مذہب

نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے ہندو ہی ہو مگر اپنا نام مسلمانی بتاتی ہے۔“

”کیا کمنا چاہتے ہو؟“

”اس نے تمہاری کمزوری کو مد نظر رکھ کر مسلمانی کا انتخاب کیا ہوگا۔“

”نہیں دوست۔“ وہ دل گرفتہ لہجے میں بولا۔ ”حالات نے زندہ دل اور عاشق مزاج رضوان کو بالکل بدل دیا ہے۔ میں نے اتنے دل خراش مناظر اور بربریت کے شکار دیکھے ہیں کہ ساری زندہ دلی دکھ کی آگ میں جل گئی ہے۔ وہ میری بیوی کو بھی لے گئے تھے اس کے ساتھ الہ آباد سے آئی ہوئی اس کی چھوٹی بہن بھی تھی۔ جب تیسرے دن ان کو واپس کیا گیا تو دونوں صدے سے نیم پاگل تھیں۔“

مجھے ایسی چپ لگی تھی کہ آسیہ کے گھر تک میں بول نہ سکا تھا۔

رضوان خود بھی اسی شہر کا بیٹا تمام راستوں سے واقف تھا لیکن میں اسے جس شارٹ اور محفوظ راستے سے لے گیا تھا اس نے میری رہنمائی کی تعریف کر کے گویا مجھے حوصلہ افزائی کا انعام دیا تھا۔ عبدالوہاب پر غشی طاری تھی رضوان کے مطابق عبدالوہاب کا تعلق میرٹھ سے تھا جہاں آسیہ کے والد کسی بڑے عہدے پر ملازم تھے۔ آسیہ سے اس کی ملاقات ایک کلچرل شو کے دوران ہوئی تھی۔ عبدالوہاب اپنے ہفت روزہ کی طرف سے آیا تھا اور آسیہ ماہنامہ ”سکھ“ کی نمائندگی کر رہی تھی۔

عبدالوہاب اپنی محبوب بیوی کے ناتے سے کشمیریوں کے شانہ بہ شانہ ہندوستان سے لڑ رہا تھا، اگر آسیہ اس کی زندگی سے نفی کر دی جائے تو وہ خالص انڈین نکل آئے گا۔ ذیل ڈول رنگ اور روپ اور نقش و نگار کے حوالے سے وہ ایک وجیہ نوجوان تھا۔ میں نے اس پر دیکھی اور وفادار نوجوان کے لیے عقیدت اور رکھ محسوس کیا تھا اور اس کی صحت یابی کے لیے دل کے اندر سے دعا نکالی تھی۔

ڈائننگ ٹیبل پر ایک گھنٹہ ڈاکٹر رضوان مصروف رہا تھا۔ میں کھانے اور آسیہ نے اس کی معاونت کی تھی، گولی خاصی دور جا کر ٹھنڈی ہوئی تھی۔ گولی نکال کر رضوان نے چائے کی فرمائش کی تھی۔ آسیہ اسے روکنا چاہتی تھی کیونکہ بارش شروع ہو گئی تھی لیکن رضوان بارش کی آڑ میں واپس چلا گیا۔

آسیہ خود تو اپنے شوہر کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گئی تھی لیکن اس نے بہ اصرار مجھے مہمان خانے میں آرام کرنے بھیج دیا تھا۔ صبح کے آثار طلوع ہو رہے تھے کہ میں سو گیا

مہمان خانے میں آرام کرنے بھیج دیا تھا۔ صبح کے آثار طلوع ہو رہے تھے کہ میں سو گیا تھا۔

جب نیند پوری ہوئی تو دن کے گیارہ بج رہے تھے میں نے غسل کیا اور دروازہ بجا کر اپنی بیداری کی اطلاع دی، آسیہ نیند سے بھری آنکھوں کے ساتھ فوراً چلی آئی تھی۔
”وہاب کیسے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ٹھیک ہیں۔ آپ کو پوچھ رہے تھے۔“
”لیکن تم ٹھیک نہیں لگتیں۔“ میں نے اس کی آنکھوں کی جانب اشارہ کیا۔
”رات میں نے تمہاری بات مان لی تھی اور اب تمہیں میری بات پر چلنا ہوگا اگر ناشتا تیار ہے تو دو اور فوراً سو جاؤ شام تک وہاب کی تیمارداری میں کروں گا۔“
”غوفیہ آگئی ہے۔“ میری چھوٹی بہن ہے۔ میں اسے یہی بتا رہی تھی کہ مہمان جب بیدار ہو جائے تو اسے ناشتا دے دینا۔
”تو پھر تم سونے جا رہی ہو نا؟“

”جی۔“ اس کے سگووار چہرے پر مسکراہٹ کا ہلکا سا رنگ آکر معدوم ہو گیا تھا۔
”اس شرط پر کہ میری نیند کے دوران آپ جانے کی بات نہیں کریں گے۔“
”تم جانتی ہو میں قانون کا نہیں بلکہ دشمن کا مجرم ہوں مجھے پناہ کی ضرورت ہے اور اس گھر سے بہتر جگہ مجھے کہاں ملے گی۔ بے فکر ہو کر سو جاؤ جس دن معذرت کے ساتھ کوگی اُس روز چلا جاؤں گا۔“

”اوہ نہیں۔“ وہ چمک کر بولی۔ ”خدا نہ کرے کبھی ایسا لمحہ زندگی میں آئے۔ ہم لوگ احسان فراموش نہیں ہیں۔ وہاب بھی آپ کے بے حد ممنون ہے۔“
”مجھے اس تک لے چلو۔ ناشتا وہیں کروں گا۔“

”سوری۔“ آسیہ کی نگاہیں جھک گئیں۔ ”ابھی نہیں میں چاہتی ہوں وہ سو جائے آپ ہوں گے تو وہ باتیں کرتا رہے گا۔ ایسا ہی ہے وہ باتوں اور بامروت۔“
وہ چلی گئی اور پھر اس کی ہم شکل بہن ناشتالائی تھی۔

چپاتیاں گرم اور آلیٹ ٹھنڈا تھا۔ اسی چھوٹی سی بات سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ آسیہ کی مالی حالت بہتر نہیں ہے کاش میری پاس کچھ ہوتا تو میں بوقتِ رواجی آسیہ کے

پرس میں ساری رقم رکھ جاتا۔

”کرفیو کی وجہ سے کچھ لانا ممکن نہیں۔“ غوفیہ ناخن کریدتے ہوئے نادم آواز میں بتانے لگی۔ ”میں باجی کی طرف سے پوچھ رہی ہوں آپ کون سی دال پسند کرتے ہیں؟“
”تم نے جو بھی پکالی میں پسند کروں گا۔“ وہ پندرہ سولہ برس کی بچی تھی اس لیے میں آپ جناب کے ٹکلف میں نہ پڑا تھا۔ ”اگر کوئی کام نہ ہو تو بیٹھ جاؤ۔“ وہ شرما کر مونڈھے پر اکڑوں بیٹھ گئی۔ ”ہاں، بے بی تم کس کلاس میں ہو۔“

”فرسٹ ایئر میں تھی، لیکن اب نہیں پڑھتی۔ حالات سے ڈر کر ابو جی نے کالج نہیں جانے دیا۔ ویسے بھی اب تمام تعلیمی ادارے بند ہیں۔“
”سنا ہے فلاخ عام ٹرسٹ کے تحت تمام کشمیری بچے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔“
”جی، لیکن ابو بتا رہے تھے حکومت نے فوج کے کئے پر ٹرسٹ پر پابندی لگا دی ہے۔“

”پابندی قبول کر لی گئی ہے؟“

”نہیں جی۔“ غوفیہ پُر جوش لہجے میں بتانے لگی۔ ”فوج بند کر کے چلی جاتی ہے تو پیچھے پھر اسکول کھل جاتے ہیں۔ کچھ علاقوں میں تو اب رات کی شفٹ بھی لگتی ہے لیکن مجھے گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔“
”ہاں۔ تم جیسے ہیرے کو والدین کیسے ضائع ہونے دے سکتے ہیں۔“ میں نے دل میں کہا تھا۔

”میں جاؤں جی!“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”بارہ بجنے والے ہیں مجھے بہت کام ہے۔“
”تمہاری باجی نے بتایا تھا کہ وہ ڈائری لکھتی ہیں ان کی ڈائری یا کوئی رسالہ مجھے دے جانا اب نیند تو آنے سے رہی۔“

”بہتر۔“ وہ سر ہلاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تو میرے دل سے اس معصوم بچی کی سلامتی کے لیے دعا نکلی تھی۔

دس منٹ بعد غوفیہ جب برتن لینے آئی تو جھان دے گئی۔ مڑا تو اپرچہ غالباً کسی دہنی چیز کے نیچے دبا رہا تھا۔ میں نے سلوٹوں کو وہاں پڑی استری پھیر کر درست کیا اور دو نئے سرے کیے نیچے رکھ کر نیم دراز ہو گیا۔

الف سے یے تک سطر سطر کشمیر سے تعلق رکھتی تھی۔ اس میں کریک ڈاؤن، جنازوں اور اجتماعی آبروریزی اور انٹیروگیشن سینٹرز کی رپورٹیں تھیں۔ کسی گمنام مجاہد کا ایک خط بھی تھا جو اس نے قوم کی ماؤں کے نام بذریعہ چٹان بھیجا تھا۔ خط کی فوٹو شائع کی گئی تھی۔ خط لکھنے والا اردو ادب اور جذبہ آزادی کا شیدائی تھا۔

”کشمیر کی ماں!“

ایک گمنام بیٹے کا عقیدت بھرا سلام!

ماں! تیری جنت پر اغیار کی یلغار ہے، ادھر تیرے بیٹوں کی بھی ایک پکار ہے، آزادی۔ آزادی، ہم تیرے بیٹے تیرے اس کرب سے آگاہ ہیں جو تجھے اپنا سناگ، اپنا بیٹا اور بیٹی کی عصمت گنوانے سے ملا ہے۔ پیاری ماں، تو عظیم ہے یہ تیری عظمت ہی تو ہے کہ ایک بیٹا شہید ہوتا ہے تو تو سو بیٹے اور جہاد کے میدان میں روانہ کر دیتی ہے۔ تو ہر روز بیٹے بھائی شوہر کو کفن پسناتی ہے۔ کبھی ان کی شہادت کی نوید سنتی ہے مگر تیرے پائے استقلال میں لرزش نہیں ہوتی۔ تیری عظمت کے گیت عرش پر حوریں گاتی ہیں جب بھی تیرا کوئی بیٹا جام شہادت پی کر اوپر جاتا ہے فرشتے تیری قسم پر رشک کرتے ہوں گے کہ تو شہید کی بیوہ، شہید کی ماں ہے۔

میری چشم تصور دیکھ رہی ہے کہ تو نے گھر کے سارے رکھوالے میدان جہاد میں بھیج دیے ہیں اور اپنی جوان بیٹیوں کو ممتا کے پروں تلے چھپائے تمام رات عبادت اور خوف میں بسر کرتی ہے۔

ماں! ہم تیرے بیٹے تجھ سے وعدہ کرتے ہیں کہ تیرے ہر زخم میں ہم آزادی کی روشنی بھر دیں گے ہم تیرے بیٹے نئی صبح نیا سورج اور آسمان لے کر ایک دن تیری جنت میں ضرور آئیں گے۔“

میں نے نم ناک آنکھوں کو آستین سے صاف کیا اور آسیہ کی ڈائری تلاش کرنے لگا۔ اس تلاش کے سفر میں ہر ورق پر مجھے مجبوراً کچھ دیر رکنا پڑتا تھا۔ تحریریں قدم روک لیتی تھیں۔ ہر تحریر اپنے اندر نیا انکشاف اور نیا درد چھپائے ہوئے تھی۔ ایک عنوان تھا۔ ”لوگو! کشمیری عوام اپنی آزادی کی جنگ خود لڑ رہے ہیں۔“ مضمون نگار نے دلائل اور حوالوں سے بھارت کے الزام کی تردید کی تھی اور ثابت کیا تھا کہ کشمیری مسلمانوں کو

پاکستان سے کوئی امداد نہیں مل رہی۔ آخری صفحات پر آسیہ کی ڈائری۔ ”بنت کشمیر کی ڈائری“ کے عنوان سے شائع کی گئی تھی۔ ان کی آنکھ کیرے کی آنکھ سے بھی کہیں زیادہ حساس ہے اس آنکھ نے جو دیکھا جو محسوس کیا ادارہ قارئین کے لیے پیش کر رہا ہے۔ ڈائری شروع کرنے سے پہلے قلم کارہ نے تمہیدی نوٹ میں تحریر کیا تھا۔

”میں کسی فرد، گروہ، مذہب، عقیدے ادارے اور حکومت کے خلاف نہیں ہوں۔ میری آنکھوں پر تعصب کی پٹی بھی نہیں ہے۔ میں نے اللہ کی دی ہوئی آنکھوں سے جو دیکھا، محسوس کیا وہی لکھ رہی ہوں۔ میری ڈائری ان دنوں اور اس سفر سے متعلق ہے جب مجھے سکیورٹی فورس نے وادی سے دور پونچھ جیل میں جاکر بند کر دیا تھا۔ وہاں مجھ پر کیا جاتی، میرا قلم اور میری مصلحت کچھ لکھنے نہیں دیتی۔ میں صرف رہائی کے بعد وادی تک کے سفر کے زوداد تحریر کروں گی۔“

7 اپریل 93ء وادی لولاب۔ شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال کی نظم۔ ”وادی لولاب“ میں نے میرٹھ میں طالب علمی کے زمانے میں پڑھی تھی۔

نظم

پانی تیرے چہوں کا ترپتا ہوا سیما
مرغانِ محری تری فضاؤں میں ہیں بیتاب
اے وادی لولاب
بیدار ہوں دل جس کی انفال محری سے
اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے ثایاب
اے وادی لولاب!

لولاب سے میں واقف اسی نظم سے ہوئی تھی۔ تب سے اس حسن کی دیوی کا دیار کرنے کا شوق دل میں سما گیا تھا لیکن یہ معلوم نہ تھا کہ حسن کا دیدار کن حالات اور کیسی قربانی کے بعد نصیب ہو گا۔ ڈاکٹر اقبال نے جو کچھ لکھا تھا اس میں رتی بھر مبالغہ نہ تھا۔ بے

شک یہ وادی خالق کائنات کے حسن تخلیق کا شاہکار ہے۔ درمیان سے شفاف نیلگوں پانی کی ندی گزرتی ہے۔ تاحد نگاہ پھیلے ہوئے دھان کے کھیت۔ جیسے کسی نے میڑھیوں پر سبز قالین بچھا رکھا ہو۔ دھان کی فصل تقریباً تیار تھی۔ بارشوں کی وجہ سے ابھی ہریالی باقی تھی۔

تمام مکان ایک جیسے ہیں، کمرے پلنگوں، کرسیوں اور دیگر آرائشی فرنیچر سے خالی ہوتے ہیں۔ فرش پر وری یا قالین بچھے ہوتے ہیں جہاں مہمانوں کو بٹھایا جاتا ہے۔ وہاں میں نے دیکھا ایک پلیٹ میں ہی سارا خاندان کھاتا ہے۔ البتہ میرے لیے الگ اہتمام کیا گیا تھا لیکن میں نے میزبان کی دونوں بیٹیوں کو اپنی پلیٹ میں شریک کر لیا تھا۔ کھانے کے بعد گرم سا دودھ درمیان میں رکھا گیا اور سب نے اپنی خواہش کے مطابق قہوہ پیا۔

مجھے بتایا گیا کہ وادی میں ہر سال 14 اگست کا دن منایا جاتا ہے اور مجاہدین پاکستانی پرچم کو سلامی دیتے ہیں۔ جیل سے جب مجھے رہا کیا گیا تو میں تنہا تھی اور جیل کے دروازے پر کھڑے نگران مجھے غلیظ نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ مجھے خاتون نگران نے بتا دیا تھا کہ مجھے تنہا بھیج کر راستے میں اغوا کر لیا جائے گا۔ میں کیا کر سکتی تھی لیکن اللہ میرے ساتھ تھا باہر نکلی تو مسلح بھائیوں نے مجھے اپنی پناہ میں لے لیا۔ ایک کو میں جانتی تھی اور وہ میرے لیے ہی وادی سے آیا تھا۔ ایک دن ہم ایک گاؤں سے گزر رہے تھے کہ ایک خستہ حال عورت نے ہمیں روک لیا، وہ رو رہی تھی شاید بچی تھی، لیکن وہ صرف ماں تھی۔

”تم لوگ دھرنیال جا رہے ہو نا؟“ ضعیف نے میرا ہاتھ تھام کر پوچھا۔
”ہاں اماں۔“ میرے ساتھی صدیق نے کہا۔ ”ہم تیری بیٹی کے گاؤں جا رہے ہیں۔“

”آمنہ کو کتنا بدشگونئی نہ کرے اسے تیسرے روز واپس آنا چاہیے۔“ بوڑھی بولی۔
”پتا نہیں آج اسے گئے دو سرائے تیسرا دن ہے۔ تم اسے پہچان لو گے نا اس نے سرخ جوڑا پہن رکھا ہے اور ہاتھوں پر مہندی بھی لگی ہے اس کے۔“

صدیق نے مجھے بتایا کہ بوڑھی سیکنہ کی بیٹی آمنہ کو ایک برس قبل عین اس وقت فوجی لے گئے تھے جب اسے ڈولی میں بٹھایا جانے والا تھا۔ ایک میجر کی سربراہی میں گارڈ آئی تھی ان کو آمنہ کے بھائی شاکر کی تلاش تھی۔ جو فوجی کیمپ میں لکڑیاں پھاڑنے کا کام

کرتا تھا اس نے کسی بات پر مشتعل ہو کر لنگر کمانڈر کو کلہاڑی سے قتل کر دیا تھا۔ شاکر بہن کی شادی میں شریک ہونے آیا تھا۔ کسی خبر نے فوج کو اطلاع دے دی تھی۔ اس دن مقابلے میں شاکر اور دلہا سمیت دس نوجوان شہید ہوئے تھے۔ تب سے سیکنہ آتے جاتے لوگوں کو آمنہ کے لئے پیغام دے رہی ہے کہ اسے تیسرے دن رواج کے مطابق میکے آنا چاہیے۔

بوڑھی سیکنہ شاید اب بھی راہ گیاروں کو آمنہ کے لئے پیغام دیتی ہوگی۔ میں سوچ رہی ہوں نہ جانے کتنی آمنائیں بھارتی درندوں کی بھیٹ چڑھ چکی ہوں گی اور ان کی مائیں ان کی واپسی کی راہ دیکھ رہی ہوں گی۔

علامہ اقبال اب موجود نہیں ہیں لیکن آسمانوں سے ان کی روح جھانک جھانک کر اس ارضی جنت سے اٹھتے ہوئے شعلہ دیکھتی ہوگی اور خوش ہوتی ہوگی کہ ان کی دعا بالا قبول ہو گئی ہے۔ علامہ نے کشمیری قوم کی بد حالی اور غلامی کی خوگر قوم کا ماتم کرتے ہوئے کہا تھا۔

ازاں مے فشاں قطره بر کاشمیری
کہ خاکسترش آفرید شرارے

”اے خدا کشمیریوں پر ایسی شراب کے قطرے برسا کہ اس خاکستر سے آگ کے شرارے پھوٹ پڑیں۔“

ہم اترائیوں، چڑھائیوں ندیوں، نالوں کو عبور کرتے ہوئے جب وادی لولاب کے ایک گاؤں نکلی پوری میں داخل ہوئے تو میرے ذہن کی پلیٹ پر ایک نام ابھرا۔ کاروانِ حریت کے ایک حدی خواں اور بیباک و جری مجاہد محمد اشرف صحرائی۔ مکی پورہ کے مجاہد ان دنوں قائم مقام امیر جماعت اسلامی تھے۔ یہ ذمے داری آپ کو امیر جماعت سید علی گیلانی کی گرفتاری کے بعد سنبھالنا پڑی تھی۔ محمد اشرف صحرائی سے میری ملاقات جماعت کے ایک جلسے میں ہوئی تھی۔ صحرائی کو 1990ء کے موسم بہار میں گرفتار کیا گیا تھا۔ تادم تحریر آپ کھوئے جیل میں اذیتیں جھیل رہے ہیں۔ میں نے ان کا گھر دیکھا نگاہوں سے عقیدتاً دیواروں کو سلام کیا۔ سنا ہے ان کے بیوی بچے سیورٹی فورسز کے چھاپوں کی وجہ سے راتیں کھلے آسمان تلے گزارتے ہیں۔

13 اپریل - بارہ مولا۔

یہ شہر اولپنڈی سری نگر روڈ پر واقع ہے۔ بارہ مولا کی وادی تو آزادی کا ایک اہم مورچہ رہی ہے۔ پروفیسر محمد اشرف صراف کا تعلق اسی حریت پسند وادی سے ہے۔ کنٹرول لائن کے قریب ہے یہی وجہ ہے ہر وقت فوجی بوٹوں اور گولیوں کی آواز گونجتی رہتی ہے۔ اس وادی کو ایک اور بھی اعزاز حاصل ہے۔ جب شہدا کی تعداد آئے روز بڑھنے لگی تو وادی کے لوگوں نے شہدا کے لیے الگ قبرستانوں کا فیصلہ کیا۔ اب مزار شہدا وادی کے چپے چپے پر دکھائی دیتے ہیں۔

پہلا شہید۔ خواجہ صاحب بارہ مولا کا سترہ سالہ پرویز احمد دسویں جماعت کا طالب علم تھا اسے 13 دسمبر 1989ء کو بارہ مولا پل پر فوجیوں نے برسٹ مار کر شہید کر دیا تھا۔ موجودہ تحریک آزادی کا وہ پہلا شہید ہے۔

ہر گاؤں اور ملنے والے شخص نے آنسوؤں، سسکیوں اور آہوں کے ساتھ ہمیں اپنے اپنے شہیدوں کے بارے میں بتایا جن عورتوں، لڑکیوں اور مردوں کو فوج لے گئی تھی ان کی واپسی کا وہ انتظار کر رہے ہیں۔

ہے کہاں روز مکافات اے خدائے دیرِ کبیر؟

20 اپریل سوپور۔

سوپور قائد تحریک آزادی سید علامہ گیلانی کے جذبہ حریت کی وجہ سے وادی میں ممتاز مقام کا حامل ہے۔ اس شہر کے حریت پسندوں نے قربانی و ایثار کی بے مثال داستانیں رقم کی ہیں۔ دریائے جہلم کے کنارے سیبوں کے وسیع و عریض باغات کے درمیان سوپور کا دیدہ زیب شہر واقع ہے لیکن اب یہ آسودہ حال شہر کھنڈرات اور راکھ کا ڈھیر دکھائی دے رہا ہے۔

اس رات ہم حزب المجاہدین جموں و کشمیر کے عارضی کیمپ میں مہمان تھے۔ یہ کیمپ شہر سے چند فرلانگ دریا کے دہانے اور سیبوں کے ایک گھنے باغ کے اندر لگایا گیا تھا۔ کیمپ کمانڈر ایک نوجوان قاسم تھا اس نے بتایا کہ سوپور کو سکیورٹی فورسز نے گھیرے میں لے لیا۔ ہم نے ساتھ جانا چاہا تو قاسم نے بہ اصرار ہمیں جانے سے روک دیا کہ آپ مہمان ہیں اور آپ لوگوں کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔ وہ اپنے چھ ساتھیوں کے

ساتھ چلا گیا تھا۔ تین گھنٹے بعد جب واپس آیا تو وہ خود شدید زخمی تھا اور چار ساتھیوں کو جام شہادت پلا آیا تھا۔ اس نے اس رات کی رواداد سناتے ہوئے بتایا ایک مجاہد ان کی حراست سے فرار ہو کر سوپور کی جانب آیا تھا اس کے تعاقب میں پوری کپینی سوپور میں داخل ہوئی اور گھر گھر تلاشی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مفروضہ تو ان کے ہاتھ نہ لگا وہ گھروں کو لوٹ کر جلاتے گئے اور جاتے جاتے 20 سالہ ثناء اللہ، اس کے بھائی معراج الدین اور بہنوئی غلام محمد میر کو گھسیٹ لے گئے اور سڑک پر جا کر ان کو شہید کر دیا۔ مقتولین کی چار خواتین کی عصمت دری کی گئی اور ان کے روتے معصوم بچوں کو اٹھا کر دوسری منزل سے نیچے پھینک دیا گیا تھا۔ صبح جب ہم سوپور کی گلیوں میں داخل ہوئے تو گلیاں خون اور ٹوٹی پھوٹی چوڑیوں، برتن کی کڑیوں اور پھٹے ہوئے کپڑوں سے بھری پڑی تھیں اور شہر پر سسکتا ہوا سناٹا طاری تھا۔

ایک گھر سے دھواں اٹھ رہا تھا اور جلے ہوئے کواڑوں کے قریب دہلیز پر ایک نحیف بوڑھا بیٹھا آسمان کو گھور رہا تھا۔ وہ شہر کا معروف حکیم عبدالغفور تھا جس کی بہو کو فوجی لے گئے تھے پوتے پوتیاں جلتے بلے تلے دبے ہوئے تھے۔

نفسا نفسی کا عالم تھا کوئی کسی کا پُرساں حال نہ تھا کیونکہ ہر گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ اسی شہر کے مغربی محلے میں ایک خاندان تھا بڑا آسودہ اور پرہیزگار، مجھے یقین تھا اس کھنڈر شہر اور برباد گھروں کا نظارہ کرنے اب فوجی نہیں آئیں گے۔ وہ بہت کچھ لے گئے تھے۔ اس نشے اور خمار میں وہ کئی دن گزار دیں گے۔

اس لیے میں آزادانہ گلی گلی گھوم رہی تھی تاکہ بربریت کی سنی سنائی داستانوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔

ہاجرہ بیگم نے بتایا۔ ”میں“ میری مند اور جوان بیٹی زبیدہ۔ ہم تینوں کریک ڈاؤن کے دوران گودام میں دبک گئی تھیں کہ ان ظالموں نے گھر کو خالی پا کر آگ لگا دی۔ آگ لگی تو دھوئیں سے ہمارے دم گھٹنے لگے تو ہم مجبوراً باہر نکل آئیں۔ تب ایک درندے نے ہمیں دیکھ لیا اور اس نے ”بے ماتا“ کا نعرہ لگایا۔ ہمارا خیال تھا وہ تنہا ہو گا، ہم مقابلہ کریں گے مگر نعرے کے جواب میں سیکڑوں فوجی دندناتے ہوئے اندر آ گئے۔ ہم نے اینٹوں سے مقابلہ شروع کر دیا۔ وہ چونکہ ہمیں زندہ پکڑنا اور اپنی ہوس کے لئے استعمال

پورہ۔ ہم جہاں جہاں سے گزرے وہاں احسن ڈار کی خوشبو اور ذکر کو موجود پایا۔ جب ہم احسن ڈار کے گھر چک سری میں داخل ہوئے تو اجنبیت کے باوجود وہاں ہمارا استقبال گرم جوشی کے ساتھ کیا گیا۔ رات کو محلے کی کچھ لڑکیاں بطور خاص مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ چٹان کی قاری تھیں اور اسی حوالے سے مجھ سے عقیدت رکھتی تھیں۔ ایک لڑکی نے بتایا۔

”یہ علاقہ احسن ڈار کی وجہ سے ہمیشہ زیر عتاب رہتا ہے۔ ڈار صاحب کارروائی کسی بھی کونے پر بھی کرتے ہیں تو سیکورٹی فورسز ادھر دوڑ پڑتی ہیں۔ احسن ڈار کی گرفتاری کے لیے کچھ غداروں کو بھی انعام کا لالچ دیا گیا ہے لیکن آج تک یہ لوگ اس جرات مند مجاہد کی گرد بھی چھو نہیں سکے۔“

صبح جسم تو تازہ دم تھے لیکن مظلوموں کی دل ہلا دینے والی داستانوں نے روح گھائل کر دی تھی۔ میں ان ماؤں سے ملی جن کے سہاگ جنگ آزادی پر قربان ہو چکے تھے جن کے بیٹے لاپتہ تھے اور جن کی معصوم بیٹیوں کے دامن تار تار تھے۔ میں ان لٹی پٹی اور زندہ درگور لڑکیوں سے بھی ملی تھی جن کو لوٹ کر کھنڈر بنا دیا گیا تھا۔ مجھے وہ بچے بھی دکھائے گئے جو معذور تھے جن کے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے گئے تھے۔ وہ اپنی ماؤں اور بہنوں کو بھارتی فوجیوں کی گرفت میں ترپتے دیکھ کر روئے تھے۔ مجھے وہ کھنڈرات بھی دیکھنے کو ملے جن میں کبھی خوش حال خاندان آباد تھے۔

دستک کی آواز نے مجھے پٹن سے آسیہ کے گھر لاپھٹکا تھا۔ میں نے پرچہ ایک طرف رکھ دیا۔ آنے والی آسیہ تھی۔ اس نے چہرے کی خراشوں پر کوئی دوا لگا رکھی تھی۔ گرم شال کے ہالے میں اس کا چہرہ چاند کی مانند روشن دکھائی دے رہا تھا۔

”وہاں چاہتے ہیں آپ کھانے میں اس کے شریک بنیں۔“ آسیہ نے پرچے کو اٹھا کر ایک ورق کو الٹ کر دیکھا اور پھر رکھ دیا۔

”ماشاء اللہ تمہاری تحریر خوب ہے اگر میں بھارتی فوج کا بااختیار آفسر ہوتا تو تم جیسی قلم کارہ کو کبھی آزادا نہ کرتا۔ بھارت کے ڈھول کا پول تم نے کھول کر رکھ دیا ہے۔“

”بس جو دیکھا لکھ دیا۔“ وہ انکسار نہ انداز میں بولی۔ ”میں نے اپنی طرف سے کوئی

کرنا چاہتے تھے اس لیے گولیاں نہیں چلاتے تھے پھر ہمیں چاروں اطراف سے گھیر لیا گیا اور ہمارے پاس اینٹوں کا اسٹاک بھی ختم ہو گیا تھا۔“ ہاجرہ نے آگے کچھ نہیں بتایا اس کے قریب اس کی منہ بلیقیں خانم اور بیٹی نیم بے ہوشی کے عالم میں ہڈیانی کیفیت سے دو چار تھیں۔ تینوں کے جسموں پر دانتوں اور ناخنوں کے نشانات دکھائی دے رہے تھے۔ تینوں نے نہ جانے کیسے اتنے درندوں کی نوچ کھسوت برداشت کر لی تھی۔ تینوں زندہ لاشیں بن چکی تھیں۔ کوئی ان کے اندر اور باہر کے زخموں پر مرہم رکھنے والا نہ تھا۔

22 اپریل۔ شیر غاب

دریائے جہلم کے کنارے کنارے ندیاں نالے اونچے اونچے درخت اور ان درختوں کے درمیان پھیلے ہوئے چھوٹے چھوٹے دیہات ہمارے سفر کے لئے بڑی آسانیاں پیدا کر رہے تھے۔ میرے پاس پروانہ رہائی بھی تھا۔ اس کے باوجود میں بھارتی شیطانوں اور فوجی درندوں کی نگاہوں میں آنا نہیں چاہتی تھی۔ میرے پاس سب سے بڑا جرم تھا کہ میں جوان اور خوبصورت جسم لیے ہوئے تھی۔ ایسی مجرمہ کو بھلا کون معاف کر سکتا تھا۔

ہم جب تحصیل پٹن کے گاؤں شیر غاب میں داخل ہوئے تو شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ ہم نے سڑک سے بچ کر برساتی تالا عبور کیا تھا۔ میرے ہمدرد اور ساتھی ندیہ کے مطابق سڑک پر ملٹری پولیس کی چوکی تھی۔

شیر غاب کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں ایک شیر دل مجاہد محمد احسن ڈار نے جنم لیا تھا۔ محمد احسن ڈار حزب المجاہدین کے چیف کمانڈر آپریشنز ہیں۔ آپ کا تعلق جماعت کے قائم کردہ فلاح عام ٹرسٹ کے ایک اسکول سے بھی رہا ہے۔ محمد احسن ڈار کو انتخابات میں کامیابی کے بعد کسی ممکنہ بغاوت کے پیش نظر دیگر سیاسی رہنماؤں کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا جن کو مجاہدین نے جیل توڑ کر آزاد کر دیا تھا۔ فرار کے بعد محمد احسن ڈار نے عسکری تربیت حاصل کی اور کمانڈر کی ذمہ داریوں کے اہل قرار پائے۔

ایک رات ہم نے شیر غاب میں بسر کی اور میزبان سے شیر غاب کے شہیدوں اور غازیوں کی ایمان افروز داستانیں سننے کو ملیں۔

پھر صبح ہم نے اپنا سفر آگے بڑھایا تو راستے میں ارد گرد احسن ڈار کا علاقہ پھیلا ہوا پایا۔ گریری۔ چک سری، تانیڈ کٹے، وتر گام، پلپالن۔ واگورہ، ٹھنڈہ، کنور، دانی گام، نہال

رنگ نہیں ڈالا، اگر آنکھیں میری اور قلم کسی مغربی صحافی عورت کے ہاتھ میں ہوتا تو جو مناظر اور باتیں میرا قلم نہیں لکھ سکا وہ لکھ ڈالتی۔“

میں اس کے ساتھ جب ان کے بیڈ روم میں داخل ہوا تو تکیوں کی ٹیک پر نیم دراز عبد الوہاب سیدھا ہو گیا تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے میرا استقبال کیا اور مجھے اپنے ساتھ بیڈ پر بٹھالیا۔

”کتنی عجیب بات ہے کہ تمہاری احسان مند کو تمہارا نام تک معلوم نہیں۔“ عبد الوہاب اتنا بزرگ بھی نہ تھا نہ جانے کیوں اس نے بے تکلفی کا لہجہ اپنایا تھا۔ ”میرے بھائی میں تمہارا بے حد ممنون ہوں، میں عزت عصمت کا نام نہیں لوں گا۔ اس لیے کہ آسیہ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے مجھے اس کے ساتھ رہنا ہے۔“

”وہاب!“ آسیہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”بس میرے محسن کا شکریہ ادا کرو، تم جب فلسفہ بولنے لگتے ہو تو وقت اور مخاطب کے مراتب کا بھی خیال نہیں رکھتے۔“

”ایم سوری جانم۔“ وہ ایک دم مجھ سا گیا۔ ”بہر طور مسٹر.....“

”جہانگیر احمد۔“ میں نے نام بتا دیا۔ ”ویسے آسیہ بی بی نہ تو میری احسان مند ہیں نہ میں محسن ہوں اگر اس کی جگہ کوئی سیتا دیوی ہوتی تو بھی میں اسے ظالموں سے نجات دلانے کی ایسی ہی کوشش کرتا۔ میں نے انسانیت کے ناتے حق مردانگی ادا کیا ہے۔“

”آسیہ بتا رہی تھی کہ تم پناہ کی تلاش میں وہاں پہنچے تھے۔“

”جی ہاں۔“

”جھیل کے درمیان پانی میں پناہ؟“ وہاب نے مسکراتی لگا ہوں ہے میری جانب دیکھا۔ ”کیا کوئی خونی آبی بلا تمہارے تعاقب میں تھی؟“

”خفگی کے سارے راستے مسدود تھے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”کوئی راستہ نہ پا کر میں نے پانی سے پناہ طلب کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔“

”میرے عزیز۔“ وہ نرم و شیریں آواز میں بولا۔ ”میں یہاں ہوں مگر میری آنکھیں اور کان وادی میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ چند منٹ قبل ٹرانسمیٹر پر مجھے رپورٹ ملی ہے کہ اسی وقت اور اسی جھیل میں رات مجاہدین نے ایک ہیلی کاپٹر مار گرایا ہے۔ کیا تم

اسی تباہ ہونے والے کاپٹر کے دوسرے مسافر نہیں ہو۔ جس کی لاش کاپٹر سے نہیں ملی؟“

”آپ آزاد ہیں جو چاہیں اندازہ لگالیں۔“

”ادھر دیکھو دوست۔“ اس نے جدھر اشارہ کیا میں نے ادھر دیکھا بغلی دروازے کے پردے سے دو بیرل جھانک رہے تھے۔ یعنی مجھے گن پوائنٹ پر رکھ لیا گیا تھا۔ ”سنو، اگر تمہارا نام سرجیت کمار بھی ہے تو تم اس گھر میں جہانگیر احمد جیسے محترم ہو، اس لیے کہ ہم مسلمان اپنے محسنوں کے احسان کو فراموش نہیں کیا کرتے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ میری بیوی تمہیں پناہ دے چکی ہے۔“

”میرا خیال تھا بلکہ ہے کہ آپ کو آسیہ جیسی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تجربے کار صحافی بیوی کے حوالے سے یقیناً تعلیم یافتہ ہی نہیں بلکہ دانش مند بھی ہونا چاہیے، لیکن آپ کی سطحی سوچ نے مجھے تھوڑی حیرت دی ہے۔ میرے محترم میزبان اگر میرا نام سرجیت کمار ہوتا تو میں مجاہدین کے خوف سے بجرے میں چھپنے تو جاسکتا تھا لیکن اب تک ایک مسلمان خاندان کا مہمان نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ میں ہی دوسرا مسافر ہوں مگر یہ بھی سچ ہے کہ میرا نام جہانگیر احمد ہے اور میں اس خطے اور خطے میں لڑی جانے والی جنگ کا اتنا ہی وفادار اور سرگرم رکن ہوں جتنے آپ لوگ ہیں۔ اب بہت سے سوالات پوچھیں گے آپ اور میں کسی کا بھی جواب نہ دے سکوں گا۔ ہاں، آپ میری ذات کی تصدیق ڈاکٹر رضوان سے کروا سکتے ہیں۔“

”بس ٹھیک ہے۔“ آسیہ بول پڑی۔ ”سلطان بھائی آپ لوگ اندر چلے آئیں۔“

پردہ ہٹا تو مجھے ہڑبڑا کر اٹھنا پڑا تھا اندر آنے والوں میں ایک شخص ایسا تھا جسے میں ٹٹول کر پہچان سکتا تھا۔ وہ بھی سامنے مجھے دیکھ کر ساکت ہو گیا تھا۔

”میری شہادت، میری ضمانت اور گواہی فاروق بٹ دے گا۔“ میں نے بانہیں پھیلائیں تو میرا فرسٹ کزن اور سول انجینئر فاروق بٹ دوڑ کر پلٹ گیا تھا۔ اس نے وفور جذبات سے میری گردن پر کئی بوسے دیے تھے۔

جب میں نے کندھوں سے پکڑ کر اس کا چہرہ مقابل کیا تو دیکھا وہ چھ قانون جو ان بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

”فاروق! میرے بھائی میری جان تم نے میری آواز نہیں پہچانی تھی؟“

”لیکن.....مم.....میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“ وہ اپنے نقاب سے آنسو پونچھ کر بولا۔ ”آپ یہاں ہو سکتے ہیں۔“

”سوچ تو میں بھی نہیں سکتا تھا فاروق۔“ میں اسے ساتھ چٹائے صوفے پر جا بیٹھا۔ ”موسٹ اولی ڈینٹ سرونٹ کا بیٹا تحریک آزادی میں شریک ہو سکتا ہے۔ کیا تم نے اپنا گھر چھوڑ دیا ہے؟“

”نہیں بھائی جان۔“ فاروق نے بھرائی آواز میں جواب دیا۔ ”لیکن ابا جی بتید حیات نہیں ہیں اور اماں بی نے بخوشی جہاد میں شریک ہونے کی اجازت دے دی ہے۔“

”آسی جان۔“ وہاب کی آواز سنائی دی۔ ”مہمانوں کے لیے یہاں ہی کھانا لے آؤ، اب تو سارا ماحول ہی بدل گیا ہے۔ فاروق! اپنے دوست کا تعارف اپنے ساتھی سے بھی کرا دو۔“

”یہ دوست نہیں میرے کزن ہیں جناب۔“ فاروق نے جواب دیا پھر اپنے ساتھی کی طرف پلٹ کر بتانے لگا۔ ”یہ حاجی غلام احمد وانی ہیں ان کا تعلق پاکستان کے صوبہ پنجاب سے ہے۔“

”نہیں بلکہ میرا تعلق اسی مٹی سے ہے۔“ حاجی صاحب بات کاٹ کر بولے۔ ”میرے آباؤ اجداد کی قبریں یہاں ہیں ہم لوگ پہلی پاک و ہند جنگ کے دوران ہجرت کر کے گجرات میں سہیل ہو گئے تھے اب جب میری مٹی نے مجھے پکارا تو میں چلا آیا۔“

”جہانگیر کا تاریخ جغرافیہ بھی بتا دو۔“ وہاب نے اپنی بیوی کی جانب دیکھ کر فاروق سے کہا۔ ”آسیہ ستون کی طرح وہاں جی کھڑی تھی۔“

”بھائی جان ریاستی پولیس کے انسپکٹر ہیں اور سرکاری طور پر ایڈوانس کورس کرنے باہر گئے تھے۔ بس مجھے اتنا ہی معلوم ہے۔“

”فاروق یہ خبر تم لوگ لائے ہو کہ ہیلی کاپٹر کا دوسرا سوار لاپتا ہے؟“

”جی ہاں۔“ فاروق نے سر کو اثباتی جنبش دی اور عبد الوہاب اپنے بیان پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔ اس نے ٹرانسمیٹر کو ذریعہ بنایا تھا۔ ”آپ تو جانتے ہیں میں کشمیر ورس ڈپارٹمنٹ میں انجینئر ہوں۔ تاحال میں ڈبل رول ادا کر رہا ہوں۔ ان کے لئے موسٹ اولی ڈینٹ سرونٹ اور ماں دھرتی کے لئے وفادار بیٹا۔ ان دنوں میری خدمات فوج نے مستعار

مجھے آج بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں کمانڈر نے بلایا تھا۔ وہاں ذکر ہو رہا تھا کہ کرنل شو بھراج کے آرڈر پر جس شخص کو انڈیا بھیجا گیا تھا اس کا ہیلی کاپٹر مٹ ہو گیا ہے اور اس کی لاش نہیں مل رہی ہے۔“

”کیا جانے والے کا نام نہیں لیا گیا تھا؟“

”نہیں۔“ فاروق نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”لیکن ہنگامی بنیادوں پر پانی اور خشکی دونوں جگہوں پر تلاش کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ کیا واقعی آپ ہی تھے کاپٹر میں؟“

”ہاں۔“

”لیکن کیوں جہانگیر بھائی؟“

”اس لیے چھوٹے بھائی۔“ میں ہنس پڑا۔ ”کہ میں مسلمان ہوں، پولیس کا منحرف اور قانون کا مفرور ہوں اور کرنل شو بھراج کا قیدی تھا، وہ مجھے انڈیا کے کسی جدید انٹروکیشن سینٹر میں لے جا کر تفتیش کروانا چاہتا تھا لیکن اسے یہ کسی نے نہیں بتایا تھا کہ جہانگیر احمد کو کمانڈوز ٹریننگ بھی انڈیا کے جدید اسکول نے دی تھی اور وہ باہر سے بھی کندن بن کر واپس آیا ہے۔ میرے ساتھ ایک نسوانی چہرے والا چھوکر پائلٹ بھیجا گیا تھا۔ میں نے اسے ایک ہی تھپکی دی تو اس نے گھبرا کر ہیلی کاپٹر کا توازن کھو دیا تھا۔“

”سناتم نے وہاب۔“ آسیہ کسی بچی کے مانند تالی بجا کر پرجوش آواز میں بولی۔ ”میں نے یہی بتایا تھا تاہم تمہیں کہ ہمارا مہمان حرب و ضرب کا ماہر ہے عام نوجوان نہیں ہے۔ اس نے جس آسانی سے تین فوجیوں کو بے گھر کر دیا تھا۔ مجھے یقین تھا میرا نجات دہندہ اہم شخص ہے۔“

”بھابی پلیز۔“ فاروق ٹھنک کر بولا۔ ”پہلے پیٹ پوجا پھر کام دو جا“ ہمیں مشن پر بھی جانا ہے۔ بھائی یہاں ہیں جی بھر کر تعریف کرتی رہیے گا۔“

آسیہ بھاگتی ہوئی گئی اور بڑے بڑے اٹھائے فوراً واپس آگئی۔ یقیناً غوغیہ نے ٹرے تیار کر رکھی ہوگی۔ میز بیڈ سے لگا کر کھانا چن دیا گیا تو آسیہ پھر کی طرح جاتی کبھی پانی اور کبھی اچار اور ڈش لے آتی۔

کھانے میں وہی سادگی تھی سویٹ ڈش میں حلوا تھا۔

”فاروق میں یہاں سے ٹکنا چاہتا ہوں۔“ کھانے سے فارغ ہوتے ہی میں نے کہا تو

”فاروق میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔“ کھانے سے فارغ ہوتے ہی میں نے کہا تو میرے دونوں میزبان احتجاجاً بلبلانے لگے تھے لیکن میں نے ان پر کوئی توجہ نہ دی تھی کیونکہ مجھے بہر طور اپنے لیے کچھ کرنا تھا۔

کرنل شو بھراج اور کرنل نرائن کے پاس جانے کے سارے راستے کھلے تھے لیکن جن حالات سے میں گزر آیا تھا واپسی کی کوئی ضمانت نہ تھی۔ وہ مجھے جانتے تھے مجھ پر پائلٹ کی ہلاکت اور ہیلی کاپٹر کی تباہی کی ذمہ داری عائد کر دیتے تو میری صفائی کون دیتا مجھے ان کی گرفت سے کون بچانے والا تھا؟

مجھے مستقبل کا لائحہ عمل تیار کرنا تھا اور اس کے لئے مجھے اپنی دوست اور محبوبہ انو تک بہر صورت پہنچنا تھا وہی بہتر مشورہ دے سکتی تھی۔ اس تک جانے کا راستہ اور راہداری صرف حضرت شاہ صاحب کے پاس تھی۔

”پہلے مجھے بتائیے۔“ فاروق میری بات سن کر بولا۔ ”آپ کو مولوی ”ہٹ کھوتے“ یاد ہے؟“

”ہاں۔ وہی ناں جو ہمارے اسکول میں دینیات پڑھایا کرتے تھے اور جسے سبق نہیں آتا تھا کہا کرتے تھے ”ہٹ کھوتے۔“

”جی وہی نیم ملا۔“ فاروق نفرت سے بولا۔ ”ان دنوں فوج میں سرکاری امام ہے اور غداروں میں مصروف ہے۔ اسے ان لوگوں نے مرکزی جامع مسجد میں بھیج دیا ہے۔ کیونکہ جامع مسجد میں مولانا اظہار الحق جماد کی تبلیغ کرتے تھے وہاں مجاہدین کی مشاورت ہوتی تھی۔ اب جب کوئی انجان مجاہد پناہ لینے مسجد میں پہنچتا ہے تو مولوی ہٹ کھوتے اسے فوراً گرفتار کر دیتا ہے۔ کل عبدالوہاب صاحب بھی اپنے چار ساتھیوں کے ہمراہ وہاں عشاء کی نماز ادا کرنے گئے تو مولوی نے مخبری کر دی اور مسجد کو سکیورٹی فورس نے گھیر لیا۔ اس مقابلے میں تین مجاہدین شہید ایک فرار اور عبدالوہاب صاحب زخمی ہو کر بہ مشکل وہاں سے نکل سکے تھے۔ ہمیں پہلے شک تھا لیکن اب عبدالوہاب بھائی کی گواہی اور زخم نے یقین دے دیا ہے۔ اس لیے آج ہم اس غدار کو سزا دینے کا عزم کر چکے ہیں۔“

”اس سعادت میں مجھے شریک کر سکتے ہو؟“

”میں نے اسی لیے اس کا ذکر کیا ہے۔“ فاروق بولا۔ ”دراصل وہ جنہی حاجی

صاحب کو جانتا ہے۔ ان کو دیکھتے ہی چونک پڑے گا۔ جب کہ مجھے اور آپ کو وہ زمانہ طالب علمی سے اب تک جانتا ہے کہ دونوں سرکاری ملازم ہیں۔ ہم دونوں اس کے کوارٹر میں جائیں گے۔ ہمارے لیے وہ دروازہ بند نہیں رکھے گا۔“

”اس کا ایک بیٹا میرے ہاتھوں واصل جنم ہو چکا ہے۔“ حاجی نے بتایا۔ ”میں نے اسے ماں کی موجودگی میں برست مارا تھا۔ اس وقت ملا ہماری لسٹ پر منکوک نہ تھا ورنہ ایک برست اور مارنا مشکل نہ تھا۔“

”ہم میں سے کوئی بھی کسی مجاہد کو میدان جماد میں اترنے سے روکنے کا گناہ نہیں کر سکتا ورنہ میں آپ کو ہرگز نہ جانے دیتی۔“ آسیہ نے مشینی انداز میں اپنی بات مکمل کی اور پھر برتن سمیٹنے لگی۔ ”لیکن آپ کو وعدہ کرنا ہو گا۔ آپ سرخ رو ہو کر واپس یہاں آئیں گے۔“

”آؤں گا ضرور۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن آج نہیں۔ میرے سامنے یہ ایک مشن نہیں ہے بلکہ قطار در قطار کئی ایسے مشن ہیں۔ جس نوبل کا ز کی خاطر میں نے سرکاری آسائش اور بڑا عمدہ قریان کیا ہے اس کا تقاضا مجھے کسی ایک جگہ رکنے نہیں دیتا۔ میں کوشش کروں گا کہ پھر آرمی کا اعتماد حاصل کر کے ان کے درمیان چلا جاؤں۔ کم طاقت کا بم بھی اگر کسی اسٹور کے اندر پھٹے تو نقصان بہت کرتا ہے۔ میری پالیسی یہی ہوگی کہ میں ان کے درمیان پھنستا رہوں۔“

ہر کھانے کے بعد قہوہ ایک ضروری آئٹم ہوتا ہے۔ کچھ تو ہم وقت دھکیل رہے تھے کچھ میری میزبان زیادہ دیر میری خدمت کرنا چاہتی تھی۔ فاروق اور حاجی صاحب کی وجہ سے غویہ سامنے نہ آئی تھی۔

جب ہم شام چار بجے وہاں سے روانگی کے لئے تیار ہوئے تو آسیہ کی حالت ایسی ہی تھی جیسی کسی بہن کی ہوتی ہوگی جو جماد پر دو بھائیوں کو روانہ کرتی ہے۔ اس نے دروازے تک دعاؤں کی چھاؤں میں رکھا تھا۔

حاجی صاحب وہیں رک گئے تھے۔ پروگرام کے مطابق فاروق کو فارغ ہو کر ان کو لے جانا تھا۔

عصر کی باجماعت نماز ہم نے اسی جامع مسجد میں ادا کی تھی۔ امامت کے فرائض

ایک نو عمر مولوی نے ادا کیے تھے۔ فاروق نے بتایا تھا کہ مولوی کرامت علی عرف ”ہٹ کھوتے“ محض نمازی امام تھا جو فجر اور عشاء کی نمازیں پڑھاتا تھا۔ اس کی رہائش گاہ مسجد کے عقب میں ایک کرائے کے مکان میں تھی اس محلے میں نوے فی صد آبادی مسلمانوں کی تھی۔

ایک طالب علم ہمارے ساتھ گیا تھا۔ فاروق نے اسے بتایا تھا کہ ہم دونوں مولانا صاحب کے سابق شاگرد ہیں اور سلام کرنے حاضر ہوئے ہیں۔ طالب علم اندر گیا اور پھر ہمیں بیٹھک میں لے جا کر بٹھادیا تھا اس نے، ساتھ والے کمرے سے باتوں کی آواز آرہی تھی مولوی کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ فاروق نے دبے پاؤں جا کر جھری سے دیکھا اور مجھے اشارہ کرتا ہوا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

بلا اجازت ہم اندر آگئے تھے لیکن مولوی نے اتنا برا نہ منایا تھا۔ وہاں کُل چھ کرسیاں تھیں۔

درمیان میں گول میز اور میز پر چائے کے برتن اور ایک پلیٹ میں چند بسکٹ باقی تھے۔ مولوی نے باری باری مصافحہ کیا اور کرسیوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔

”یہ میرے شاگرد ہیں جی۔“ اس نے مہمان سے تعارف کروایا۔ ”بڑے ہونہار ہوا کرتے تھے اور اب حکومت کے وفادار افسران ہیں۔“

”کس ڈپارٹمنٹ میں ہو؟“ مہمان نے گھورتی نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔

”آپ کی تعریف؟“ میں نے اس پر سوال کر دیا۔

”یہ..... یہ۔“ مولوی بول پڑا۔ ”مبصر منہ ہیں مذہبی امور کے انچارج۔“

”میں پولیس میں انسپکٹر ہوں سر۔“ میں نے لہجے کو مودب بنالیا۔ ”اور یہ سول

انجینئر ہے لیکن آج کل آرمی کے تحت ہے۔“

اندر سے ایک شعلہ رُو لڑکی داخل ہوئی اور ہم پر نگاہ پڑتے ہی ٹھٹھک گئی تھی۔

”آؤ..... آؤ۔ اپنے بچے ہیں۔“ مولوی نے اسے چپکارا تو وہ نگاہیں فرش پر جمائے بے

آواز چلتی بیڈ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ ”صاحب! یہ میری بیٹی عائشہ ہے اسی برس اس نے دلی

یونیورسٹی سے ایم ایس سی کا امتحان پاس کیا ہے۔ کاکي ان کو سلام کرو۔ یہ مبصر منہ صاحب

ہیں اور یہ..... اس نے فاروق کی کلائی پر ہاتھ رکھا۔

”میرا شاگرد فاروق اور کاکي تمہارا نام بھول گیا ہوں۔ شاید تمہیں جنگو کہا جاتا تھا۔“

”جی..... میں وہی آپ کا جنگو ہوں جناب۔“

”تم لوگ ذرا باہر بیٹھو۔“ مبصر منہ کرخت آواز میں بولا۔ ”مجھے مولوی صاحب

سے سرکاری باتیں کرنا ہیں۔“

”ہم بھی تو سرکاری ہیں سر۔“ میں نے کہا۔ ”ہم سے کیا پردہ۔“

”سٹ اپ۔“ وہ گرج کر بولا۔ ”زیادہ فری ہونے کی کوشش نہ کرو۔ مولانا پھر اس

وقت بات ٹھیک نہیں۔ میں ڈنر سے ایک گھنٹا پہلے آؤں گا۔ میرا مال تیار ہونا چاہیے۔“

وہ اٹھا تو مولوی کرامت بھی بد بداتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ”ان کو نکالو یا مجھے جانے دو۔“

”میں نہیں جاؤں گی تیرے ساتھ۔“ اچانک عائشہ حلق پھاڑ کر دھاڑی۔ ”میرے

باپ کو تمہاری روٹی نے اگر بے غیرت بنا دیا ہے تو مجھے کوئی پروا نہیں۔ مجھے کوئی مجبور

نہیں کر سکتا۔ یہ محلّہ مسلمانوں کا ہے ان میں دس پندرہ تو غیرت مند ہوں گے۔ میں سب

کو بتاؤں گی۔“

”مولوی کرامت!“ مبصر منہ اپنی ران پر بید مار کر دانت کچکپاتے ہوئے بولا۔ ”اپنی

چھو کری کو بتا دیتا یہ محلّہ ہی نہیں یہ پوری وادی مسلمانوں کی ہے، مگر ہمارے قبضے میں

ہے۔ اسے یہ بھی بتا دینا انکار کی سزا ہم کیا دیا کرتے ہیں اور تعاون کا انعام کتنا دیا جاتا ہے۔

میں ٹھیک آٹھ بجے آؤں گا۔“ وہ ایڑیوں پر گھوما اور قدم بڑھایا ہی تھا کہ میں نے پاؤں

آگے کر دیا۔ وہ الجھ کر ہاتھوں کے بل گرا اور پھر پلٹ کر دھاڑا۔ ”یو بلڈی ڈاگ“ اور میں

نے اس کے کھلے دہانے میں گولی اتار دی۔ سائینسز کی وجہ سے گلی تک بھی آواز نہ گئی

ہوگی۔

مولوی کرامت اچھل کر اٹھا اور مجھے دھکا دے کر مبصر پر جھک گیا۔

”یہ..... یہ..... تم نے کیا کر دیا۔ او پاگل کھوتے یہ آرمی کا مبصر ہے۔“

”پھر کیا ہوا مولوی صاحب۔“ فاروق نے کہا۔ ”اس کی جگہ کوئی کیپٹن مبصر بن

جائے گا۔“

”نہیں۔“ مولوی کرامت نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈال دیا۔ ”میں تم دونوں

کو.....

میں نے اس کی کلائی پر ماہرانہ ضرب لگائی تو وہ ”ہائے مرگیا“ کہتا ہوا بازو ٹانگوں کے درمیان دبا کر جھک گیا۔ ہڈی ٹوٹنے کی آواز سب نے سنی تھی۔

”سیدھا کھڑا ہو کر بتا غدار۔“ فاروق نے اسے بالوں سے دبوچ کر کھڑا کر دیا۔

”غدار کی عوض تو نے کیا لیا ہے صرف بڑی مسجد کی امامت!“

”عائشہ!“ مولوی کرامت جھولتا ہوا بیڈ کی جانب بڑھنے لگا تو فاروق نے اس کے سینے میں سیدھی ہک ماری۔ ”ٹیلی فون۔ ڈیل تھری ڈیل..... ڈیل ٹو مولوی ہٹ۔“ فاروق نے ایک گولی اس کی کینٹنی پر اور دوسری گردن پر ماری اور دھکا دے کر اسے میجر مندر کی لاش پر گرا دیا تھا۔

عائشہ پر جیسے سکتے طاری ہو گیا تھا وہ پتھرائی نگاہوں سے باپ کی لاش کو گھور رہی تھی۔ فاروق نے پھونک مار کر اپنا رویہ اور خفیہ جیب میں رکھا اور گہری سانس لے کر عائشہ کے سامنے والی کرسی کا ہتھ پکڑ کر جھک کر بولا۔

”اپنی عزت اور کشمیر کی آزادی کے نام پر ہمیں معاف کر دینا عائشہ۔“ عائشہ کی لاجبی پلکوں میں لرزش سی پیدا ہوئی تھی لیکن وہ چپ رہی تھی۔ ”ہم جارہے ہیں“ تم بھی کسی محفوظ جگہ چلی جانا اور ہمارے نام بھول جانا۔“

”ٹھہریے۔“ جوں ہی وہ سیدھا ہوا عائشہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ”میں اپنے نجات دہندہ کا نام نہیں بھول سکوں گی۔ یہ بھی سن لو۔ اس شر میں میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ باپ اور میجر کے قتل کے الزام میں کتے مجھے بھنبھوڑ کھائیں گے۔“

فاروق نے چھت کی جانب دیکھا جیسے اپنے فیصلے کی تائید آسمان والے سے مانگ رہا تھا، پھر وہ بولا تو میں بھی حیران رہ گیا تھا اس نے وہی فیصلہ کیا تھا جو میں چاہتا تھا۔ اس نے مضبوط آواز میں کہا۔ ”عائشہ! میرے ساتھ چلو گی؟“

”ہاں چلوں گی۔“ وہ اندر جانے کے لئے مڑی۔ ”یہ بھی نہیں پوچھوں گی کہاں۔ بس میں اس جہنم سے نکل جانا چاہتی ہوں۔“

”سنو۔“ میں نے اسے روک لیا تو وہ گھبرا سی گئی۔ ”کیا اس مکان کا گھر ہے؟“

”ہاں بہت بڑا۔ یہ تین منزلہ بلڈنگ ہے۔ آئیے دکھاتی ہوں۔“ میں اس کے ساتھ

دوسرے کمرے کو عبور کرتا کھلے صحن میں گیا۔ میری کے درخت کے نیچے گڑھا ڈھکن تقریباً اوچھل تھا میں نے بوٹ کی نوک سے مٹی ہٹائی اور بہ مشکل ڈھکن اٹھایا اور پھر میجر مندر کی لاش لڑھکا کر میں نے بیٹی سے باپ کی لاش کے لیے اجازت لی، اسے کوئی اعتراض نہ تھا۔ بیٹی ہونے کے باوجود وہ اس لالچی اور غدار سے سخت متنفر تھی۔

”آپ نے اچھا فیصلہ کیا ہے۔“ عائشہ پر اپنی اٹیچی لٹکائے باہر آکر بولی۔ ”ورنہ بھارتی آفیسر کی لاش ان کو میرے پیچھے لگا دیتی۔ میں نے چند جوڑے کپڑوں کے اور اپنی ڈگریاں سرٹیفیکٹ بھی لے لیے ہیں۔“

فاروق کے استعمال میں جو جیب تھی وہ سرکاری تھی۔ ان دنوں ایسی تمام گاڑیوں کے آگے جلی حروف میں لکھ دیا جاتا تھا۔ ”آن گورنمنٹ ڈیوٹی۔“

عائشہ نے میلی سی چادر اوڑھی تھی لیکن اس کے حسن پر کوئی فرق نہ پڑا تھا بلکہ میلی گھٹانے چاند کو اور بھی روشن کر دیا تھا۔

”جہانگیر!“ فاروق شر سے نکل کر بولا۔ ”ایک رات کے لیے آپ عائشہ کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کریں گے۔ میں آج چھٹی لے لوں گا اور کل اسے پھان کوٹ اماں جی کے پاس لے جاؤں گا۔“

”اماں جی کے بیٹے سے مجھے یہی توقع تھی۔“ میں نے ستائشی نگاہوں سے اس کھنڈرے نوجوان کی جانب دیکھا جسے وقت نے بہت سنجیدگی دے دی تھی۔

”عائشہ اب تمہارے حوالے سے بے حد عزیز اور قیمتی ہو گئی ہے۔ جمیل کے ساتھ ساتھ چلتے رہو عائشہ کے لئے محفوظ جائے پناہ مل جائے گی۔“

ابھی ہم جمیل سے دور درگاہ حضرت بل کے علاقے میں تھے آگے نسیم باغ تھا۔ امن کے دنوں میں جب کبھی میرا دل گھبرایا کرتا تو میں نسیم باغ کی طرف نکل جایا کرتا لیکن وہ وقت وہ باتیں خواب ہو کر پیچھے رہ گئی تھیں۔

”جہانگیر بھائی۔“ عائشہ آگے جھک کر بولی۔ ”میں پیدائشی کشمیری نہیں ہوں میری زندگی کا بڑا حصہ ننھیال میں گزرا ہے اور زسری سے ایم ایس سی تک انڈیا رہی ہوں شاید کبھی ادھر پھر آتا نہ ہو آپ گزرتے گزرتے اس خوبصورت علاقے کے بارے میں بتانا پسند کریں گے؟“

”یہ خود بھگوڑا رہا ہے۔“ فاروق نے دخل دیا۔ ”میں اس شہر کا بیٹا ہوں۔“
 ”لیکن آپ آنکھیں سڑک پر مرکوز رکھیں گے۔“ عائشہ بشارت انداز میں بولی۔
 کون کہہ سکتا تھا کہ چند لمحے پہلے وہ باپ کی لاش سے اٹھ کر آئی تھی۔
 ”میں گائیڈ کی طرح اچھا ڈرائیور بھی ہوں۔ اب ہم نسیم باغ سے گزر رہے ہیں
 تاریخ نہ پوچھنا شاید کسی بڑے کی بیٹی کا نام نسیم ہوا ہوگا۔ یا کسی شاعر نے اپنے شعر سے لفظ
 نسیم نکال کر دے دیا ہوگا۔ ان دنوں باغ میں نسیم کم داخل ہوتی ہے عیاش فوجی زیادہ
 دکھائی دیتے ہیں۔ درگاہ حضرت بل ذرا پیچھے رہ گئی ہے اب یہ موڑ مڑتے ہی ہم جمیل ڈل
 کا نظارہ کر سکیں گے۔“ فاروق رنگ کنٹری کرنے لگا تھا۔ عائشہ کلائیوں پر چہرہ رکھے توجہ
 سے سن رہی تھی۔

”اس جمیل کو ڈل کیوں کہا جاتا ہے؟“ مجھے نظر انداز کر کے دونوں نے لائن کو
 ڈائریکٹ کر لیا تھا اس لیے میں سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر اوجھلنے لگا۔
 ”اس لیے کہ یہ ڈھلان کی تہ میں ذخیرہ آب ہے۔“ فاروق نے بے ساختہ جواب
 دیا۔ ”ہاں“ تو یہ ڈھلوانوں کی شنراوی ہے وہ دیکھو وسط میں تمہیں چنار دکھائی دے رہے
 ہیں۔ درخت تو بہت ہیں مگر اس جزیرے کا نام چار چنار ہے۔ شاید ان دنوں چنار چار ہی
 رہے ہوں چونکہ درخت فیملی پلاننگ کے قائل نہیں ہوتے اس لیے اب کئی ہیں۔ ان
 چناروں کی چھاؤں میں ایک ریلیٹورنٹ ہے جہاں کبھی بٹھ کر چائے پیا کرتے تھے۔ سنا
 ہے اب بھارتی آفیسرز نے وہاں کلب بنالیا ہے۔ ادھر کہیں پری محل بھی ہے کدھر ہے
 جماگیر؟“

”شہابی چشمے کے دامن میں۔“

”ادھ مائی گاڈ۔“ فاروق نے ڈیش بورڈ پر ہاتھ مارا۔ ”عائشہ کو شیخ عبداللہ کا مزار تو
 دکھایا ہی نہیں۔“

”ہاں۔ کدھر ہے۔“ عائشہ نے پوچھا۔ ”سنا ہے اب فوجی وہاں نگرانی کرتے ہیں۔“
 ”ادھر نسیم باغ کے سرے پر۔“ فاروق بولا۔ ”لوگوں کا خیال کچھ اور ہے لیکن میں
 ان سے متفق نہیں ہوں۔“

اس نے لمحہ بھر توقف کیا پھر جب ہم میں سے کوئی نہ بولا تو وہ سلسلہ کلام جوڑتے

ہوئے بولنے لگا۔ ”لوگ کہتے ہیں کہ متفر کشمیری نوجوان اپنے مجرم کی لاش نکال کر جلاتا
 چاہتے ہیں اس لیے انڈیا گورنمنٹ نے اپنے وفادار کی قبر پر پھرا لگا دیا ہے مگر میرا خیال
 ہے کہ ہڈیوں کو کوئی جلاتا نہیں چاہتا بلکہ موجودہ گورنمنٹ اور گورنر کو خطرہ ہے کہ شیخ
 مرحوم اپنی غلطیوں کی سزا پر پشیمان ہوئے ہوں گے اور اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے
 کیس قبر سے نکل نہ آئیں۔ بس اسی خطرے کو پیش نگاہ رکھ کر قبر کو گھیرے میں لے لیا
 گیا ہے۔“

”میں نے کہیں پڑھا تھا۔“ عائشہ باہر جھانکتے ہوئے بولی۔ ”کبھی کشمیری قوم شیخ
 عبداللہ کو اوتار کا درجہ دیتی تھی اور گلی گلی ایک ہی نعرہ گونجتا تھا۔
 ”اگرے واگن کرے۔ بب کرے بب کرے۔“

”ہاں کبھی کشمیریوں نے اپنے نجات دہندہ کو یہ حق دے دیا تھا اور کہا کرتے تھے کہ
 آپ کشمیریوں کو کدو کی طرح کاٹ دیں یا بیٹنگن کی طرح چیریں ہم تمہارے ساتھ ہیں مگر
 جب کشمیریوں کو احساس ہوا کہ ہم جسے رہبر سمجھتے رہے ہیں وہی اصل میں کشمیری قوم کو
 لوٹ رہا ہے تو وہ پھرے ہوئے طوفان کی طرح باہر نکل آئے اور ”اگرے واگن کرے“
 کی جگہ ”ہم کیا چاہتے ہیں آزادی۔ یہاں کیا چلے گا نظام مصطفیٰ“ جیسے نعروں نے لے لی،
 ان ہی نعروں کی گونج اب پوری دنیا سن رہی ہے اسی کا نام دہشت گردی اور تحریک
 آزادی ہے۔“

فاروق خود کو منواتا اور اپنی معلومات کے خزانے عائشہ پر بے دریغ لٹاتا ہوا جب
 میری منزل کے قریب پہنچا تو میں نے اسے حضرت شاہ صاحب کی پناہ گاہ اور پُر سحر شخصیت
 کے بارے میں بتایا۔ وہ سرکاری گاڑی تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اس لیے اس نے عائشہ کو
 میرے ساتھ کر دیا تھا۔

”سنو جماگیر!“ وہ بولا۔ ”کل اسی وقت تمہیں میری امانت کے ساتھ اس جگہ ہونا
 چاہیے۔“

دیکھنے والی نگاہوں اور احسان کرنے والے دل نے یہ جان لیا تھا کہ عائشہ اور
 فاروق ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں۔ مجھے خوشی ہوئی تھی بلکہ دہری خوشی کہ
 فاروق میرا بھائی تھا اور عائشہ بے سہارا اور تنہا لڑکی تھی۔ میں نے اس جوڑی کے لئے دعا

کی تھی۔

کیپ کا محافظ نیا تھا اس لیے ہمیں مگن پوائنٹ پر رکھ لیا گیا تھا پھر انہوں نے اندر سے رابطہ ملایا اور دو نگران ہمیں لے گئے تھے۔ ہر دس قدم پر چوکس گارڈ دکھائی دیتے تھے۔ اندر جا کر سبب معلوم ہوا شاہ صاحب سے کمانڈوز ملاقات کرنے آئے ہوئے تھے۔ کوئی اہم اجلاس ہو رہا تھا اس لئے عائشہ اور مجھے مسلح پہرے میں ایک گھنٹا بیٹھنا پڑا تھا۔ مجھے طلب کیا گیا تو عائشہ کو تسلی دیتا ہوا میں گیا۔ وہاں دو دائروں میں لوگ بیٹھے ہوئے تھے مکمل دائرہ مردوں کا تھا اور نصف دائرے میں بانقلاب خواتین تھیں۔ دائرے میں قدرے اونچی جگہ پر مخصوص انداز میں حضرت شاہ صاحب تشریف فرما تھے۔ ان کی پُر نور شخصیت دائرے میں انگوٹھی میں ہیرے کے نگ جھبھی تھی۔ حاضرین نے بہ آواز بلند میرے سلام کا جواب دیا تو حضرت شاہ صاحب نے مجھے اپنے پہلو میں جگہ دی اور پھر میرا مناسب الفاظ میں تعارف کروایا۔

”جما تگیر!“ شاہ صاحب بولے۔ ”حاضرین ایک ہی مالا کے موتی ہیں۔ میری درخواست پر عقائد اور خیالات سے بالاتر ہو کر چلے آئے ہیں۔ ہم نے جاری جدوجہد سے متعلق مشورے اور کچھ فیصلے کئے ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ ہر جگہ پر تمہاری تلاش جاری ہے۔ میرا ایک بیٹا جو یہاں موجود ہے۔ آفیسرز میس میں ایک ذمے دار عہدے پر کام کر رہا ہے۔ منصور احمد تم اپنی رپورٹ دہراؤ۔“

”آج لنچ کے بعد جزل کی صدارت میں اجلاس ہوا ہے۔“ منصور احمد بولنے لگا۔ ”جزل چند روز قبل ایک جھڑپ میں زخمی ہو گیا تھا ان دنوں میس کے اندر آرام کر رہا ہے۔ میٹنگ اس کے کمرے میں ہوئی تھی۔ وہاں ایک میجر بھی تھا جو سرچ پارٹی کا انچارج تھا اس نے رپورٹ دی کہ مفور جما تگیر کی لاش نہیں ملی جبکہ جمیل سے تین تیرتی ہوئی لاشیں ملی ہیں تینوں کا تعلق مونٹ بیٹری سے ہے۔ ایک ملاح کو گرفتار کیا گیا اور اس نے انکشاف کیا ہے کہ کاہڑ کے حادثے کے وقت اس کے بجرے پر ایک نوجوان چڑھا اس وقت اندر تینوں فوجی ایک مسلمان عورت کے ساتھ موجود تھے۔ نووارد نے تینوں کو مار کر پانی میں پھینکا اور عورت کو لے کر چلا گیا تھا۔ ملاح نے جو حلیہ بیان کیا ہے وہ اسی مفور شخص کا ہے۔ رپورٹ سن کر جزل نے اپنے نائب کو حکم دیا کہ ڈاگ سینٹر سے کتوں کا

اسکواڈ اور وہ لوگ منگوائے جائیں جن کا تعلق کسی بھی طرح ہمارے مطلوبہ نوجوان سے رہا ہو۔ مجھے ہر قیمت پر وہ شخص چاہیے کیونکہ کرنل نرائن کے مطابق اس کے پاس سیکرٹ راز ہیں۔“

”سنو میرے بچے۔“ شاہ جی بولے۔ ”ہم طوفان سے خود کو بچا سکتے ہیں مگر آرمی ڈاگز جس شخص کے پیچھے لگ جائیں اسے زمین کی گہرائیاں بھی نہیں بچا سکتیں۔ لہذا میرا مشورہ ہے کہ قبل اس کے کہ ڈاگز تمہارا تعاقب شروع کر دیں تم دادی سے نکل جاؤ، یہی طریقہ نقصان سے بچا سکتا ہے۔“

”میں آپ کا حکم ٹالنے کی جرأت نہیں رکھتا حضرت۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن فرار شکست قبول کرنے کے مترادف نہ ہو گا!“

”نہیں میرے بچے۔“ شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ”مصلحت اور حکمت کا تقاضا یہی ہے۔ اس جبری فرار کو بھی ہم بامقصد بنائیں گے۔ آج کے اجلاس میں جدید اسلحے تلاش کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ ہم انڈیا کے جدید اسلحہ کا پرانے اسلحے سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہمیں اپنی جدوجہد کے لیے نئے ذرائع اور نئے رابطے تلاش کرنا ہوں گے اور اس کام کے لیے تم سے موزوں شخص ہمارے پاس کون ہے۔ ہماری منزل، ہمارا بھائی اور ہمارا دوست ملک پاکستان اخلاقی سیاسی مدد کر رہا ہے۔ پاکستان کے غیور اور اہل ایمان نوجوان رضا کارانہ طور پر ہمارے ساتھ ہیں۔ وہاں اہل ثروت بھی ہیں وہی لوگ تم تلاش کرو گے اور اسلحہ خریدو گے۔ کچھ لوگ پہلے وہاں موجود ہیں وہ بھی تمہاری مدد کریں گے۔“

”ٹھیک ہے جناب۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں کل صبح تک اپنے حتمی فیصلے سے آپ کو آگاہ کروں گا۔“

”ہمیں بتایا گیا ہے۔“ خواتین کے دائرے سے ایک خاتون بول پڑی۔ ”کہ ہمارا بھائی تربیت یافتہ کمانڈو ہے۔ کیا میرا بھائی اسلحے کے ساتھ ہمارے لیے ادھر سے کمانڈوز بھی تیار کر کے بھیج سکتا ہے؟“

”اچھا مشورہ ہے۔“ شاہ صاحب تائیدی لہجے میں بولے۔ ”بے شک، ہمیں تربیت یافتہ نوجوانوں کی ضرورت ہے اور یہ فرض جما تگیر جیسا نوجوان ہی ادا کر سکتا ہے۔ ادھر

”کیا حضرت صاحب اجازت دیں گے تمہیں؟“ میں اسے ستانا چاہتا تھا۔ ”تم نے اپنی مرضی سے خود کو وین ونگ کے لیے وقف کیا تھا۔“

”میں اپنے دل کی مالک ہوں بالکل آزاد۔ میں وہی کروں گی جو چاہوں گی۔ میں کسی کی غلام نہیں ہوں۔ شاہ صاحب جسم اور روح کو کیسے الگ کر سکتے ہیں۔“

عائشہ کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری تو انہوں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”سوری عائشہ، لیکن دل کے معاملات ایسے ہی ہوتے ہیں۔“ اس نے رک کر پھر بولنا شروع کر دیا مخاطبہ عائشہ تھی۔ ”ہم عورتیں اس معاملے میں کچھ زیادہ جذباتی اور خود غرض ہوتی ہیں ہے نایبی بات؟“

عائشہ نے چہرہ جھکا کر سر کر ہلایا تھا۔

اس کے چہرے پر گلابوں کا موسم اتر آیا تھا۔

رات اتری تو کیمپ میں چند بیمار اور حضرت شاہ صاحب کے خدمت گزار رہ گئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ آنے والوں نے بارات کا روپ دھاما تھا اور بس ڈرائیور کے پاس کرفو کا پریشن پاس تھا۔ مجاہدین اجتماعی نقل و حرکت کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیا کرتے تھے۔

کھانا کھاتے ہی ہم تینوں اجازت لے کر باہر نکل گئے تھے۔ کھلی فضا میں خنکی گھلی ہوئی تھی۔ ہم کیمپ سے ایک فرلانگ اوپر جا کر بیٹھے۔ سری نگر کا شہر پاؤں میں تھا۔ عائشہ قدرے فاصلے پر جا بیٹھی تھی۔

”آج صبح ہاسٹل میں مجھے ایک کلاس فیلو مل گئی تھی۔“ انہوں نے بتایا۔ ”وہ مجھے بحیثیت پرنس جانتی ہے اس کا خاوند آری ایویشن میں لیفٹیننٹ کرنل ہے۔ میں اسے دیکھ کر گھبرا گئی تھی لیکن اسے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ کالج سے نکل کر میں کیا کرتی ہوں۔ تب میں نے کشمیر میں موجودگی کے بارے میں اسے ایک کہانی سنا دی کہ میرا صحابی دوست ایک ماہ قبل کشمیر آیا تھا واپس نہیں گیا اسے تلاش کرنے اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ آئی ہوں۔ اس نے گھر آنے کی دعوت دی جو میں نے قبول کر لی تھی۔“

”اچھا ہوا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اچھا کیا تم نے۔“ ہمیں ایسے ہی کسی سہارے کی ضرورت ہے اگر واقعی آری ڈاگز نے میری تلاش شروع کر دی تو پناہ کے لیے کسی آری

جا کر تم ہم خیال نوجوانوں کے لیے ٹریننگ کا مرکز بھی قائم کر سکتے ہو۔“

”مجھے امید ہے واپسی کے سفر کے لئے تم اپنا راستہ خود بنا لو گے۔“ شاہ صاحب نے

کہا اور پھر اجلاس برخواست ہو گیا تھا۔ مجھے شاہ صاحب نے روک لیا تھا۔

میں نے مختصر اور مناسب الفاظ میں شاہ صاحب کو مولوی کرامت اور میجر مندرہ کی ہلاکت اور عائشہ کے بارے میں بتایا تو عائشہ کو بھی وہیں بلایا گیا تھا۔ خواتین میں سے انہوں نے نکل کر میرے قریب آکر بیٹھ گئی تھی۔ چونکہ مرد چلے گئے اس لیے اس نے نقاب ہٹا دیا تھا۔

”تم لوگ باتیں کرو۔“ شاہ صاحب وہیل چیئر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ ”میری عبادت کا وقت ہے۔ آج رات تم یہیں رہو گے نا۔“

وہ چلے گئے تو میں نے عائشہ اور انہوں کا ایک دوسرے سے تعارف کروایا۔ عائشہ کے حسن نے انہوں کو جیسے کانٹوں پر بٹھادیا تھا۔ وہ عورت تھی۔ اپنے محبوب مرد کے ساتھ عائشہ جیسی خوب رو لڑکی کا وجود کیسے برداشت کرتی۔ اس سے قبل کہ عائشہ جلن کی تپش محسوس کرتی میں نے آگ پر چھینٹا مار دیا تھا۔

”عائشہ ہمارے پاس میرے بھائی فاروق کی امانت ہے۔ کل صبح وہ لینے آئے گا۔“

انہوں کا موڈ ایک دم سنورنا چلا گیا۔

”اب تو مجھے مان لو۔“ انہوں نے بولی۔ ”میں آدمی ولیہ ہوں۔ میں نے کہا تھا انڈیا نہ جاؤ۔ سو تم نہیں جاسکے۔“

”ہندوستان جانے سے میری ولیہ نے تو روک لیا ہے اب پاکستان جانے سے روکو تو مان لوں گا۔“

”اگر چاہوں تو روک سکتی ہوں۔“ وہ اٹھلا کر بولی۔ ”لیکن میں چاہتی ہوں تم پاکستان جانے کا فیصلہ کر لو۔“

”جانتی ہو میں واپس نہ آنے کے لئے جاؤں گا۔“

”ہاں۔ ہم واپس نہیں آئیں گے۔“ وہ مسکرا کر بڑے ہی پیار سے بولی۔

”ہم؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں ہم۔“ انہوں نے عائشہ کے وجود کو نظر انداز کر چکی تھی۔ ”میں اور تم۔“

آفسر کا گھر شاید محفوظ ہو۔“

”فکر نہ کرو جہانگیر۔“ انو نے کہا۔ ”میں ایک پرفوم کے کوٹ سے تمہیں محفوظ کروں گی۔ آرمی ڈاگ ایک فٹ کے فاصلے پر بھی آجائے تو تمہاری جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ بس دعا کرو وہ برائڈ یہاں ہو۔“

”اب فیصلہ یہ کرنا ہے کہ پاکستان کو اپنا مستقبل بنائیں یا انڈیا چلیں۔“

”یہاں میں خود غرضی نہیں کروں گی۔“ انو نے جواب دیا۔ ”بے شک انڈیا میری جنم بھومی ہے میری ماں وہاں ہے میری کروڑوں کی جائیداد ہے، مگر میں شیلا اور کرمل راج کے خطرے کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ خوف زدہ زندگی کا کیا فائدہ۔ ہم پاکستان چلیں گے اور وہاں اس مظلوم قوم کی بھی مدد کرتے رہیں گے۔“

”ہاں۔ ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب ایک طویل اور پر خطر سفر کے بارے میں فیصلہ ہم قبل از وقت نہیں کر سکتے۔ بس اللہ کا نام لے کر چل پڑیں گے۔“

”ہاں اللہ کا نام تو ہر سانس میں لیں گے۔“ انو پر سوچ آواز میں بولی۔ ”سفر کے لئے سریتا کو استعمال کریں۔“

”کون سریتا؟“

”میری کلاس فیلو اور کرمل کی پتی۔“

”وہ ہماری کیا مدد کر سکتی ہے؟“

”اس کا کرمل اور میرا چہرہ۔“ میں نے ہاتھ اٹھایا تو انو نے ہاتھ روک لیا۔

”پوری بات تو سن لو پلیز؟“

”لیکن تم کوئی بکو اس کرنی جارہی ہو شاید۔“

”وہ کرمل ہے اور اس کے پاس آرمی ایوی ایشن کے چھوٹے طیارے ہیں۔ جو عموماً آرمی والے بارڈر کی دیکھ بھال کے لیے استعمال کرتے ہیں اگر ہم کسی بھی طرح ایک طیارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو کیسا ہے؟“

”خواب سنانا ہے۔“

”ہاں اور میں اس خواب کی تعبیر بھی سنانی بنا دوں گی۔“ انو ایک حزم کے ساتھ بولی۔ ”شرط یہ ہے تم میری ذات پر اعتماد رکھو گے۔“

”لیکن کسی سُر کو تمہارا ہاتھ چاٹنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

”سنو جہانگیر۔“ انو سنجیدہ ہو گئی۔ ”ہم ایک مشکل وقت سے دو چار ہونے والے ہیں۔ زندگی بچانے کے لئے اگر مردار کا گوشت کھانے کی اجازت ہے تو کسی سُر کو سواری کے لئے سدھانے کے لئے ہاتھ پلید کرنے میں کیا حرج ہے۔ صرف ہاتھ، میری بات سمجھ رہے ہو تم۔“

”ہاں، کسی حد تک۔“ میں نے جواب دیا۔

جس طرح جمادات، نباتات اور مخلوقات جو بھی شے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی ہے حکمت سے خالی نہیں ہے اسی طرح ہر کام اور سوچ میں کوئی نہ کوئی ایسی مصلحت اور حکمت پوشیدہ ہوتی ہے جسے بادی النظر انسان سمجھ اور نا سمجھ کے درمیان چھوڑ کر آگے نکل جاتا ہے۔ سریتا سے ملاقات ہی نہیں بلکہ بہت پہلے اس کو نینی تال سے وادی کشمیر کے لئے تیار کرنا بھی قدرت کا ایک کرشمہ تھا۔ اگر وہ انو کی کلاس فیلو ہی رہتی تو اس کڑی آزمائش کی سیڑھی نہ بن پاتی چونکہ اسے آنے والے وقت کے لئے کچھ کرنا تھا اس لیے اس کی ملاقات ایک شکاری مرد سے ہوئی جو اسے شادی کے جال میں جکڑ کر سری نگر لے آیا تھا۔

ان کی کوٹھی باغ روپ سنگھ کے شاداب علاقے میں تھی۔ وہاں قطار در قطار اور بھی کوٹھیاں تھیں جو سول اور آرمی کے اعلیٰ افسران کے پاس تھیں۔ کرمل سروپ سنگھ مونا سنگھ تھا اور سریتا کو ایک مذہبی سکھ گھرانے کی بیٹی تھی۔ سروپ کے مردانہ روپ اور فوجی عہدے نے سریتا کو پاگل اور اس کے والدین کو مجبور کر دیا تھا۔

سریتا نے بتایا کہ اس نے پرنس اینلا جہاں بیگم کا ذکر اپنے جی سے کیا تھا پھر بھی اس نے مہمانوں کی اطلاع اسے بذریعہ ٹیلی فون کر دی تھی۔

کرمل سروپ فوجی جیب میں آیا تھا، اگر مجھے انو پر فول پروف قسم کا اعتماد نہ ہوتا تو میں کرمل سروپ کی مردانہ وجاہت دیکھ کر فکر مند ہو جاتا۔ بلاشبہ اس سکھ کی ذات حسن کا شاہکار تھی اسے کوئی بھی عورت دیکھ کر مائل بن سکتی تھی۔ چونکہ مجھے ایک سروٹ کوائر دیا گیا تھا کہ میں پرنس کا ملازم تھا اس لیے میں نے دور سے ہی سروپ کے روپ کا درشن کیا تھا۔

شام سات بجے انو خود سروٹ کوارٹر میں آئی تھی مجھے غلیظ کوارٹر میں دیکھ کر پہلے تو اس نے مذاق اڑایا تھا اور پھر سنجیدہ سی ہو کر اس نے وقت کی مجبوری کا رونا رو کر میری ڈھارس بندھائی تھی۔

”جماگیر یہ مرد تو بہت بڑا شکاری ہے۔ اس کی آنکھ میں یقیناً سنور کا بال ہوگا۔ سریتا کو تم نے دیکھا ہے کتنی سندر اور بھرپور عورت ہے مگر وہ شیطان مجھ پر مرنا ہے۔ جانتے ہو سریتا بچے کو فیڈر دینے گئی تو اس نے مجھے رات ڈنر کی دعوت دے ڈالی۔ میں نے اس کی دراز دستی کو تو حیلہ بہانے سے روک لیا تھا مگر خطرہ ہے کھیل بگڑ نہ جائے۔ بس آج کی رات خیریت سے بیت جائے تو کل کتے سے جو توں کے تے نہ چٹوائے تو نام انو نہیں۔“

”چلو واپس نکل چلیں۔“ میں نے کہا۔ ”کیا خدا ہماری مدد نہیں کرنے والا۔“
”وہ تو ہے۔“ انو نے جواب دیا۔ ”کیا خبر اللہ نے اس گھوڑے کو ہمارے لیے ہی بنایا ہو۔“

وہ مجھے حوصلہ سارا دے کر چلی گئی اور دس پندرہ منٹ بعد میں نے دونوں کو لان میں شانہ بہ شانہ ٹہلتے دیکھا۔ گو انو بار بار کم ہوتے فاصلے کو کنٹرول کر رہی تھی لیکن اس شخص کو اپنی بیوی کا بھی خیال نہ تھا۔

واپس مڑتے ہوئے چوتھے پھیرے میں اس نے ایک دم انو کا ہاتھ تھام لیا تھا جسے انو نے ہنس کر لجا کر اور کوئی اشارہ کر کے فوراً چھڑا لیا تھا۔

اس نے خود ہی محسوس کر لیا تھا کہ رات بخیریت نہیں ہوگی کیونکہ سروپ سٹکھ غالباً بیوی پر حاوی تھا یا ڈھیٹ واقع ہوا تھا۔

”میں بہ مشکل بہانہ بنا کر بھاگ نکلی ہوں۔“ رات نو بجے ڈنر سے پہلے ہی وہ مجھے لے کر نکل بھاگی تھی۔ ”یہ شخص تو شیطان سے بھی بالشت بھر اپنا پیچہ اور وہ کتیا سریتا جان کر نگاہیں چراہتی ہے۔ میں نے اس سے کل کے ڈنر کا وعدہ کیا ہے مین جانا کہاں ہے چکر کاٹ کر دیوار پھاندیں گے اور رات سروٹ کوارٹر میں گزار لیں گے۔“ چونکہ وہ سرکاری اور بڑے لوگوں کی کالونی تھی۔ اس لیے ہم دیر تک سڑکوں پر چہل قدمی کرتے رہے تھے۔

اچانک بارش شروع ہو گئی تو ہم بھیگتے ہوئے عقبی دیوار پھاند کر کرٹل سروپ کی

ناک کے نیچے سروٹ کوارٹر میں داخل ہوئے۔ بارش کی وجہ سے کوئی ملازم باہر نہ تھا۔ چارپائی ایک تھی اور ہم دو تھے۔ نظریات اور خیالات میں بھی کوئی بعد نہ تھا پھر بھی ہم ایک چارپائی پر متحد نہ ہو سکتے تھے۔

پہلے آپ پہلے آپ سے بچنے کی خاطر انو نے دو کرسیوں سے کشن اٹھائے اور چارپائی سے تو شک تھیسٹ لی۔ تو شک عرضا نہیں بلکہ طوٹا ایسے بچھائی اس نے کہ جب ہم دونوں اس پر لیٹے تو درمیان شرعی اور اخلاقی فاصلہ تھا۔

کرٹل ٹھیک سات بجے نکل گیا تھا۔ ہم نے ناشتا بھی نہ کیا تھا میں تل سے پانی لے آیا تو انو نے منہ ہاتھ دھویا اور پھر لان عبور کرتی اندر چلی گئی تھی آدھے گھنٹے بعد ایک ملازمہ میرے لئے ناشتا لے آئی تھی۔

تین چار انڈوں کا آلیٹ اور بارہ پیس اور مکھن کی دو نکلیاں۔ مقصد یہی تھا کہ ابھی کھالو اونٹ کی طرح کوہان میں بھرنو نہ جانے آنے والا وقت کیسا ہوگا۔ میں نے انو کا بھیجا ہوا سارا ناشتا حلق سے اتار لیا تھا۔

ناشتے کے بعد میں سونے کی نیت سے لیٹا ہی تھا کہ گجری ملازمہ انو کا پیغام لے آئی تھی۔ اس کے ساتھ اندر گیا تو گھر پر انو کا راج تھا سریتا بچہ گھو ہاپسٹل لے گئی تھی۔ انو نے میری اجازت سے سروپ کا نمبر ڈائل کیا۔

”ہیلو کرٹل‘ سر میں پرنس بول رہی ہوں۔ یس سراسی شر میں ہوں واپسی کا پروگرام تھا لیکن آپ نے کچھ دن اور رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ میں لبرل لڑکی ہوں اس لیے سچ بول رہی ہوں مجھے آپ نے بڑا امپرپس کیا ہے۔ اوہ.....“ وہ اچھی اداکارہ کی طرح ہنسنے لگی۔ ”رات آپ کی بے قراری اور سریتا کی ناراضگی وجہ تھی۔ سنئے کرٹل سر! میں عورت ہو کر سچ بول رہی ہوں‘ میں پسند کروں گی آپ بھی میرے لیے سچ بولیں۔ ہاں‘ یہ تو مجھے یقین ہے لیکن میں دیکھنا چاہتی ہوں ایک محبت کرنے والا مرد کہاں تک جاسکتا ہے۔ کرٹل میں ایک دن میں ساری دادی کی سیر کرنی چاہتی ہوں اور یہ سوس صرف آپ کے پاس ہے۔ کیا میری خاطر آپ اپنا طیارہ فضاؤں میں لے جاسکتے ہیں؟ اوہ تھینکس سروپ میرا مان رکھ لیا آپ نے۔ مجھے ہمیشہ کے لئے جیت لیا ہے۔ تنہا‘ اوہ نو سروپ ڈیر میرا باڈی گارڈ ساتھ ہوگا لیکن وہ بالکل ڈی ہے صرف ملائی خاطر اسے ساتھ

انو، نیچل اداکاری کرتے ہوئے سیٹ پر پھدک رہی تھی کبھی دائیں کبھی بائیں جھک جھک کر ہنسی تالیاں بجاتی اور کرٹل پر جادو کا اثر چڑھاتی جاری تھی۔ ”اے بدھو تم الو کی طرح اونگھ رہے ہو۔“ انو نے پلٹ کر کہا۔ ”وہ سامنے والی برف پوش چوٹی آزاد کشمیر ٹرائی میں ہے۔ ادھر سامنے مظفر آباد ہے۔“ اس نے مجھے سگٹل دیا اور میں نے جیب سے ہاتھ نکال کر ریو الو کی نوک کرٹل کی گردن پر رکھ کر سرد آواز میں بولا۔

”کرٹل.....!“ میں آزاد ایریا میں اترنا چاہتا ہوں۔ تم اپنا پیرا شوٹ میرے حوالے کر دو۔“

”یہ کیا بکواس ہے گدھے.....!“ انو، حلق پھاڑ کر بولی۔ ”پیچھے ہٹاؤ ریو الو۔“

”نہیں نواب زادی صاحبہ۔“ میں نے بھی اونچی آواز میں کہا۔ ”میرا سارا خاندان پاکستان میں ہے۔ میں مزید تمہاری قید میں نہیں رہ سکتا، مجھے ڈراپ کرو اور اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ آزادی سے گھومو، بصورت دیگر میں تم دونوں کو شوٹ کر کے طیارہ لے جاؤں گا تم جانتی ہو میں اچھا پائلٹ بھی ہوں۔“

”سروپ ڈیئر۔“ وہ غصے میں بولی۔ ”اس کتے کو نیچے پھینک دو۔“ کرٹل سروپ نے پیرا شوٹ اتار کر میرے حوالے کر دیا۔ ”تھینک یو کرٹل اب طیارہ نیچے جھکاؤ، وہ سامنے والی دیلی فضائی چٹانگ کے لئے مناسب ہے۔“ اس نے طیارے کو جھکایا تو میں نے انو کو مخصوص اشارہ کیا۔ اس نے تھوڑا رخ بدل کر کرٹل کی گردن پر کٹ مارا اور میں نے اس کے سر پر ریو الو کا باٹ بجایا پھر ہم نے چند سیکنڈ میں طیارے کا کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ میں ماہرنہ سسی مگر اچھا پائلٹ تھا بالخصوص تربیتی طیارے اڑانے کا تجربہ رکھتا تھا۔

میری توقع کے مطابق جوں ہی طیارہ آزاد فضا میں داخل ہوا مجھے زمین سے سوال آیا کہ اپنی شناخت نیچے روانہ کروں اور وجہ بتاؤں۔ میں نے صرف اتنا جواب دیا تھا کہ میں دوست ہوں اور بھارتی طیارہ اغوا کر کے لا رہا ہوں مظفر آباد ایئرپورٹ تک میری رہنمائی کی جائے۔

طیارہ پوری طرح میرے کنٹرول میں تھا۔ انو نے بے ہوش کرٹل کی گھرائی کا فرض سنبھال لیا تھا۔

زنجی رابطے نے میری درخواست پر میری رہنمائی شروع کر دی تھی، آگے بلند

رکھنا پڑتا ہے۔ ویسے بھی فضا میں ہم صرف باتیں کریں گے، میں تمہارے ساتھ بیٹھوں گی۔ اوپر بہت اوپر میں تم سے ایک وعدہ کروں گی تمہیں ایک سربراہوں کی آنے والی رات کے لئے۔“ وہ نو۔ کیا واقعی ابھی۔ وہ ڈیئر، کتنی خوشی تم دے رہے ہو مجھے۔ میں انتظار کروں گی۔ کہاں..... سنئے میں درگاہ شریف کے دروازے پر کھڑی ہوں گی۔ او کے ڈیئر سروپ.....“ اس نے ریسیور رکھ کر منہ بتایا۔ ”وہ لینے آرہا ہے، چلو نکل چلیں۔“

اس نے مجھے اور انو کو جیب کے اندر یونی فارم پہنا دی تھی تاکہ اس کے ماتحت دور سے ہی دیکھیں کہ کرٹل کے ساتھ دو فوجی آفیسر فلائی کر رہے ہیں۔ ہم نے اپنے لباس کے اوپر یونی فارم چڑھالی تھی۔

ایک ہیٹنگر کے دروازے پر وہ دہرے پروں والا چھوٹا سا طیارہ کھڑا تھا، ہمیں کرٹل نے جیب میں بٹھا کر میدان کے مغربی کونے پر چھوڑا تھا پھر وہ طیارہ ٹیکسی کراتا ہمارے قریب لایا وہ فلائنگ کٹ میں لمبوس تھا اس نے پشت پر پیرا شوٹ بھی باندھ رکھا تھا، انو کو اس نے سیکنڈ سیٹ پر اپنے پہلو میں بٹھایا اور اپنے پیس سے ٹیک آف کی اجازت کا انتظار کرنے لگا مجھ پر ایک ایک سیکنڈ ہیجانی کیفیت طاری کر رہا تھا حالانکہ اس نے قانون اور قواعد کے تمام مراحل طے کر کے لایا وہ ہیٹنگر سے نکلا ہوگا۔

انو، ہاتھ نچانچا کر اس سے کسی بات پر بحث کر رہی تھی یا ضد کر رہی تھی چونکہ کاک پٹ کا کور ابھی اس نے بند نہ کیا تھا اس لیے انجن کی گھر گھرہٹ کی وجہ سے میں ان کی آواز صاف نہیں سن پا رہا تھا۔

میں بقول شاعر گھر سے نکل کر سمت نہیں بھولا تھا۔ یہی ایک پریشانی تھی اگر کرٹل طیارے کو شمالاً جنوباً لے گیا تو ہمارا مقصد پورا نہ ہوگا، یہ بات میں نے خاص طور پر انو کو بتائی تھی کہ اسے ہر صورت طیارہ کا رخ پاکستان کی جانب کروانا ہوگا۔

جب فضا میں طیارہ بلند ہوا تو اس کا رخ مشرق کی جانب تھا پھر طیارے نے ایک لمبا ٹرن لیا اور میرے اندر سے خوشی کی سانس خارج ہوئی تھی سورج ہماری پشت پر تھا اور سامنے ہمارا مستقبل پاک افق سے جھانک رہا تھا۔ جیسے محبوبہ شریا کر اپنے محبوب کی اپنی طرف آتے دیکھ رہی ہو۔

چوٹی تھی اور طیارہ خاصا نیچے چلا گیا تھا اس لیے مجبوراً مجھے ٹرن لینا پڑا تھا حالانکہ خطرے کا احساس میرے ذہن میں بیدار تھا ابھی طیارہ بارڈر سے زیادہ دور نہ ہوا تھا۔ اگر چوٹی سید راہ نہ ہوتی تو میں اور آگے نکل جاتا۔

معاً طیارے کو زوردار جھٹکا لگا اور انوکی چیخ سنائی دی۔ میرا دل اچھل کر جیسے حلق تک آ گیا تھا۔ میں نے دیکھا انوکا بالکل سلامت تھی مگر طیارے کی ٹیل غائب تھی۔

”ڈائیو۔“ انوکے چیخ کر کسی کمانڈر کی مانند ہدایت دی۔ ”پلین ہٹ ہو گیا ہے۔“ میں نے فوراً طیارے کی نوز اوپر اٹھائی اور پھر طیارہ اوندھا کر دیا مجھے تھوڑی تو یاد تھی مگر پریکٹیکل کا کبھی تجربہ نہ کروایا گیا تھا کہ طیارے کی دم نہ رہے تو کیا کرنا چاہئے۔ یہ تو معلوم تھا کہ اب میں طیارے کو اپنی مرضی کے مطابق موڑ نہ سکوں گا۔

قلا بازی کی وجہ سے طیارے کا رخ کسی حد تک مطلوبہ ہو گیا تھا۔ میں نے سری نگر کی جانب سے آنے والا دریا دیکھ لیا تھا، مشرق کی جانب سے آنے والی تیز ہوا بھی کچھ معاون ثابت ہوئی تھی، جب دوسری قلا بازی سے طیارہ ابھرا تو میں نے زمینی میزبان رابطے کو بتا دیا کہ میرا طیارہ زخمی ہو چکا ہے۔ ادھر سے صرف افسوس اور دوسری ہدایت کا انتظار کے لیے کہا گیا تھا۔

”کیا طیارہ تمہارے کنٹرول میں ہے؟“ پوچھا گیا۔ میں نے ہاں میں جواب دے کر انوکی جانب دیکھا اس کے گلابی چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔

”کیا پیراشوٹ ہم دونوں کو بچا سکتا ہے جمائگیر؟“ وہ روہانسی آواز میں بولی۔

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں دریا میں لینڈ کرنے جا رہا ہوں۔“

”کیا ہم زندہ رہیں گے جمائگیر؟“ اس نے میرے شانے پر سر نکا دیا تھا، میں نے بے آہستگی اسے خود سے الگ کیا اور زندگی کا مشکل ترین تجربہ کرنے کی کوششیں کرنے میں مصروف ہو گیا۔ میرے اندازے کے مطابق طیارہ دریا کے وسط میں اترنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ خطرہ تھا کہ کنارے سے ٹکرا سکتا ہے لیکن رخ اور زاویہ بدلنے کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی۔

طیارہ نیچے ڈوب رہا تھا اور میں آخری سیکنڈ تک کوشش جاری رکھنا چاہتا تھا۔ انوکے بھی حالات سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا وہ تن کر بیٹھی ہوئی تھی۔ بالآخر فیصلے کا لمحہ

آگیا اور طیارے کے بائیں ونگ پہلے جھاڑیوں اور پھر آگے نکلی چٹان سے رگڑ کھاتے ہوئے غائب ہو گئے اور طیارہ ایک دم دائیں جھک کر پانی میں گر گیا تھا۔

میں اپنا سیفٹی بیلت پہلے کھول چکا تھا اس لیے پانی میں ڈوبتے ڈوبتے میں نے انوکے بیلت کی گرفت سے آزاد کر دیا تھا پھر کھلے کاک پٹ سے دونوں سیٹیں بیک وقت اوپر اٹھیں۔ میں نے اندازے سے بٹن دبایا تھا۔

جب میں پانی سے ابھرا تو انوکے سے چند فٹ بائیں ہاتھ چلا رہی تھی، وہ تربیٹ یافتہ ”را“ کی ایجنٹ تھی اس میں اپنے حواس بحال رکھنے کی صلاحیت رہی ہوگی۔ بھاؤ تیز تھا لیکن ہم بھی اناڑی نہ تھے۔

آج دوسرے دن کی ایک سہانی شام ہے شاید مجھے سہانی دکھائی دے رہی ہے۔ دو دن ہم انکوائری کے مراحل سے دو چار رہے تھے چونکہ میں اور انوکا حکام بالا کے لئے اجنبی نہ تھے اس لئے ہائی کمان نے ہمیں نہ صرف سیاسی پناہ دے دی تھی بلکہ پوری آزادی کے ساتھ پاکستان اور کشمیر کا زکے لئے کام کرنے کی بھی اجازت دے دی ہے۔

☆☆ ختم شد ☆☆